

دینی تعلیم



محمد حسین طباطبائی

مفسر تفسیر المیزان

مرتبہ: سید مهدی آیت اللہی

مترجم: سید قلبی حسین رضوی

مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست مطالب

۱۸.....	حرف اول
۲۱.....	دینی معلومات
۲۲.....	نتیجہ
۲۲.....	خدا کے قانون سے رابطہ کا اچھا اثر
۲۴.....	عقائد
۲۵.....	اخلاق
۲۵.....	عمل
۲۶.....	دین کا فطری ہونا
۲۷.....	دین کے فائدے
۲۸.....	تاریخ ادیان کا ایک خلاصہ
۳۰.....	دین اسلام اور اس کی آسمانی کتاب
۳۲.....	دین، قرآن مجید کی نظر میں
۳۴.....	معاشرے میں دین کا کردار
۳۵.....	معاشرے کو قوانین کی ضرورت

- ۳۵..... قوانین کے مقابلہ میں انسان کا آزاد ہونا
- ۳۶..... قوانین کی ترقی میں کمزوریاں
- ۳۷..... قانون میں خامی کا اصلی سرچشمہ
- ۳۸..... تمام قوانین پر دین کی ترجیح
- ۳۹..... نتیجہ
- ۳۹..... دوسروں کی کوشش
- ۴۰..... انسان کے آرام و آسائش میں اسلام کی اہمیت
- ۴۰..... اسلام کا دوسرے ادیان سے موازنہ
- ۴۲..... سماج کے رسم و رواج سے اسلام کا موازنہ
- ۴۳..... نتیجہ
- ۴۵..... تبلیغ اور دعوت اسلام
- ۴۵..... تبلیغ کا طریقہ
- ۴۷..... اسلام میں تعلیم و تربیت
- ۴۷..... اسلامی تعلیمات کے دو اہم شاہکار
- ۴۸..... آزادی فکر اور حق پوشی

- نتیجہ..... ۴۹
- سماجی زندگی میں اسلام کی خدمات..... ۵۰
- افراد کے منافع کا تحفظ اور رفع اختلاف..... ۵۰
- اسلام کا طریقہ کار اور اس کی بنیاد..... ۵۰
- سماجی اختلافات..... ۵۲
- عداوت و اختلاف سے اسلام کا مقابلہ..... ۵۳
- رفع اختلاف کے لئے ایک عام وسیلہ..... ۵۵
- ناز، روزہ اور حج یا رفع اختلافات کا وسیلہ..... ۵۶
- اثبات صلح..... ۵۹
- ابتدائے خلقت کی بحث..... ۶۰
- معرفت خدا اور ملتیں..... ۶۱
- انسان کی زندگی میں تجسس کا اثر..... ۶۲
- توحید کے بارے میں قرآن مجید کا اسلوب..... ۶۳
- مثال اور وضاحت..... ۶۶
- قرآن مجید کی نظر میں خدا شناسی کا طریقہ..... ۶۷

توحید اور یکتائی..... ۷۰

وضاحت..... ۷۰

خداۓ متعال کا وجود، قدرت اور علم..... ۷۰

وضاحت..... ۷۲

خدا کی رحمت..... ۷۲

وضاحت..... ۷۳

انسان کو پیغمبر کی ضرورت..... ۷۳

انبیاء کی تبلیغ..... ۷۴

معاشرے میں قوانین و قواعد کی ضرورت..... ۷۵

زندگی کے قوانین کی طرف تکوینی ہدایت..... ۷۶

نتیجہ..... ۷۷

انسان اور دوسری مخلوقات میں فرق..... ۸۰

پیغمبر کی صفات..... ۸۱

انبیاء، انسانوں کے درمیان..... ۸۲

صاحب شریعت انبیاء..... ۸۲

- ۸۳.....اولوالعزم پیغمبر اور دوسرے انبیاء.....
- ۹۰.....بحیرا راہب کا قصہ.....
- ۹۲.....نسطورا راہب کا قصہ.....
- ۹۳.....حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت.....
- ۹۷.....مدینہ کے یہودیوں کی بشارت.....
- ۹۸.....نبی کی بشارتوں کی طرف قرآن مجید کا اشارہ.....
- ۱۰۰.....پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگوں کا ایک مختصر جائزہ.....
- ۱۰۳.....بادشاہوں اور سلاطین کو دعوت اسلام.....
- ۱۰۵.....پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معنوی شخصیت کا ایک جائزہ.....
- ۱۰۷.....پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی معنوی شخصیت.....
- ۱۰۸.....پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت.....
- ۱۱۱.....پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں چند نکات.....
- ۱۱۳.....مسلمانوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت.....
- ۱۱۴.....پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت اور جانشینی کا مسئلہ.....
- ۱۱۵.....قرآن مجید، نبوت کی سند.....

- ۱۱۹.....قرآن مجید کی اہمیت
- ۱۱۹.....قرآن مجید کا معجزہ
- ۱۲۲.....قرآن مجید کی مشرکین کو مناظرہ کی دعوت
- ۱۲۵.....قرآن مجید کی تعلیمات
- ۱۲۶.....قرآن مجید کی نظر میں علم و جہل
- ۱۲۷.....وضاحت
- ۱۲۸.....قرآن مجید کا احترام
- ۱۲۹.....راہ خدا میں جہاد اور فداکاری کے متعلق قرآن کا دستور
- ۱۳۰.....بحث کا خاتمہ
- ۱۳۱.....ادیان و مل کی نظر میں معاد
- ۱۳۱.....قرآن مجید کی نظر میں معاد
- ۱۳۳.....موت سے قیامت تک
- ۱۳۳.....بدن مرتا ہے نہ کہ روح
- ۱۳۴.....اسلام کی نظر میں موت کے معنی
- ۱۳۴.....برزخ

۱۴۰.....امام کی ضرورت پر ایک نقلی دلیل

۱۴۳.....امام کی ضرورت

۱۴۴.....امام کی عصمت

۱۴۴.....امام کے اخلاقی فضائل

۱۴۵.....امام کا علم

۱۴۵.....ائمہ حدیثی علیم السلام

۱۴۶.....ائمہ اطہار علیم السلام کی عام سیرت

۱۴۷.....پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیم السلام

۱۴۸.....اہل بیت علیم السلام کی عام سیرت

۱۵۳.....خلاصہ اور نتیجہ

۱۵۴.....اہل بیت علیم السلام کے فضائل

۱۵۶.....ائمہ علیم السلام کی تقرری

۱۵۸.....ائمہ معصومین علیم السلام کی زندگی کا ایک مختصر جائزہ

۱۵۸.....حضرت امام علی علیہ السلام (مسلمانوں کے پہلے امام)

۱۶۲.....امام علی علیہ السلام کے فضائل کا خلاصہ

- حضرت امیر المؤمنین کا طریقہ..... ۱۶۳
- حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام (دوسرے امام)..... ۱۶۵
- حضرت امام حسین علیہ السلام (تیسرے امام)..... ۱۶۶
- حضرت امام زین العابدین علیہ السلام (چوتھے امام)..... ۱۶۱
- حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (پانچویں امام)..... ۱۶۲
- حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام (چھٹے امام)..... ۱۶۲
- امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کی تحریک..... ۱۶۳
- حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (ساتویں امام)..... ۱۶۴
- حضرت امام رضا علیہ السلام (آٹھویں امام)..... ۱۶۵
- حضرت امام محمد تقی علیہ السلام (نویں امام)..... ۱۶۶
- حضرت امام علی نقی علیہ السلام (دسویں امام)..... ۱۶۷
- حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام (گیارہویں امام)..... ۱۶۷
- حضرت امام مہدی موعود عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف (بارہویں امام)..... ۱۶۷
- ائمہ دین کی روش کا اخلاقی نتیجہ..... ۱۶۸
- ائمہ معصومین علیہم السلام کے اجمالی حالات..... ۱۶۹

۱۸۷.....اخلاق و احکام کے چند سبق.....

۱۸۷.....اخلاق کے چند سبق.....

۱۸۷.....خدا کے بارے میں انسان کا فریضہ.....

۱۸۹.....خدا پرستی.....

۱۹۰.....اپنے بارے میں انسان کا فریضہ.....

۱۹۱.....بدن کی صفائی.....

۱۹۱.....صفائی کا خیال.....

۱۹۲.....کھٹی اور مواک.....

۱۹۳.....تہذیب اخلاق.....

۱۹۴.....اسلام کی نظر میں طالب علم کی اہمیت.....

۱۹۵.....معلم اور مربی کی اہمیت.....

۱۹۵.....معلم اور شاگرد کا فریضہ.....

۱۹۶.....ماں باپ کے بارے میں انسان کا فریضہ.....

۱۹۷.....بزرگوں کا احترام.....

۱۹۷.....اپنے رشتہ داروں کے بارے میں انسان کا فریضہ.....

- ۱۹۸..... ہمایوں کے بارے میں انسان کا فریضہ
- ۱۹۹..... ماتحتوں اور بچاروں کے بارے میں انسان کا فریضہ
- ۲۰۰..... معاشرے کے بارے میں انسان کا فریضہ
- ۲۰۱..... عدالت
- ۲۰۱..... انفرادی عدالت
- ۲۰۲..... اجتماعی عدالت
- ۲۰۳..... جھوٹ
- ۲۰۳..... جھوٹ کے نقصانات
- ۲۰۴..... غیبت و تہمت
- ۲۰۵..... لوگوں کی عزت پر تجاوز
- ۲۰۶..... نیکوں کی مصاحبت
- ۲۰۹..... ماں باپ پر اولاد کے حقوق
- ۲۱۰..... اولاد پر ماں باپ کے حقوق
- ۲۱۱..... بھائیوں اور بہنوں کے باہمی حقوق
- ۲۱۲..... عزت نفس اور کامیابی

- ۲۱۳..... احسان اور محتاجوں کی مدد
- ۲۱۴..... خیرات اور نیکیوں کی طرف سبقت کرنا
- ۲۱۵..... یتیم کا مال کھانا
- ۲۱۶..... جہاد اور دفاع سے فرار کی سزا
- ۲۱۸..... بیکاری کے نقصانات
- ۲۲۰..... کھیتی باڑی اور اس کے فائدے
- ۲۲۰..... دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے کے نقصانات
- ۲۲۱..... ناپ تول میں کمی کی سزا
- ۲۲۱..... ظلم و ستم کی برائی
- ۲۲۲..... مردم آزاری اور شرارت حرام ہے
- ۲۲۴..... فریضہ کی تعیین میں مختلف روشوں کا اختلاف
- ۲۳۰..... معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے مقابلہ
- ۲۳۱..... اسلام میں گناہان کبیرہ کی عام سزا
- ۲۳۲..... احکام کے بارے میں چند سبق
- ۲۳۲..... اجتہاد اور تقلید

۲۳۳.....	نجاسات
۲۳۴.....	مطہرات
۲۳۵.....	غسل
۲۳۶.....	وضو اور اس کے احکام
۲۳۷.....	مطلات وضو
۲۳۸.....	تمیم
۲۳۹.....	تمیم کے احکام
۲۳۹.....	ناز
۲۴۱.....	واجب نازیں
۲۴۱.....	مقدمات ناز
۲۴۲.....	واجبات ناز
۲۴۵.....	ارکان ناز
۲۴۷.....	ناز آیات
۲۴۸.....	ناز آیات پڑھنے کا طریقہ
۲۴۸.....	مسافر کی ناز

۲۴۹..... نماز جماعت

۲۴۹..... نماز جماعت کی شرائط

۲۵۰..... نماز جماعت کے احکام

۲۵۰..... روزہ

۲۵۰..... روزہ کو باطل کرنے والی چیزیں

۲۵۱..... اسلام میں جہاد

۲۵۲..... اسلام میں جنگ کے مواقع

۲۵۳..... جہاد کے بارے میں اسلام کا عام طریقہ

۲۵۶..... اسلام میں فیصلہ

۲۵۷..... فیصلہ کرنے کی اہمیت

۲۵۹..... گواہی

۲۵۹..... مرد اور عورت کی گواہی

۲۵۹..... گواہی کے کلیات

۲۵۹..... گواہ کی شرائط

۲۶۰..... اقرار

۲۶۱..... اقرار کے معنی اور اس کی شرائط

۲۶۱..... شفعہ

۲۶۲..... مرد اور عورت کا طبقہ

۲۶۲..... اسلام سے پہلے معاشرے میں عورت

۲۶۵..... خلاصہ

۲۶۶..... عورت کے بارے میں اسلام کا نظریہ

۲۶۸..... نکاح

۲۶۸..... نکاح کے مسائل اور احکام

۲۶۸..... نکاح کے احکام

۲۶۹..... جن کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے

۲۷۰..... عقد کا ولی

۲۷۱..... اولاد کے حقوق اور تبعیت

۲۷۱..... اسلام میں متعدد بیویاں

۲۷۵..... طلاق صحیح ہونے کی شرائط

۲۷۶..... طلاق کی قسمیں

- ۲۷۷..... عدت کے احکام اور اس کی قسمیں
- ۲۷۸..... اسلام میں غلامی
- ۲۷۹..... غلامی کے بارے میں اسلام کا نظریہ
- ۲۸۰..... اسلام اور دوسرے نظریات کی تحقیق
- ۲۸۱..... غلاموں کے ساتھ اسلام کا سلوک
- ۲۸۲..... غضب
- ۲۸۳..... غضب کے بعض احکام
- ۲۸۵..... تخصیص اور مالکیت کی اصل
- ۲۸۷..... اصل مالکیت کے دو تھے
- ۲۹۲..... میراث کے کئی مسائل
- ۲۹۳..... میراث کے حصے
- ۲۹۶..... ماں باپ کی میراث
- ۲۹۷..... میاں بیوی کی میراث
- ۲۹۸..... میراث کے احکام
- ۳۰۰..... مرد و عورت کے حصوں میں جزئی فرق

۳۰۰..... مرد اور عورت کی میراث میں فرق.....

۳۰۱..... بیع (خرید و فروخت) کیا ہے؟.....

۳۰۲..... بیع عقد لازم ہے.....

۳۰۳..... منابع و آخذ کی فہرست.....



ترجمہ تحریک
Translation Movement

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتیٰ تھے تھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچے و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کر لیتی ہیں تاریکیاں کا فور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پر نور ہو جاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حراء سے مثل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمہ حق و حقیقت سے سیراب کر دیا، آپ کے تمام الہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمران ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل و آگہی سے رو برو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کر لیا۔

اگرچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ گراں بہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کر دی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمہ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے

جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنہوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگیں تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہ السلام کی طرف اٹھی اور گڑھی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکر و معنوی قوت و اقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام سے اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامران زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت و طہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجود دنیا کے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و مغفوت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے۔

اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوت و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انسانیت کے ٹھکار، سامراجی خون خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے بھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، علامہ طباطبائی کی

گر انقدر کتاب ”دینی تعلیم“ کو مولانا سید قلبی حسین رضوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزو مند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنہوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنی جہاد رضانے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام

ترجمہ ترجمہ
Translation Movement

دینی معلومات

لفظ ”دین“، کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ایک ہے۔ عام طور پر دیندار اسے کہتے ہیں جو کائنات کے لئے ایک خدا کا قائل ہو اور اس کی خوشنودی کے لئے خاص قسم کے اعمال بجا لاتا ہو۔ ممکن ہے ہر معاشرے اور ملت میں، قانون کے مطابق معاشرہ کے ہر فرد کے لئے فرائض معین ہوئے ہوں، اور ان پر لوگ عمل کرتے ہوں، تو یہ تصور کیا جائے کہ وہاں پھر ”دین“ کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اسلام کے احکام اور ضوابط پر بنیاد پر غور کرنے سے اس معنی کے خلاف ثابت ہوتا ہے، کیونکہ دین اسلام صرف خدا کی عبادت و ستائش تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل کے لئے جامع قواعد و ضوابط اور مخصوص قوانین وضع کئے گئے ہیں اور بشریت کی وسیع دنیا کے بارے میں حیرت انگیز صورت میں تحقیق کی گئی ہے۔ اور انسان کی ہر انفرادی و اجتماعی حرکت و سکون کے لئے مناسب قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ ایسے دین کو تکلفاتی اور رسمی دین سے تشبیہ یا نسبت نہیں دی جاسکتی ہے۔

خدا نے متعال نے قرآن مجید میں دین اسلام کو مذکورہ بیان شدہ کیفیت میں توصیف فرمائی ہے اور اس کے علاوہ یہودیت و نصرانیت کو کہ جن کی آسمانی کتابیں تورات و انجیل میں اور ان میں اجتماعی احکام و قواعد و ضوابط ہیں۔ اسی صورت میں بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرماتا ہے: (وکیف یحکمونک و عندہم التورۃ فیما حکم اللہ۔ انا انزلنا التورۃ فیما حدی و نور یحکم بہا البنیون الذین اسلموا للذین حادوا والربنئون والاحبار و قینا علی ائمارہم بعیسیٰ ابن مریم۔ و عاتینہ الانجیل فیہ حدی و نور و مصداقاً لما بین یدیہ من التورۃ و حدی و موعظۃ للمتقین و لیحکم اهل الانجیل بما انزل اللہ فیہ۔ و انزلنا الیک الکتاب باحق مصداقاً لما بین یدیہ من الکتاب و مبیناً علیہ فاحکم بینہم بما انزل اللہ) ”اور یہ کس طرح آپ سے فیصلہ کرائیں گے جب کہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں حکم خدا بھی ہے۔ بیشک

ہم نے توریت کو نازل کیا جس میں ہدایت اور نور ہے اور اس کے ذریعہ اطاعت گزار انبیاء یہودیوں کے لئے فیصلہ کرتے ہیں اور اللہ والے علماء یہودیہ اور ہم نے انہیں انبیاء کے نقش قدم پر عیسیٰ بن مریم کو چلایا۔۔۔ اور ہم نے انہیں انجیل دیدی جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ اپنے سامنے کی توریت کی تصدیق کرنے والی اور ہدایت تھی اور صاحبان تقویٰ کے لئے سامان نصیحت تھی۔۔۔ اہل انجیل کو چاہئے کہ خدا نے جو حکم نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ اور اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی ہے جو اپنے پہلے کی توریت اور انجیل کی مصداق اور محافظ ہے لہذا آپ ان کے درمیان تسزبل خدا کے مطابق فیصلہ کریں، ”توریت اور انجیل۔ جو اس وقت یہود و نصاریٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں، کیونکہ توریت میں بہت سے قوانین اور تعزیراتی ضوابط موجود ہیں اور ظاہری طور پر انجیل بھی توریت کی شریعت کی تائید و تصدیق کرتی ہے۔

نتیجہ

مذکورہ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ”قرآن مجید کی اصطلاح میں دین“ کہ وہی زندگی کی روش ہے، اور اس سے انسان پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ دین اور ایک اجتماعی قانون کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دین خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور اجتماعی قانون لوگوں کے انھار کی پیداوار ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں دین لوگوں کی اجتماعی زندگی اور خدائے متعال کی پرستش اور اس کی فرمانبرداری کے درمیان ایک ربط پیدا کرتا ہے، لیکن اجتماعی قانون میں اس رابطہ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔

خدا کے قانون سے رابطہ کا اچھا اثر

”دین“ انسان کی اجتماعی زندگی اور خدائے متعال کی پرستش کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے نتیجہ میں انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی اعمال کو خدائی ذمہ داری قرار دے کر اس کو خدا کے لئے جواب دہ جاتا ہے۔ چونکہ خدائے متعال اپنی لامحدود قدرت اور بے پناہ علم کی بنا پر ہر جہت سے انسان پر احاطہ رکھتا ہے اور اس کے دل و دماغ کے تمام اسرار و انھار سے مکمل طور پر آگاہ ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، اسی لئے دین نے بشری قانون کی طرح امور کے نظم و نسق کو باقی رکھنے کے لئے محافظ اور

گنہگار مقرر کئے ہیں اور مخالفت و سرکشی کرنے والوں کی سزا کے لئے قوانین وضع کر کے بشری قانون کی نسبت ایک اور امتیاز حاصل کیا ہے اور وہ یہ کہ: دین، انسان کی حیرت اور ہوشیار ہی کی باگ ڈور کو ایک باطنی و ابدی محافظ کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ کیوں کہ دین سے نہ غفلت ہوتی ہے اور نہ خطا اور اس کی جزا اور سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (وہو معکم این ما کنتم) (حدید ۴) ”اور تم جہاں بھی ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے“ (واللہ بالیعلمون محیط) ”اور اللہ ان کے کام کا احاطہ کئے ہوئے ہے“ (وانکلا لما یوفینم ربکم اعمالکم) ”اور یقیناً تمہارا پروردگار سب کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔“ اگر ہم قانون کے دائرہ میں زندگی کرنے والے کے حالات کا دین کے دائرہ میں زندگی کرنے والے کے حالات سے موازنہ کریں گے تو دین کی برتری واضح اور روشن ہو جائے گی۔ کیونکہ جس معاشرے کے تمام افراد متدین ہوں اور اپنے دینی فرائض کو انجام دیں، ہر حالت میں خدائے متعال کو اپنے کاموں میں حاضر و ناظر جانیں، تو وہ ایک دوسرے سے بدظن نہیں ہوتے ہیں۔

اس لئے ایسے ماحول میں زندگی کرنے والے عوام الناس ایک دوسرے کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہتے ہیں اور نہایت ہی آرام و مسرت کی زندگی گزارتے ہیں اور انہیں کو ابدی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جس ماحول میں صرف بشری قانون کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں پر جب تک لوگ اپنے کام پر کسی کو نگراں محسوس کرتے ہیں اس وقت تک وہ کام میں کوتاہی نہیں کرتے، ورنہ ممکن ہے کہ وہ ہر طرح کی کوتاہی کے مرتکب ہوں۔

جی ہاں، اخلاق کے پابند معاشرے میں جو دلی سکون پایا جاتا ہے، وہ اسی دین کا مرہون منت ہوتا ہے نہ کہ قانون کا۔ دوسرے الفاظ میں، دین، ایسے علمی و اخلاقی عقائد و ضوابط کا مجموعہ ہے جسے انبیاء خدا کی طرف سے انسان کی راہنمائی اور ہدایت کے لئے لائے ہیں۔ ان عقائد کو جاننا اور ان احکام پر عمل کرنا انسان کے لئے دونوں جہاں میں سعادت کا سبب بنتا ہے۔ اگر ہم دیندار ہوں اور خدا و پیغمبر کے احکام کی اطاعت کریں تو اس ناپائدار دنیا میں بھی خوش قسمت اور دوسری دنیا کی ابدی اور لامحدود زندگی میں بھی سعادت

مند ہوں گے۔ وضاحت: ہم جانتے ہیں کہ سعادت مند وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی اشتباہ اور گمراہی میں نہ گزار دی ہو، اس کے اخلاق پسندیدہ ہوں اور نیک کام انجام دیتا ہو۔ خدا کا دین ہمیں اسی سعادت اور خوش بختی کی طرف ہدایت کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ: اولاً: جن صحیح عقائد کو ہم نے اپنی عقل و شعور سے درک کیا ہے، انہیں مقدس و محترم جانیں۔ ثانیاً: ہم پسندیدہ اخلاق کے مالک ہوں اور حتی الامکان اچھے اور شائستہ کام انجام دیں، اس بناء پر دین تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے: ۱۔ عقائد

۲۔ اخلاق

۳۔ عمل

عقائد

اگر ہم اپنی عقل و شعور کی طرف رجوع کریں تو دیکھیں گے کہ اس عظیم اور وسیع کائنات کی ہستی، اس حیرت انگیز نظام کے ساتھ، خود بخود وجود میں آنا۔ اور اس کا اول سے آخر تک کا نظم و نسق، کسی منظم کے بغیر ہونا ممکن نہیں ہے۔ یقیناً کوئی خالق ہے جس نے اپنے لامحدود علم و قدرت سے اس عظیم کائنات کو پیدا کیا ہے اور تمام امور میں پائے جانے والے ثابت و ناقابل تغیر قوانین کے ذریعہ کائنات کے نظام کو انتہائی عدل و انصاف کے ساتھ چلایا ہے۔ کوئی بھی چیز عبث خلق نہیں کی گئی ہے اور کوئی بھی مخلوق خدائی قوانین سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

لہذا یہ باور نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایسا مہربان خدا جو اپنی مخلوق پر اس قدر مہربان ہے، انسانی معاشرے کو انسان جو زیادہ تر نفسانی خواہشات کا اسیر بن کر گمراہی اور بد بختی سے دوچار ہوتا ہے۔ کی عقل کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ اس بناء پر، معصوم انبیاء کے ذریعہ بشر کے لئے ایسے قواعد و ضوابط کا بھجنا ضروری ہے تاکہ ان پر عمل کر کے انسان سعادت و خوش بختی تک پہنچ جائے۔ چونکہ پروردگار کے احکام کی اطاعت کی جزا اس دنیا کی زندگی میں مکمل طور پر ظاہر نہیں ہو سکتی، لہذا ایک دوسرے جہان کا ہونا

ضروری ہے کہ جہاں پر لوگوں کا حساب و کتاب ہو، اگر کسی نے نیک کام انجام دیا ہے تو اسے اس کی جزا ملے اور اگر کسی سے کوئی برا کام سرزد ہوا ہو تو اسے اس کی سزا ملے۔ دین، لوگوں کو ان اعتقادات اور دیگر تمام حقیقی عقائد۔ جن کو ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ کی طرف توثیق کرتا ہے اور انہیں جہل و بے خبری سے پرہیز کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

اخلاق

دین، کاہم سے مطالبہ یہ ہے کہ زندگی میں پسندیدہ صفات اختیار کریں اور اپنے آپ کو قابل ستائش اور نیک خصلتوں سے آراستہ کریں۔ ہم فرض شناس، خیر خواہ، انسان دوست، مہربان، خوش اخلاق اور انصاف پسند بن کر حق کا دفاع کریں۔ اپنے حدود اور حقوق سے آگے نہ بڑھیں اور لوگوں کے مال، عزت، آبرو اور جان پر تجاوز نہ کریں۔ علم و دانش حاصل کرنے میں کسی بھی قسم کے ایثار اور فدا کاری سے دریغ نہ کریں، خلاصہ یہ کہ اپنی زندگی کے تمام امور میں عدل و انصاف اور اعتدال کو اپنا شیوہ قرار دیں۔

عمل

دین، ہمیشہ حکم دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں وہ کام انجام دیں جن میں ہماری اپنی اور اپنے معاشرے کی خیر و صلاح ہو۔ اور فساد و تباہی مچانے والے کاموں سے پرہیز کریں۔ اس کے علاوہ دین ہمیں یہ بھی حکم دیتا ہے کہ خدائے متعال کی عبادت و پرستش کے عنوان سے کچھ اعمال جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔ جو بندگی اور فرمانبرداری کی نثانی ہے۔ کو بجالائیں۔ یہ وہ قواعد و ضوابط اور احکام ہیں، جنہیں دین لے کر آیا ہے اور ہمیں ان کی طرف دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ واضح ہے کہ ان ضوابط اور احکام میں سے کچھ کا تعلق عقیدہ سے کچھ کا اخلاق سے اور کچھ کا عمل سے ہے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ان کو قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا ہی انسان کے لئے سعادت و خوش بختی ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے لئے سعادت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ حقیقت شناس ہو اور پسندیدہ اخلاق و اعمال پر مبنی زندگی بسر کرے۔

دین کا فطری ہونا

انسان اپنی فطرت اور خداداد طینت کے لحاظ سے دین کا خواہاں ہے، کیونکہ انسان اپنی زندگی کے سفر میں سعادت حاصل کرنے کے لئے مسلسل ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ان اسباب و وسائل سے استفادہ کرتا ہے جو اس کے مقاصد میں مؤثر ہیں، بیشک وہ ہمیشہ ایسے سبب کی تلاش میں ہوتا ہے جو مؤثر ہو اور وہ ناکام نہ ہو۔ دوسری طرف ہم عالم طبیعت میں کوئی ایسا سبب نہیں پاتے جس کا اثر دائمی ہو اور وہ کبھی رکاوٹوں کے مقابلہ میں ناکام نہ ہو۔ انسان فطرت کے مطابق اپنی سعادت کے لئے ایک ایسا سبب چاہتا ہے جو ناکام نہ ہو اور ایک ایسا پشت پناہ بھی چاہتا ہے کہ جو کبھی ساتھ نہ چھوڑے تاکہ اپنی زندگی کو اس سے منسلک کر دے اور باطنی آرام و سکون حاصل کر سکے، حقیقت میں دین بھی یہی چاہتا ہے۔ کیونکہ صرف خدائے متعال ہے جو اپنے ارادہ میں ہرگز مغلوب و ناکام نہیں ہوتا ہے اور عذر و قصور اس کے لئے قابل تصور نہیں ہے، اور خدائے متعال سے مربوط زندگی کے طریقوں کا نام ہی ”دین اسلام ہے“۔

اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی فطری خواہش، دین کے تین بنیادی اصولوں توحید، نبوت اور معاد کو ثابت کرنے کے بہترین دلائل میں سے ایک ہے، کیونکہ فطری ادراک دوستی اور دشمنی کے مفہوم کو مخلوط نہیں کرتا ہے اور تنگی کو سیراب نہیں سمجھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات انسان یہ تمنا کرتا ہے کہ پرندے کے مانند اس کے بھی پر ہوتے تاکہ پرواز کرتا یا ایک ستارہ کے مانند آسمان پر ہوتا اور طلوع و غروب کرتا، لیکن ان کی حقیقت محض ایک تصور ہے یہ اور بات ہے کہ انسان دل کی گہرائیوں سے اپنی سعادت، مطلق راحت و سکون یا انسانی تقاضوں کی بنا پر وہ سنجیدہ زندگی کی خاطر ایک پناہ گاہ کی تلاش میں ہے اور ہرگز اس سے منہ نہیں موڑتا ہے۔ اگر کائنات میں ناقابل مغلوب سبب (خدا) نہ ہوتا تو انسان اپنی بے آلائش طبیعت سے اس کی فکر میں نہیں پڑتا اور اگر مطلق آرام (جو آخرت کا سکون و آرام ہے) کا وجود نہ ہوتا تو انسان فطری طور پر اس کو پانے کی فکر ہی نہ کرتا اور اگر دینی طریقہ (جو نبوت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے) حق نہ ہوتا تو انسان کے باطن میں اس کی تصویر بھی نہ ہوتی۔ انسان مختلف قسم کی جہانی و روحانی مادی

و معنوی ضرورتیں رکھتا ہے کہ جس کو اجتماعی زندگی کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے اور انسانی معاشرے کا ہر فرد عام وسائل کو استعمال کر کے کسی رکاوٹ کے بغیر اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو آرام و آسائش میں گزارتا ہے اور دوسری دنیا کے لئے زادراہ حاصل کرتا ہے پس انسانی معاشرے میں ایک ایسا قانون نافذ ہونا چاہئے جو خالق کائنات کے ارادہ کے مطابق اور فطرت و خلقت سے ہم آہنگ ہو۔ اس قانون کے مطابق ہر ایک کو اپنی جگہ پر قرار پانا چاہئے اور معاشرے میں اپنی قدر و منزلت کے مطابق اس سے استفادہ کرے اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے پرہیز کرے آخر کار معاشرے کے تمام لوگ خدائے متعال کے ارادہ کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور سب آپس میں بھائی بھائی اور حق و انصاف کے مقابلہ میں برابر ہو جائیں۔

دین کے فائدے

مذکورہ بیانات سے ثابت ہو گیا کہ فرد اور معاشرے کی اصلاح میں دین ایک گہرا اثر رکھتا ہے بلکہ یہ سعادت و نیک بختی کا منفرد وسیلہ ہے۔ جو معاشرہ دین کا پابند نہ ہو وہ حقیقت پسندی اور جدت فکر سے محروم ہے، ایسے معاشرے کے لوگ اپنی قیمتی زندگی کو گمراہی اور ظاہر داری میں گزارتے ہیں، عقل کو پامال کر کے حیوانوں کی طرح تنگ نظری اور بیوقوفی میں زندگی گزارتے ہیں اور اخلاقی انحطاط اور کردار کی پستی کا شکار ہوتے ہیں اور اس طرح انسانی خصوصیات و امتیازات سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کا معاشرہ، علاوہ اس کے کہ ابدی اور اتھائی کمال و سعادت تک نہیں پہنچتا ہے، اس دنیا کی، اپنی مختصر اور ناپائدار زندگی میں بھی انحرافات اور گمراہیوں کے منحوس نتائج سے دوچار ہوتا ہے اور کسی نہ کسی وقت اپنی غفلت کے برے نتائج کو بھگتے گا اور واضح طور پر اسے معلوم ہو گا کہ سعادت کا راستہ دین ہی تھا اور سرانجام اپنے کردار سے پشیمان ہو گا۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: (قد افلح من زکما * وقد خاب من دہما) ”بیشک وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا، اور وہ نامراد رہا جس نے اسے آلودہ کر لیا“، البتہ جاننا چاہئے کہ جس چیز سے انسان کی سعادت اور فرد و معاشرے کی خوش بختی وابستہ ہے، وہ دینی ضوابط پر عمل

کرنا ہے۔ صرف نام سے کام نہیں چلتا، کیونکہ جس چیز کی اہمیت و قیمت ہے وہ خود حقیقت ہے نہ حقیقت کا دعویٰ۔ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن اس کا باطن تاریک ہے اور وہ اخلاقی طور پر گرا ہوا اور بد کردار ہے اس کے باوجود سعادت کے فرشتے کا منظر ہے، تو اسکی مثال اس بیماری کی جیسی ہے جو طیب کے نفع کو عیب میں رکھ کر صحت یابی کی توقع رکھتا ہے، یقیناً ایسا انسان اس فکر کے ساتھ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے: (ان الذین ءامنوا والذین ہادوا والتصاری والصائین من امن باللہ والیوم الآخر وعل صالحا فلم اجر ہم عند ربہم) ”جو لوگ بظاہر ایمان لائے یا یہودی نصاریٰ اور صابئین میں ان۔ جنہوں نے مجوسی مذہب سے یہودی مذہب کی طرف تامل پیدا کر کے جو سیت اور یہودیت سے ایک درمیانی دین ایجاد کیا، انہیں صابئین کہتے ہیں۔ میں سے جو واقعی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اس کے لئے پروردگار کے یہاں اجر و ثواب ہے،“ یہ ممکن ہے اس آیہ شریفہ کے مضمون سے یہ تصور کیا جائے کہ جو لوگ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دے ہوں، اگرچہ انہوں نے تمام پیغمبروں یا بعض پیغمبروں کو قبول بھی نہ کیا ہو، تب بھی وہ نجات پائیں گے۔ لیکن جاننا چاہئے کہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۵۰ اور ۱۵۱ میں پروردگار عالم ان لوگوں کو کافر جانتا ہے جو تمام پیغمبروں یا بعض پیغمبروں پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔

تاریخ ادیان کا ایک خلاصہ

ادیان کے وجود میں آنے کے بارے میں اجمالی تحقیق، مطمئن ترین راہ۔ جس پر دینی نقطہ نگاہ سے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید ہی کا بیان ہے، کیونکہ یہ ہر قسم کی خطا، اشتباہ، تعصب اور خود غرضی سے منزہ و پاک ہے۔ (ان الذین عند اللہ الاسلام) ”... دین خدا، دین اسلام ہی ہے“ جو انسان کی پیدائش کے پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں تاکید ہوئی ہے کہ: بشر کی موجودہ نسل کی ابتداء میں دو شخص ایک مرد اور ایک عورت تھے۔ مرد کا نام ”آدم“، اور اس کی بیوی کا نام ”حواء“ تھا۔ حضرت آدم،

^۱ بقرہ ۶۲

^۲ آل عمران ۱۹۰

ہینمبر تھے اور ان پر وحی نازل ہوتی تھی۔ حضرت آدم کا دین بہت سادہ اور چند کلیات پر مشتمل تھا، جیسے لوگوں کو خدا کو یاد کرنا چاہئے اور آپس میں، خاص کر اپنے والدین کے ساتھ احسان و نیکی کرنا چاہئے، فساد، قتل اور برے کاموں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ آدم اور ان کی بیوی کے بعد، ان کی اولاد اتھائی سادگی اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ زندگی گزارتی تھی، چونکہ دن بدن ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، لہذا رفتہ رفتہ انہوں نے اجتماعی زندگی اختیار کر لی۔ اس طرح وہ بتدریج زندگی کے طور طریقوں کو یکتہ تھے اور تہذیب و تمدن سے قریب ہوتے تھے۔ چونکہ آبادی بڑھتی گئی اس لئے وہ مختلف قبیلوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر قبیلہ میں کوئی نہ کوئی بزرگ پیدا ہوتا تھا اور قبیلہ کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے، یہاں تک کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنا کر اس کا احترام و ستائش کرتے تھے۔ اسی زمانہ سے لوگوں میں بت پرستی کا رواج پیدا ہوا چنانچہ ائمہ علیم السلام کی روایتوں میں آیا ہے کہ بت پرستی اسی طرح شروع ہوئی ہے اور بت پرستی کی تاریخ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔

رفتہ رفتہ طاقتور افراد کمزوروں اور ضعیفوں پر زیادتی کرنے لگے اور اس طرح لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور یہ اتفاقی طور پر پیدا ہونے والے اختلافات ان کی زندگی میں گونا گوں کشمکش اور لڑائی جھگڑے پیدا کرنے کا سبب بنے۔ یہ اختلافات۔ جو انسان کو سعادت کی راہ سے منحرف کر کے بد بختی اور ہلاکت کی طرف لے جاتے تھے۔

اس امر کا سبب بنے کہ خدائے مہربان نے کچھ انبیاء کو منتخب کر کے آسمانی کتاب کے ساتھ بھیجا تا کہ انسان کے اختلافات کو دور کریں چنانچہ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے: (کان الناس امة واحدة فبعث اللہ النبیین بشیرین و منذرین و انزل معہم الکتاب بالحق لیکلم بین الناس فیما اختلفوا فیہ) (فطری اعتبار سے) سارے انسان ایک قوم تھے۔ پھر اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں،

دین اسلام اور اس کی آسمانی کتاب

دین اسلام، ایک عالمی اور ابدی دین ہے۔ اس میں اعتقادی، اخلاقی اور علمی ضوابط کے امور کا ایک سلسلہ ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیا و آخرت کی سعادت و خوش بختی حاصل کرتا ہے۔ دین اسلام کے قواعد و ضوابط۔ جو خالق کائنات کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ ایسے ہیں کہ اگر انسانی معاشرے کا کوئی فرد یا انسانی معاشروں میں سے کوئی معاشرہ ان پر عمل کرے تو اس کے لئے زندگی کے بہترین شرائط اور ترقی یافتہ ترین انسانی کمال حاصل ہو سکتے ہیں۔ دین اسلام کے نیک آثار ہر فرد اور ہر معاشرے کے لئے مساوی ہیں اور چھوٹے بڑے، عالم و جاہل، مرد و عورت، سفید فام و سیاہ فام اور مشرقی و مغربی، بلا استثناء اس مقدس دین کے فوائد اور خوبیوں سے فیضیاب ہو سکتا ہے، اور اپنی ضرورتوں کو اچھی طرح پورا کر سکتا ہے۔

دین اسلام نے اپنے معارف و ضوابط کو فطرت کی بنیاد پر استوار کیا ہے اور انسان کی ضرورتوں کو مد نظر رکھا ہے، اور ان کو پورا کرتا ہے اور انسان کی فطرت اور ساخت بھی مختلف افراد، نسلوں اور متعدد زمانوں میں یکساں ہے، اس لحاظ سے واضح ہے کہ انسانی معاشرہ مشرق سے لے کر مغرب تک ایک ہی قسم کا خاندان ہے اور وہ انسانی ساخت کے اصول و ارکان میں آپس میں شریک ہیں اور مختلف افراد اور نسلوں کی ضرورتیں بھی مشابہ ہیں اور بشر کی آنے والے نسلیں بھی اسی خاندان کی اولاد ہیں اور یقیناً انہی کے وارث ہیں اور ان کی ضرورتیں انہی کی ضرورتیں جیسی ہوں گی۔

نتیجہ کے طور پر، اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسان کی واقعی اور فطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور بھیجے گئے کافی اور ابدی ہے۔ اسی لئے خدائے تعالیٰ نے اسلام کو دین فطرت کا نام دیا ہے اور لوگوں کو انسانی فطرت کو زندہ رکھنے کی دعوت دیتا ہے اور دین کے بزرگوں نے فرمایا ہے: ”اسلام ایک آسان دین ہے جو انسان پر میں سختی نہیں کرتا۔“ خدائے تعالیٰ نے دین اسلام کو فطرت کی بنیاد پر بنایا ہے لہذا اس کی کلیات سبھی کے لئے قابل فہم و درک ہیں، لیکن پھر بھی اس نے اس کے اصلی معارف و ضوابط کی بنیادوں کو پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب ”قرآن مجید“ میں

فرمایا ہے۔ دین مقدس اسلام آخری آسمانی دین ہے اس لئے یہ مکمل ترین دین ہے۔ اس دین کے آنے کے بعد گذشتہ دین منوع ہو گئے کیونکہ کامل دین کے ہوتے ہوئے ناقص دین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دین اسلام ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ بشر کے لئے بھیجا گیا ہے۔ نجات اور سعادت کا یہ دروازہ دنیا کے لوگوں کے لئے اس وقت کھولا گیا جب انسانی معاشرہ اپنی فکری ناتوانی کے دور سے گزر رہا تھا اور انسانیت کے کمال کو حاصل کرنے کے لئے مکمل طور پر آمادہ ہو چکا تھا اور الہی معارف اور اس کے بلند مطالب کو حاصل کرنے کی لیاقت پیدا کر چکا تھا۔

اسی لئے اسلام حقیقت پسندانہ انسان کے لئے قابل فہم حقائق و معارف اور پسندیدہ اخلاق لیکر آیا۔ جو انسان کا امتیاز ہے، اور انسان کی زندگی کے انفرادی و اجتماعی کاموں کو منظم کرنے والے ضوابط، لائے اور ان پر عمل کر نیکی نصیحت کی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ دین اسلام کے معارف بھی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں: ”اصول دین، اخلاق اور فروع فقہی“ نیز واضح رہے کہ اصول دین یعنی دین کی اصلی بنیادیں، تین ہیں اور اگر انسان میں ان میں سے کوئی ایک نہ پائی جائے تو وہ دین سے خارج ہو جاتا ہے: ۱۔ توحید یعنی خدا کی وحدانیت پر عقیدہ رکھنا۔

۲۔ انبیاء کی نبوت پر عقیدہ رکھنا، جن کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

۳۔ معاد پر ایمان یعنی یہ عقیدہ ہو کہ، خدا نے متعال مرنے کے بعد بھی کو زندہ کرے گا ان کے اعمال کا حساب لے گا۔ نیک لوگوں کو نیکی کی جزا اور برے لوگوں کو سزا دے گا۔ مذکورہ تین اصولوں میں مزید دو اصول اضافہ کئے جاتے ہیں جو مذہب شیعہ کے مخصوص عقائد میں کہ جن کے نہ پائے جانے پر انسان شیعہ مذہب سے خارج ہوتا ہے، اگرچہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور وہ دو یہ

میں: ۱۔ امامت

۲۔ عدل

دین، قرآن مجید کی نظر میں

(ان الذین عند اللہ الاسلام وما اختلف الذین اتوا الکتاب الا من بعد ما جاءهم العلم بنیاً ینعم ومن یکفر بایات اللہ فان اللہ سریع الحساب) ”دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے علم آنے کے بعد ہی جھگڑا شروع کیا صرف آپس کی شرارتوں کی بنا پر اور جو بھی آیات الہی کا انکار کرے گا تو خدا بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔“ انبیاء نے جس دین کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہے وہ خدا پرستی اور اس کے احکام کے مقابلہ میں تسلیم ہونا ہے۔ ادیان کے علماء باوجود اس کے کہ حق کی راہ کو باطل سے تشخیص دیتے تھے، تعصب و دشمنی کی وجہ سے حق سے منحرف ہو کر ہر ایک نے ایک الگ راستہ اختیار کیا، اور نتیجہ کے طور پر دنیا میں مختلف ادیان وجود میں آ گئے۔

حقیقت میں لوگوں کے اس گروہ نے آیات الہی کی نسبت کفر اختیار کیا ہے اور خدائے متعال ان کے اعمال کی جلد ہی سزا دے گا: (ومن یتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه و هو فی الآخرة من الخاسرین) ”اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن خسارہ والوں میں ہوگا۔“ (یا ایہذا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان انه لکم عدو متبین) ”ایمان والو! تم سب مکمل طریقہ سے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی اقدامات کا اتباع نہ کرو وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

” (واوفوا بعہد اللہ اذا عاہدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدہا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلاً ان اللہ یعلم ما تفعلون) ”اور جب کوئی عہد کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور اپنی قسموں کو ان کے استحکام کے بعد ہرگز مت توڑو جب کہ تم اللہ کو کفیل اور نگران بنا چکے ہو کہ یقیناً اللہ تمہارے افعال کو خوب جانتا ہے۔“ اس آیت شریفہ کا مقصد یہ ہے کہ، مسلمان جو بھی عہد و پیمان خدا یا بندوں سے کریں، انہیں اس

^۱ آل عمران ۱۹

^۲ آل عمران ۸۵

^۳ بقرہ ۲۰۸

^۴ نحلہ ۹۱

پر عمل کرنا چاہئے اور اسے نہ توڑیں۔ (ادع الی سبیل ربک باحکمتوا لموعظۃ الحسۃ و جادلہم بالتی ہی احسن ان ربک ہو اعلم بمن ضل عن سبیلہ و ہو اعلم بالملتین^۱) ”آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ دعوت دیں اور ان سے اس طریقہ سے بحث کریں جو بہترین طریقہ ہے کہ آپ کا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے ہٹ گیا ہے اور کون لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔“ مقصد یہ ہے کہ دین کی ترقی کیلئے مسلمان کو ہر ایک کے ساتھ اس کی عقل و فہم کے مطابق اس کے لئے مفید ہو، اور اگر دلیل و برہان اور نصیحت سے کسی کی راہنمائی نہ کر سکا تو جدل (جو کہ مطلب کو ثابت کرنے کا ایک طریقہ ہے) کے ذریعہ اس کو حق کی طرف دعوت دے۔ (واذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون^۲) ”اور جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو خاموش ہو کر غور سے سنو شاید تم پر رحمت نازل ہو جائے۔“ (یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئ فردوه الی اللہ و الرسول ان کنتم تو منون باللہ و الیوم الآخر ذلک خیر و احسن تاویلاً^۳) ”ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے میں پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔“ مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشروں میں، اختلاف دور کرنے کا وسیلہ، قرآن مجید اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اور ان دودلیوں کے ذریعہ ہر اختلاف کو حل کرنا چاہئے اور اگر کسی مسلمان نے عقل سے اختلاف دور کیا، تو وہ بھی اس لئے ہے کہ قرآن مجید نے عقل کے حکم کو قبول کیا ہے۔

(فما رحمۃ من اللہ لنت لهم ولو کنتم قفاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنہم واستغفر لهم و شاورہم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین^۴) ”پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بد مزاج اور سخت دل

^۱ نحلہ ۱۲۵

^۲ اعرافہ ۲۰۴

^۳ نساء، ۵۹

^۴ آل عمران، ۱۵۹

ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، لہذا تم انہیں معاف کر دو۔ ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے جنگ کے امور میں مشورہ کرو اور جب ارادہ کرو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، کیونکہ نیک برتاؤ، خیر خواہی اور امور میں مشورہ کرنا، انس و محبت کا وسیلہ ہے اور معاشرہ کے افراد کو اپنے سرپرست سے محبت کرنی چاہئے تاکہ وہ ان کے دلوں میں نفوذ کر سکے۔ خدائے متعال مسلمانوں کے سرپرست کو خوش اخلاقی اور مشورہ کا حکم دیتا ہے، اور یہ حکم اس لئے ہے کہ ممکن ہے لوگ اپنی سوچ میں غلطی کریں لہذا حکم دیتا ہے کہ ثبوت کے بعد اپنے فیصلہ میں آزاد ہو اور اس لئے کہ خدا کے ارادہ سے کوئی مخالفت نہیں کر سکتا ہے، اپنے امور میں خدا پر توکل کر کے اپنے کام اسی کے سپرد کرے۔

معاشرے میں دین کا کردار

دین، ایک بہترین روش ہے، جس سے انسانی معاشرہ کو منظم کیا جاسکتا ہے اور یہ دوسری تمام روشوں سے زیادہ لوگوں کو اجتماعی قوانین کی رعایت کرنے پر ابھارتا ہے، اور جب ہم ان اسباب و علل کا مطالعہ کرتے ہیں جو ماضی میں انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کا سبب بنے ہیں تو یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ انسان زندگی میں اپنی سعادت و کامرانی کے علاوہ کسی چیز کو نہیں چاہتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے۔

البتہ یہ سعادت زندگی کے تمام وسائل کی فراہمی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف انسان اپنے خداداد فہم و شعور سے درک کرتا ہے کہ وہ ان تمام ضرورتوں کو تنہا پورا نہیں کر سکتا کہ جن سے وہ اپنی من پسند سعادت کو حاصل کر سکے۔ واضح ہے کہ زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنا ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ اس لحاظ سے انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہی جیسے لوگوں سے مدد لینے پر مجبور ہے تاکہ اپنے ضروری اور حیات آفرین وسائل کو حاصل کر سکے، اس صورت میں کہ ہر ایک ان وسائل میں سے کسی ایک کو حاصل کرنے کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے اور اسے فراہم کرتا ہے، اس کے بعد تمام افراد اپنی فعالیتوں کے حاصل کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص اپنی فعالیت اور حیثیت کے

مطابق حصہ لیتا ہے اور اس سے اپنی زندگی کو چلاتا ہے۔ اس طرح، انسان اپنی سعادت کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہم نوع انسانوں کا تعاون کرتا ہے اور ان سے تعاون لیتا ہے یعنی مختصر یہ کہ تمام لوگ ایک دوسرے کے لئے کام کرتے ہیں اور اس کام کے نتیجہ کو جمع کرتے ہیں اور معاشرے کا ہر فرد اپنی حیثیت اور فعالیت کے مطابق اپنا حصہ لے لیتا ہے۔

معاشرے کو قوانین کی ضرورت

لوگوں کی محنت و مشقت کا حاصل چونکہ ایک ہوتا ہے اور سب اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے معاشرے کو کچھ قوانین کی ضرورت ہے تاکہ ان کی رعایت سے بغاوت اور لاقانونیت کو روکا جاسکے۔ واضح ہے کہ اگر معاشرے کا نظام چلانے کے لئے کچھ ضوابط و قوانین نہ ہوں تو افراتفری پھیلتی ہے اور انسانی معاشرہ اپنی زندگی کو ایک دن بھی جاری نہیں رکھ سکتا۔ البتہ یہ قوانین معاشرے اقوام، لوگوں کی فکری سطح اور حکومتی دفاتر کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر حال کوئی بھی ایسا معاشرہ نہیں پایا جاسکتا جو ایسے قوانین سے بے نیاز ہو کہ جن کا اکثر افراد احترام کرتے ہوں۔ تاریخ بشریت میں ہرگز ایسا کوئی معاشرہ نہیں پایا گیا جس میں کسی قسم کے مشترک آداب و رسوم و قوانین و ضوابط نہیں تھے۔

قوانین کے مقابلہ میں انسان کا آزاد ہونا

چونکہ انسان اپنے تمام کام اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے، اس لئے وہ ایک طرح کی آزادی محسوس کرتا ہے اور وہ اس آزادی کو ”مطلق“، یعنی بدون قید و شرط تصور کر کے، مکمل آزادی چاہتا ہے اور ہر قسم کی پابندی سے بھاگتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہر طرح کی رکاوٹ و محرومیت سے رنجیدہ ہوتا ہے اور مختصر یہ کہ وہ ہر دھمکی سے اپنے اندر دباؤ اور خاص ناکامی کا احساس کرتا ہے، اس لحاظ سے اجتماعی قوانین چاہے کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں چونکہ وہ ایک حد تک انسان کو پابند کرتے ہیں، لہذا وہ اسکی حریت پسندی کے خلاف ہوں گے۔ دوسری طرف انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر معاشرہ اور اس کے نظم و نسق کے تحفظ کے لئے وضع کئے گئے قوانین کے مقابلہ میں اپنی آزادی سے کسی حد تک دستبردار نہ ہو جائے تو افراتفری پھیل کر اس کی پوری آزادی و آسائش ختم ہو جائے گی

پہنچا نہ اگر وہ کسی کے ہاتھ سے ایک لقمہ لے گا تو دوسرے لوگ اس کے ہاتھ سے پورا کھانا چھین لیں گے اور اگر وہ کسی پر ظلم کرے گا تو دوسرے بھی اس پر ظلم کریں گے۔ اس لحاظ سے اسے چاہیے کہ اپنی آزادی کے ایک حصہ کو محفوظ رکھے اور اس کے دوسرے حصہ سے صرف نظر کرے تو اس طرح وہ اجتماعی قوانین و ضوابط کا احترام کرے گا۔

قوانین کی ترقی میں کمزوریاں

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، انسان کی آزاد پسند ذہنیت اور اجتماعی ضوابط کے درمیان ایک قسم کا ٹکراؤ اور تضاد موجود ہے۔ یعنی قوانین ایک قسم کی زنجیر ہے جو اس کے پاؤں میں پڑی ہے اور وہ ہمیشہ اس زنجیر کو توڑنا چاہتا ہے تاکہ اس پھندے سے رہائی پائے اور یہ اجتماعی قوانین کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جو اس کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔

اسی لئے ہمیشہ قوانین اور اعلیٰ فرائض کی خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا کے لئے کچھ اور قواعد و ضوابط بنائے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے روکا جاسکے، اس سلسلہ میں کبھی لوگوں کو قوانین کی اطاعت کرنے کی توثیق کے لئے انعامات کی امید دلائی جاتی ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ (یعنی سزا کا خوف اور جزا کا شوق) قوانین کے نفاذ میں کسی حد تک مدد کرتا ہے۔ لیکن یہ خلاف ورزی کے راستہ کو سو فیصد بند کر کے قانون کے اثر و تسلط کو مکمل طور پر تحفظ نہیں بخش سکتا، کیونکہ تعزیراتی قوانین بھی دوسرے کارآمد قوانین کے محتاج ہونے کی وجہ سے خلاف ورزی سے محفوظ نہیں ہیں اور انسان کی آزاد پسند طبیعت کی طرف سے انہیں ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ چونکہ جو لوگ مکمل طور پر نفوذ اور طاقت رکھتے ہیں وہ کسی خوف و ہراس کے بغیر کھلم کھلا مخالفت کر سکتے ہیں یا نفوذ کے ذریعہ، عدلیہ اور انتظامی محکموں کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

جو لوگ نفوذ و طاقت نہیں رکھتے ہیں، وہ بھی معاشرے کی ہدایت کرنے والوں کی غفلت یا کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مخفیانہ طور پر خلاف ورزی کر سکتے ہیں یا رشوت اور سفارش کے ذریعہ یا معاشرے کے بااثر اشخاص کے ساتھ دوستی اور رشتہ داری کے ذریعہ

اپنے مقصد تک پہنچ سکتے ہیں اور اس طرح معاشرے کے نظم کو عام حالات سے خارج کر کے ناکارہ بنا سکتے ہیں۔ اس بات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ہم مختلف انسانی معاشروں میں اس قسم کی مخالفتوں اور قانون شکنی کے ہزاروں نمونے روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔

قانون میں خامی کا اصلی سرچشمہ

اب دیکھنا چاہئے کہ اس خطرہ کا سرچشمہ کہاں ہے اور انسان کی سرکش اور آزادی پسند طبیعت کو کیسے قابو میں کیا جائے اور نتیجہ میں قانون کی مخالفت کو روکا جائے؟ اس خطرہ کا سرچشمہ جو معاشرے میں فساد برپا کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے یہاں تک کہ قوانین بھی اسے روک نہیں سکتے۔ یہ ہے کہ عام اجتماعی طریقے جو قوانین کو وجود میں لاتے ہیں، کہ جن کا تعلق افراد کے مادی مراحل سے ہے، وہ ان کی مغنیات اور باطنی فطرتوں کی کوئی اعتنا نہیں کرتے اور ان کا مقصد صرف ہماہنگی اور نظم و نسق کا تحفظ اور لوگوں کے اعمال کے درمیان توازن برقرار رکھنا ہوتا ہے تاکہ اختلاف اور کشمکش کی نوبت نہ آئے۔ اجتماعی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ قانون کی شقوں پر عمل کیا جائے اور معاشرے کے امور کو کنٹرول کیا جائے۔ اس قانون کا انسان کے داخلی صفات اور باطنی جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہے، جو ان اعمال کے محرک اور قوانین کے داخلی دشمن ہیں۔

اس کے باوجود اگر انسان کی آزادی پسند فطرت اور دوسرے سیکڑوں جبلتوں (جیسے خودخواہی اور شہوت پرستی جو مفاسد کے اصلی سبب ہیں) کی طرف توجہ نہ کی جائے تو معاشرے میں افراتفری اور لاقانونیت رائج ہو جائے گی اور اختلافات کا دامن روز بروز پھیلتا جائے گا، کیونکہ تمام قوانین کو ہمیشہ قوی باغیوں اور سرکشوں کے حملہ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے جو انہی جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور کوئی قانون برے کو کنٹرول کر کے اختلافات کو نہیں روک سکتا ہے۔

تمام قوانین ہر دین کی ترجیح

قانون کے تحت کے لئے آخری طریقہ، تعزیراتی قوانین وضع کرنا اور محافظ مقرر کرنا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا، تعزیراتی قوانین اور محافظ انسان کی سرکشی اور دیگر جہتوں کو روک نہیں سکتے تاکہ اجتماعی قوانین پر عمل ہو سکے۔ دین کے پاس مذکورہ وسائل کے علاوہ مزید دو طاقتور وسیلے بھی موجود ہیں، جن سے وہ ہر مخالف طاقت کو مغلوب کر کے اسے تس نہس کر سکتا ہے: ۱۔ ہر دین دار فرد دین کی راہنمائی سے اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ اس کی زندگی اس ناپائدار اور گزر جانے والی دنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے سامنے ایک ابدی اور لامحدود زندگی ہے، جو موت سے نابود نہیں ہوتی۔ اس کی ابدی سعادت اور آسائش صرف اس میں ہے کہ وہ پروردگار عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے توسط سے بھیجے گئے قوانین کی پیروی کرے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دینی قوانین، ایک ایسے دانا اور مینا پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے ہیں، جو انسان کے باطن و ظاہر سے آگاہ ہے اور اپنی مخلوق سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہتا۔ ایک ایسا دن آنے والا ہے جس دن وہ اسی انسان کو اپنے پاس بلائے گا، اس کے پنہاں اور آشکار اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور نیک اعمال کی پاداش اور برے اعمال کی سزا دے گا۔

۲۔ ہر دیندار شخص اپنے دینی عقائد کے مطابق جانتا ہے کہ جب دینی حکم کو بجالاتا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی اطاعت کرتا ہے، اس کے باوجود وہ بندگی کی رسم کے مطابق کسی اجر پاداش کا مستحق نہیں ہے، لیکن پروردگار کے فضل و کرم سے اس کو نیک پاداش ملے گی، اس لحاظ سے ہر اطاعت کو انجام دے کر اس نے حقیقت میں اپنے اختیار سے ایک معاملہ اور ایک لین دین کیا ہے۔ چونکہ وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی کے ایک حصہ سے دست بردار ہوا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پروردگار کی خوشنودی و مہربانی حاصل کی ہے، اس لئے اسے اپنی نیکیوں کی پاداش ملے گی۔ دیندار شخص، دینی قوانین و ضوابط کی پیروی کر کے اپنی پوری خوشی سے معاملہ کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور جو کچھ اپنے اختیار سے دیتا ہے اس کے کئی گنا نفع کماتا ہے۔ وہ ایک چیز کو بچ کر اس کے بدلے میں اس سے بہتر مال خرید لیتا ہے۔ لیکن جو شخص دین کا پابند نہیں ہوتا، چونکہ وہ ضوابط کی رعایت اور قانون کی پیروی کو اپنے لئے

ایک نقصان تصور کرتا ہے اور اس کی آزادی پسند طبیعت اس کی آزادی کے ایک حصہ کو کھو دینے سے ناراض ہوتی ہے۔ وہ اس موقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اس زنجیر کو توڑ کر اپنی آزادی حاصل کرے۔

نتیجہ

مذکورہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کی زندگی کے تحفظ کے لئے دین کا اثر غیر دینی طریقوں کی نسبت زیادہ قوی اور عمیق ہے۔

دوسروں کی کوشش

دنیا کے پسماندہ ممالک، جو قرن اخیر میں ترقی و پیش رفت کی فکر میں ہیں، اگرچہ انہوں نے اجتماعی حکومت کو قبول کیا ہے، لیکن قانون کی ضعیف شقوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور دین کی طاقت سے استفادہ نہیں کیا ہے، اس لئے ان کی دنیا تاریک ہوئی ہے اور ان کی زندگی کا ماحول جنگل کے قانون میں تبدیل ہوا ہے۔ ان کے مقابلہ میں دنیا کی ترقی یافتہ اور ہوشیار قوموں نے قوانین کی کمزوری سے آگاہ ہو کر قانون کو حتمی ناکامی سے نجات دلانے کے لئے کچھ کوششیں کر کے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ ان قوموں نے تعلیم و تربیت کے نظام کو ایسے منظم کیا ہے کہ لوگوں میں خود بخود صحیح اخلاق پیدا ہوں اور جب وہ علمی میدان میں قدم رکھیں، تو قانون کو مقدس اور ناقابل مخالفت سمجھیں۔ اس قسم کی تربیت قانون کے عام طور پر نافذ ہونے کا سبب بنتی ہے اور نتیجہ میں قابل توجہ حد تک معاشرے کی سعادت کو پورا کر کے قانون کو ناکامی سے نجات دلائی جاتی ہے۔ لیکن جاننا چاہئے کہ ایسے معاشروں میں پرورش پانے والے انھار دو قسم کے ہوتے ہیں: ۱۔ انسان دوستی جیسے عقائد و انھار، اپنے ماتحتوں کے ساتھ خیر خواہی اور رحم دلی، جو حقیقت پسندی پر استوار ہوں بیشک ان کو آسمانی ادیان سے لیا گیا ہے اور قدیم زمانے سے (جبکہ ترقی یافتہ معاشرے وجود میں نہیں آئے تھے) دین، لوگوں کو ان انھار کی طرف دعوت دیتا رہا ہے۔ لہذا، جو خوش بختی اور سعادت ان انھار کے ذریعہ ترقی یافتہ معاشروں میں نظر آرہی ہے، وہ دین کے برکات میں شمار ہوتی ہے۔

۲۔ یہود اور افسانوی عقائد و افکار، جن کی خرافات کے بازار کے علاوہ کہیں کوئی اہمیت نہیں ہے، مثال کے طور پر افراد کو تلقین کی جاتی ہے کہ اگر وطن کی نجات کی راہ میں کوئی تکلیف اٹھائی یا قتل کئے گئے تو تمہارا نام تاریخ کے صفحات میں سہرے حروف سے لکھا جائے گا اگرچہ اس قسم کے خرافاتی تصورات کا ایک عملی نتیجہ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کوئی شخص اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر میدان جنگ میں جان نثاری کا ثبوت دے اور بہت سے دشمنوں کو قتل کر دے، لیکن وہ فائدے کے بجائے قوم کو بہت بڑا نقصان پہنچاتا ہے، کیونکہ یہ تفکر انسان کو خرافاتی بنا کر اس کی حقیقت پسندانہ فطرت کو بیکار بنا دیتی ہے، جو لوگ خدا اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور موت کو نابودی اور فنا سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں موت کے بعد ابدی اور کامیاب زندگی کا مفہوم و معنی نہیں ہے۔

انسان کے آرام و آسائش میں اسلام کی اہمیت

جیسا کہ ہم نے بیان کیا، دینی قوانین، دوسرے اجتماعی طریقوں کی بہ نسبت ممتاز ہیں۔ تمام ادیان میں اسلام کو برتری حاصل ہے۔ اس لحاظ سے انسانی معاشروں کے لئے اسلام دوسرے تمام روشوں سے زیادہ مفید ہے۔ اور اسلام اور دوسرے ادیان اور اجتماعی طریقوں کے موازنہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

اسلام کا دوسرے ادیان سے موازنہ

اسلام تمام ادیان کے درمیان منفرد دین ہے جو سو فیصد اجتماعی ہے۔ اسلام کی تعلیمات آج کل کے عیسائی دین کے مانند نہیں ہیں جو صرف لوگوں کی اخروی سعادت کو مد نظر رکھتا ہے اور ان کی دنیوی سعادت کے بارے میں خاموش ہے اور نہ ہی یہودیوں کے موجودہ دین کے مانند ہیں جو صرف ایک ملت کی تعلیم و تربیت کی مقبولیت کو مد نظر رکھتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات مجوس اور دیگر مذاہب کے مانند صرف اخلاق و اعمال سے مربوط چند موضوعات تک محدود نہیں ہیں بلکہ اسلام میں تمام لوگوں کے لئے دنیا و آخرت کی تعلیم و تربیت کو ہمیشہ کے لئے اور ہر زمان و مکان میں مد نظر رکھا گیا ہے بدیہی ہے کہ اس کے علاوہ معاشرے کی اصلاح اور لوگوں کی دنیا و آخرت کی سعادت کے لئے کوئی اور راستہ نہیں ہے: اولاً تمام انسانی معاشروں میں۔ جو اچھے روابط سے

روز بروز نزدیک اور محکم تر ہو رہے ہیں۔ صرف ایک معاشرہ یا ایک ملت کی اصلاح کرنا حقیقت میں ایک فضول کوشش ہے اور ایک بڑے آلودہ تالاب یا نہر کے ایک قطرہ پانی کو تصفیہ کرنے کے مانند ہے۔ ثانیاً: دوسرے معاشروں کے بارے میں غفلت کرتے ہوئے صرف ایک معاشرے کی اصلاح کرنا ایک ایسا امر ہے جو اصلاح طلبی کی حقیقت کے خلاف ہے۔

اسلامی تعلیمات میں کائنات اور انسان کی خلقت کے بارے میں انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے انکار، اخلاق اور انسانی زندگی میں پائی جانے والی تمام سرگرمیاں کی تحقیق کی گئی۔ لیکن اسلام میں انکار کے بارے میں جو عقائد حقیقت پسندانہ پہلوؤں پر مشتمل ہیں اور ان میں سر فرست خدائے متعال کی وحدانیت ہے، وہ اصل اور بنیاد قرار پائے ہیں۔ اور اخلاق اسلامی میں، وہ حقیقت جسے عقل سلیم قبول کرتی ہے، وہ توحید کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے پھر اس کے بعد اخلاق کی بنیاد پر، قواعد و ضوابط اور عملی قوانین بیان کئے گئے ہیں، جس کے نتیجہ میں ہر کالے گورے، شہری و دیہاتی، مرد و عورت، چھوٹے بڑے، غلام و آقا، حاکم و رعایا، امیر و غریب اور عام و خاص کے لئے انفرادی و اجتماعی فرائض بیان کئے گئے ہیں:

(... کلمۃ طیۃ کثیرۃ طیۃ اصلاً ثابت و فرعاً فی السماء...) ”کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ سے بیان کی ہے جس کی اصل ثابت ہے اور اس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔“ جو شخص اسلام کے بنیادی معارف، اخلاقی تعلیمات اور فقہ اسلامی پر محققانہ نظر ڈالے، گاتو وہ ایک ایسے بے کراں سمندر کا مشاہدہ کرے گا جس کی حدود اور گہرائیوں تک پہنچنے میں انسانی عقل و شعور قاصر ہے اس کے باوجود اس کا ہر جزء و دوسرے اجزاء سے متصل اور متناسب ہے اور یہ سب اجزاء مل کر خدا پرستی اور انسان پروری کو تشکیل دیتے ہیں، جیسا کہ خدائے متعال نے اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی ہے۔

ساج کے رسم و رواج سے اسلام کا موازنہ

جب ہم دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں کے طور طریقوں پر سنجیدگی سے نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان معاشروں کی سائنسی اور صنعتی ترقی نے عقلمندوں کو متحیر کر دیا ہے، وہ طاقت و ترقی کے بل بوتے پر مریخ اور چاند پر کمند ڈال رہے ہیں، ان کی ملکی تشکیلات نے انسان کو حیرت میں ڈال دیا ہے، لیکن یہی ترقی کے راستے اپنی قابل ستائش ترقی کے باوجود، عالم بشریت پر بد بختی و بد نصیبی ایسے مصائب کا سبب بنے ہیں۔

پچیس سال سے کم عرصہ میں دنیا کو دوبار خاک و خون میں غرق کر کے لاکھوں انسانوں کو نابود کر دیا ہے اور اس وقت بھی تیسری عالمی جنگ کا فرمان ہاتھ میں لئے ہوئے عالم بشریت کو نابود کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ انہی طریقوں نے اپنی پیدائش کے پہلے ہی دن سے ”انسان دوستی اور آزادی دلانے“ کے نام پر دنیا کے دیگر ممالک اور ملتوں کے ماتھے پر غلامی کے داغ لگا کر دنیا کے چار بڑے براعظموں کو اپنی استعماری زنجیروں میں جکڑ کر کسی قید و شرط کے بغیر براعظم یورپ کا غلام بنا دیا ہے اور ایک حقیر اقلیت کو کروڑوں بے گناہ انسانوں کے مال، جان و عزت پر مسلط کر دیا ہے۔

البتہ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ترقی یافتہ ملتیں اپنے ماحول میں مادی نعمتوں اور لذتوں سے سرشار ہیں اور بہت سے انسانی آرزوؤں جیسے اجتماعی انصاف اور ثقافتی و صنعتی ترقی تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی بے پناہ بد بختیوں اور بے شمار تاریکیوں سے دوچار ہوئے ہیں کہ ان میں سے اہم ترین یہ ہے کہ مین الاقوامی کشمکش اور خون ریزیاں دنیا کے مستقبل کو عوامی سطح پر اور ہر لمحہ ماضی سے بدتر حوادث کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ سب تلخ و شرین نتائج، ان ملتوں و معاشروں کی تہذیب و تمدن اور زندگی کے طور طریقوں کے درخت کا پھل ہیں جو بظاہر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔

لیکن جاننا چاہئے کہ اس کے میٹھے پھل جن سے انسان نے بہرہ مند ہو کر معاشرے کو باسعادت بنا دیا ہے ان ملتوں کے بہت سے پسندیدہ اخلاق جیسے سچائی، صحیح کام، فرض شناسی، خیر خواہی اور فداکاری کا نتیجہ ہے نہ صرف قانون کا کیونکہ یہی قوانین پسندیدہ ملتوں، جیسے ایشیا اور افریقہ میں بھی موجود ہیں حالانکہ ان کی پستی اور بدبختی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن اس درخت کا تلخ پھل جس سے انسان آج تک کو تلخ کام ہے وہ انسان کے لئے تاریکی اور بدبختی کا سبب بنا ہے اور خود ان ترقی یافتہ ملتوں کو بھی دوسروں کی طرح نابودی کی طرف کھینچ رہا ہے۔

کچھ ناپسندیدہ اخلاق میں، جن کا سرچشمہ: حرص، طمع، بے انصافی، بے رحمی، غرور، تکبر، ضد، اور ہٹ دھرمی ہے۔ اگر ہم دین مقدس اسلام کے قوانین پر سنجیدگی سے غور کریں، تو ہم متوجہ ہوں گے کہ اسلام مذکورہ صفات کے پہلے حصہ کا حکم دیتا ہے اور دوسرے حصہ سے روکتا ہے، مختصر یہ کہ کبھی طور پر تمام حق اور نیک انسان کی مصلحت کے امور کی دعوت دیتا ہے اور انہیں اپنی تربیت کی بنیاد قرار دیتا ہے اور ہر اس ناحق اور برے کام سے روکتا ہے جو انسان کی زندگی کے آرام میں خلل ڈالتا ہے (خواہ کسی خاص قوم و ملت سے مربوط ہو)

نتیجہ

مذکورہ بیانات کے نتیجہ کے طور پر مندرجہ ذیل چند نکات ذکر کئے جاتے ہیں: ۱۔ اسلام کا طریقہ دوسرے تمام اجتماعی طریقوں سے زیادہ پسندیدہ اور انسانیت کے لئے زیادہ مفید ہے: (ذلک دین التیمم و لکن اکثر الناس لا یعلمون) ... ”یقیناً یہی سیدھا اور مسکھم دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بے خبر ہے“

۲۔ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کے واضح نقوش اور میٹھے پھل بھی دین مقدس اسلام کی برکتیں اور اس کے آثار کی زندہ شقیں اور اصول میں جو مغرب والوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں کیونکہ اسلام، مغربی تمدن کے آثار کے رونما ہونے سے صدیوں پہلے لوگوں کو انہی

اخلاقی اصولوں کی طرف دعوت دے رہا تھا کہ یورپ والوں نے ان پر عمل کرنے میں ہم سے پیش قدمی کی۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام زندگی کے آخری لمحات میں لوگوں سے فرماتے تھے ”ہمہارا برتاؤ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ قرآن مجید پر عمل کرنے میں تم سے آگے بڑھ جائیں“^۱۔

۳۔ اسلام کے حکم کے مطابق ”اخلاق“ کو اصلی مقصد قرار دینا چاہئے اور قوانین کو اس کی بنیاد پر مرتب کرنا چاہئے، کیونکہ پسندیدہ اخلاق کو فراموش کرنا (جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے کا سبب ہے) انسان کو مغویت سے مادیت کی طرف ڈھکیل دیتا ہے اور اس کو بھیرٹئے، پھتے اور گائے جیسا درندہ بنا دیتا ہے نیز اس میں گوشت کے صفات پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ”بُعث لائم مکارم الاخلاق“^۲ ”میری بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کی اخلاقی تربیت ہے“، طبعی وسائل سے اسلام کی ترقی غیر طبعی وسائل کہ جن کا کوئی مادی وجود نہیں ہے، ناکام ہوتے ہیں اور جلد یا کچھ مدت بعد نابود ہو جاتے ہیں، اسلام جیسے دین میں جو کہ بشریت پر ہمیشہ حکومت کرنا چاہتا ہے، ان غیر طبعی وسائل سے استفادہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنی ترقی میں طاقت کا سہارا نہیں لیا ہے یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ”اسلام تلوار کا دین ہے“، حقیقت میں یہ لوگ صدر اسلام کی جنگوں کو ظاہری طور پر دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے فیصلہ کر دیتے ہیں۔ جو دین علم و ایمان کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو، اس کے لئے بعید ہے کہ وہ اپنی ترقی اور لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنے کے لئے تلوار کا سہارا لے لے (اسلام میں جہاد کے فلسفہ کا مطالعہ فرمائیں) اسی لئے اسلام نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے نیرنگ، جھوٹ اور سیاسی شعبہ بازی کا سہارا نہیں لیا ہے اور انہیں صحیح نہیں جانا ہے، کیونکہ اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ حق زندہ

^۱ نہج البلاغہ، صبحی صالح، ص ۴۲۲۔

^۲ بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۳۷۳۔

ہو اور باطل نابود ہو اور حق تک پہنچنے کے لئے باطل کی راہ پر گامزن ہونا، حق کی نابودی کا سبب بنتا ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے ”خدا ظالموں، بدکاروں اور حق کو چھپانے والوں کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دیتا“^۱

تبلیغ اور دعوت اسلام

اسلام نے لوگوں کی ہدایت اور حق کو پھیلانے کے لئے ایک ایسے راستہ کا انتخاب کیا ہے جو انسان کی فطرت اور خلقت کے عین مطابق ہے اور وہ ”تبلیغ اور دعوت کا راستہ“ ہے جو انسان کے لئے حقائق، حقیقت پسندانہ فطرت اور سعادت طلبی کو واضح کر کے اسے بیدار کر دیتا ہے اور آسانی کے ساتھ اسے حق کے حوالے کرتا ہے۔ یہ روش یعنی تبلیغ و دعوت ایک ایسی روش ہے جسے تمام انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جو خاتم ادیان اور بھرپور صلاحیتوں کا حامل دین، میں اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس راستہ کا اپنا نام مسلمانوں پر واجب کیا گیا ہے، تاکہ دین کی نشر و اشاعت میں کوتاہی نہ کریں۔ خدائے متعال اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے ”میرا اور میرے پیروں کا راستہ یہ ہے کہ وہ مکمل بصیرت کے ساتھ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں“^۲

تبلیغ کا طریقہ

مذکورہ آیہ شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا کام مکمل بصیرت سے انجام پانا چاہئے، مختصر یہ کہ مبلغ کو تبلیغ سے مربوط دینی مسائل سے آگاہ ہونا چاہئے اور تبلیغ کے طریقہ کار، شرائط اور اس کے آداب سے پوری طرح باخبر ہونا چاہئے۔ البتہ تبلیغ کے شرائط و آداب بہت زیادہ ہیں، جیسے: خوش اخلاقی، خندہ پیشانی، وقار و بردباری اور حق و انصاف کا احترام وغیرہ لیکن ان میں سب سے اہم علم و عمل ہے۔ کیونکہ جو شخص علم کے بغیر تبلیغ کرتا ہے، چونکہ وہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے اس لئے باطل کی تبلیغ کرنے والوں کی طرح، لوگوں کی حق تلفی کرنے اور انہیں گمراہ کرنے میں پروا نہیں کرتا ہے اور جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا، حقیقت

^۱ بقرہ ۱۵۹ و ۱۷۴۔

^۲ یوسف ۱۰۸۔

میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کی اپنے عمل سے تردید کرتا ہے اور جس چیز کی اپنی زبان سے تعریف کرتا ہے اس کی اپنے کردار سے مذمت کرتا ہے جو شخص کسی چیز کی طرف دوسروں کو دعوت دیتا ہے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتا، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے، جو ایک ہاتھ سے کسی چیز کو کھینچتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسے ڈھکیلتا ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے: ”کیا تم، لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟“

ہمارے آٹھویں امام حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے: ”لوگوں کو اپنے گفتار و کردار سے دعوت دو، نہ صرف گفتار سے

۴۶



^۱ (اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسكم ...) (بقرہ/ ۴۴)۔
^۲ بحار الانوار، ج ۸، ص ۳۰۸۔

اسلام میں تعلیم و تربیت

اسلام جہل و نادانی کی سرزنش کرتے ہوئے علم و دانش کی مدح کرتا ہے، اور اپنے پیروؤں کو علم و فضیلت حاصل کرنے کی توثیق کرتا ہے، جبکہ دوسرے ادیان کی کتابیں آزادانہ غور و فکر اور مخالفوں کی باتوں کی تحقیق کرنے سے منع کرتی ہیں۔ اسلام کی آسمانی کتاب (قرآن مجید) حق کو قبول کرنے کا حکم دیتی ہے خواہ وہ مخالف ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو اور انسان کے ساتھ استدلال اور آزادانہ طریقہ سے گفتگو کرتی ہے اور لوگوں کو آسمان و زمین اور ان میں موجود ہر چیز کی پیدائش، انسان کی خلقت، اسلاف کی تاریخ اور کائنات کی فطری گردش کے بارے میں غور و فکر کرنے کی تاکید کرتی ہے، بلکہ اس کے علاوہ محوسات کے دائرہ سے آگے بڑھ کر اور ماوراء طبیعت کے بارے میں غور و فکر کی تاکید کرتی ہے۔ اس موضوع کے بارے میں جو آیات اور روایات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے جانشینوں سے ہم تک پہنچی ہیں، وہ بے شمار ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم حاصل کرنے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ آپ نے فرمایا: ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔“

اسلامی تعلیمات کے دواہم شاہکار

مختلف انسانی معاشروں میں موجود ہر روش میں کچھ اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں، اگر وہ اسرار عام لوگوں پر ظاہر ہو جائیں، تو معاشرے کو چلانے والے حکام اور ان کی شوانی خواہشات متاثر ہوتی ہیں، اس لئے وہ ہمیشہ کچھ حقائق کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اس مطلب کا سبب یہ ہے کہ بہت سے مطالب اور ضوابط ان کے دماغ کی اچھ ہوتے ہیں، چونکہ انھیں اپنی عقل اور معاشرے کی مصلحت کے خلاف پاتے ہیں، اس لئے ڈرتے ہیں کہ اگر یہ اسرار فاش ہو گئے تو ان پر اعتراضات کی بوچھا ہو جائے گی اور ان کے مفاد خطرہ میں پڑ جائیں گے۔ اسی وجہ سے عیسائیوں کے کلیسا اور دوسرے ادیان کے روحانی مراکز انسان کو آزادانہ غور و فکر

^۱ ”طلب العلم فریضہ علی کل مسلم“ (بحار الانوار، ج ۱، ۱۷۲)۔

کرنے کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ دینی معارف اور مذہبی کتابوں کی توضیح و تفسیر کا حق صرف اپنے سے مخصوص کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی ہر بات چوں و چرا اور بحث و مباحثہ کے بغیر قبول کرنا ہوتی ہے۔ اسی روش نے بہت سی دینی روشوں کو نقصان پہنچایا ہے اور عیسائیوں کی موجودہ روش اس بیان کی سچائی کی گواہ ہے۔ لیکن اسلام اپنی حقانیت پر اطمینان و اعتماد رکھتا ہے اور اپنی راہ میں کسی قسم کے مبہم اور تاریک گوشہ کو نہیں پاتا اس لئے دوسرے تمام مذہبی اور غیر مذہبی طریقوں کے برخلاف حسب ذیل دو مسائل پر زیادہ توجہ دیتا ہے: ۱۔ اسلام کسی بھی حقیقت کو پوشیدہ نہیں رکھتا اور نہ ہی اپنے پیروں کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کسی حقیقت کو چھپائیں، کیونکہ اس مقدس دین کے قوانین فطرت اور خلقت کے قانون کے مطابق مرتب ہوئے ہیں اور حق و حقیقت کی رو سے اس کی کوئی چیز قابل تردید نہیں ہے۔ اسلام میں، حقائق کو چھپانا گناہان کبیرہ میں شمار ہوتا ہے اور خدائے متعال نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۹ میں حق کو چھپانے والوں پر لعنت کی ہے۔

۲۔ اسلام اپنے پیروں کو حکم دیتا ہے کہ حقائق اور معارف کے بارے میں آزادانہ طور پر غور و فکر کریں اور جہاں پر بھی معمولی سا ابہام نظر آئے، وہیں رک جائیں اور آگے نہ بڑھیں تاکہ ان کا روشن ایمان شک و شبہ کی تاریکی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے اور اگر شک و شبہ سے دوچار ہو جائیں تو نہایت انصاف اور حق پسندی سے اس کو رفع کرنے کی کوشش کریں اور آزادانہ طور پر ان کو حل کریں۔ خدائے متعال فرماتا ہے: ”جس چیز کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے مت جاؤ۔“

آزادی فکر اور حق پوشی

غور و خوض کے ذریعہ حقائق کو درک کر کے انہیں قبول کرنا انسان کے ذہن و دماغ کی گراں قیمت پیداوار ہے اور انسان کو حیوان پر امتیاز، فضیلت، شرف اور فخر بخشے کا واحد سبب ہے، اور انسان دوستی و حقیقت پسندی کی فطرت کر دیا جائے، تقلیدی انحرار کو تھوپ کر انسان کی آزادی فکر کو سلب کر لیا جائے یا حقائق کو چھپا کر اس کی عقل کو گمراہ کر دیا جائے۔ مختصر یہ کہ اس بات کی

^۱ (ولا تقف ما لیس لک بہ علم...) (اسراء/۳۶)۔

اجازت نہیں دیتی کہ خدا پسند افکار کو ناکارہ بنا دیا جائے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے کہ جہاں پر انسان کسی حقیقت کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا یا مد مقابل کی ہٹ دھرمی اور سخت رویہ کی وجہ سے و مزلت کے لئے انسان کے ذہن و دماغ کی گمراہی اور دوسرے مالی، جانی اور عزت کو پہنچنے والے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے حقائق کی پردہ پوشی کو جائز سمجھتی ہے۔ ائمہ اہل علم السلام نے اپنی بہت سی حدیثوں میں لوگوں کو بعض ایسے حقائق کے بارے میں غور و فکر کرنے سے منع کیا ہے جن کو سمجھنے کی انسان میں استعداد نہیں ہوتی۔ خدائے تعالیٰ نے بھی اپنے کلام میں دو موقعوں پر تقیہ کے طور پر حق چھپانے کو جائز جانا ہے۔

نتیجہ

- ۱۔ اسلام چند مواقع پر حق و حقیقت کے چھپانے کو بلا مانع بلکہ ضروری سمجھتا ہے: ۱۔ تقیہ کے موقع پر: یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں حق کے آگے بڑھنے کی کوئی امید نہیں ہو، بلکہ اس کے اظہار سے مال، جان اور عزت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔
- ۲۔ ایسے مواقع پر جہاں حق کسی کے لئے قابل فہم نہ ہو بلکہ اس کا اظہار گمراہی کا سبب بنے یا خود حق کی بے حرمتی کا باعث ہو۔
- ۳۔ ایسے مواقع پر جہاں آزاد فکر، استعداد کے فقدان کی وجہ سے، حق کو برعکس دکھاتے اور گمراہی کا سبب بنے۔

^۱ سورہ آل عمران، آیت ۲۸ اور سورہ نحل آیت ۱۰۶۔

سماجی زندگی میں اسلام کی خدمات

افراد کے منافع کا تحفظ اور رفع اختلاف

گزشتہ بحثوں سے واضح ہوا کہ دین مقدس اسلام ایک مکمل اجتماعی طریقہ ہے، اور واضح ہے کہ ایک معاشرے کی مکمل سعادت اور سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور زندگی کو لاحق کشمکش اور ان زیادتیوں کا حتی الامکان سد باب کیا جائے جن سے زندگی اور اس کے امن و امان کو خطرہ لاحق ہے تاکہ معاشرہ آرام اور تکامل کی طرف بڑھ سکے۔ البتہ ایک انسان کی فطری آرزو یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی زندگی میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ جسم و روح کے لحاظ سے سالم ہو اور اس کے شایان شان روٹی، کپڑا، مکان اس کے پاس ہو۔ اور وہ خاندان کو تشکیل دے کر اپنی جوانی اور بوڑھاپے کی آرزؤں کو پا سکے، اور امن و امان کے ماحول میں آرام کی زندگی گزارے، اس طرح انسانیت کی شاہراہ پر کسی مزاحمت اور روکاوٹ کے بغیر اپنی تلاش و کوشش کو جاری رکھے اور تکامل تک پہنچ جائے۔ ایک انسانی معاشرہ بھی اپنے افراد کے لئے، اس سے بڑھ کر آرزو نہیں رکھتا ہے اسلام نے اس انفرادی اور اجتماعی آرزو کو عملی جامہ پہنایا ہے، کیونکہ اس نے معاشرے کو ایک ایسا نبج دے دیا ہے کہ اگر اس کو حقیقت بینی کی روشنی میں قبول کیا جائے تو انسان کی زندگی کے مفادات محفوظ رہیں گے اور ان کے اختلافات دور ہو جائیں گے۔

اسلام کا طریقہ کار اور اس کی بنیاد

اسلام نے اپنی پہلی توجہ انسان کی حقیقت پسندی کے نبج پر مرکوز ہے، کیونکہ یہ مقدس نبج انسان کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور ایسے بے زبان حیوان نہیں پالنا چاہتا کہ جس کا مقصد پیٹ بھرنا اور جنسی خواہشات کو پورا کرنا ہو۔ انسان ایک ایسی زندہ مخلوق ہے، جو جذبات اور ہمدردیوں کے علاوہ عقل اور حقیقت پسندی کی توانائی سے بھی مسلح ہے۔ انسان اپنی فطرت یعنی اپنی خالص حقیقت پسندانہ فطرت کے مطابق درک کرتا ہے کہ وہ عالم ہستی کا ایک جزو ہے اور عالم ہستی کے دیگر اجزاء کے مانند ماورائے طبیعت یعنی ایک لائقا ہی

زندگی، قدرت اور علم سے وابستہ ہے، عقل بھی اسی (خدا) کی مخلوق ہے۔ اسی لئے اسلام نے اپنی روش کو ”توحید“ کی بنیاد پر ستوار کیا ہے اور جو شخص خدا پرست نہ ہو وہ اسے انسان نہیں جانتا۔ یہاں پر ”توحید“ سے مراد خدا کی یکتائی پر عقیدہ رکھنا ہے جو اپنے دین کے ذریعہ انسان کو سعادت کی دعوت دیتا ہے اور ایک دن اسکے اعمال کا حساب لیکر اسے مناسب جزا دے گا۔ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے: ”یہ سب (یعنی توحید سے بے خبر لوگ) جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ گمراہ ہیں“۔ وحید کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق وہ اسلام کی پہلی اصل اور اس کا بنیادی ستون ہے۔

اسلام کا دوسرا ستون ”پسندیدہ اخلاق“ ہے جو توحید پر استوار ہے، کیونکہ اگر انسان توحید کے مطابق اخلاق نہ رکھتا ہو، تو اس کا مقدس ایمان محفوظ نہیں رہے گا۔ اور اسی طرح جیسا کہ بیان کیا گیا، قوانین اور ضوابط خواہ کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں، ہرگز ایک ایسے معاشرے کو نہیں چلا سکتے جس میں اخلاقی انحطاط پایا جاتا ہو۔

اس لحاظ سے، اسلام میں عقیدہ توحید کے مطابق اخلاقیات کا ایک طویل سلسلہ جیسے: انسان دوستی، رحم دلی، غنیمت اور عدالت کے جیسے دوسرے امور انسانی معاشرے کے لئے مرتب کئے گئے ہیں جو توحید کے عقیدہ کے نفاذ کے ضامن اور قوانین و ضوابط کے محافظ ہیں۔ معاشرے کی سعادت میں مفید و مؤثر ہونے کی وجہ سے اخلاق کا دوسرا درجہ ہے، چوں کہ توحید پہلے درجہ پر ہے۔

توحید اور اخلاق کے اصولوں کو مستحکم اور استوار کرنے کے بعد اسلام نے قوانین کا ایک طویل سلسلہ وضع کیا ہے، جن کا تعلق اخلاق سے رابطہ ہے یعنی مذکورہ قوانین کا سرچشمہ پسندیدہ اخلاق ہے اور پسندیدہ اخلاق بھی اپنے قوانین کے ذریعہ مستحکم ہوتا ہے۔ اور یہی قوانین و ضوابط ہیں جو معاشرے کے حیات بخش مفاد کا تحفظ کرتے ہیں اور لوگوں کے اختلافات کو دور کرتے ہیں۔

ماجی اختلافات

انسان کے اختلافات جو اتحاد و اتفاق کے رشتہ کو تو دیتے ہیں اور اجتماعی نظام کو درہم برہم کر دیتے ہیں، دو قسم کے ہیں: ۱۔ وہ اختلافات جو اتفاقی طور پر دو افراد کی ذاتی چپقلش کے نتیجے میں رونما ہوتے ہیں، جیسے دو افراد کے درمیان کسی موضوع پر ہونے والا جھگڑا اور ایسے اختلافات کو عدلیہ رفع کرتی ہے۔

۲۔ وہ اختلافات جو طبعی طور پر معاشرے کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، اور اجتماعی انصاف کی طرف کسی قسم کی توجہ کئے بغیر ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر مسلط کیا جاتا ہے اور کمزور طبقہ کی سعی و کوشش کے حاصل کو طاقتور گروہ کے نام مخصوص کیا جاتا ہے، جیسے: حاکم و محکوم، دولت مند و فقیر، عورت و مرد اور ملازم و افسر کے طبقے ترقی یافتہ اور بے دین معاشروں میں اسی صورت میں زندگی کرتے ہیں اور ہمیشہ طاقتور لوگ کمزوروں اور اپنے ماتحتوں کا استحصال کرتے ہیں۔

منافع کی حفاظت اور رفع اختلافات کے بارے میں اسلام کا عام نظریہ اسلام مکی طور پر معاشرے کی سعادت، جو کہ لوگوں کے مفاد کی حفاظت اور ان کے اختلافات کے سد باب کی مرہون منت ہے، کو دو چیزوں کے ذریعہ فراہم کرتا ہے: ۱۔ طبقاتی امتیاز کو مکی طور پر لغو کر کے اس کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے، اس معنی میں کہ اسلامی معاشرے میں لوگ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ دولت یا اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر دوسروں پر برتری جتائے اور انھیں حقیر و خوار سمجھے اور ان سے فروتنی اختیار کرنے اور تسلیم ہونے کا تقاضا کرے، یا اپنے مخصوص عہدہ کی بنا پر خود کو بعض اجتماعی ذمہ داریوں سے مشغی قرار دے یا کسی جرم کے مرتکب ہونے پر خود کو معاف اور سزا سے بری سمجھے۔ قوانین و ضوابط کے نفاذ میں معاشرے کے سرپرست کا حکم نافذ ہے اور سب کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہئے اور اس کا احترام کرنا چاہئے، لیکن اس کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد میں یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ دوسرے لوگ اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں یا جو کچھ وہ انجام دے اس کے بارے میں انھیں اعتراض و تنقید کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وہ معاشرے کا فرمانروا ہے، اس لئے اسے بعض عام اور ماجی ذمہ داریوں اور فرائض

سے مشنی قرار دیا جائے۔ اسی طرح ایک دولت مند شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی دولت کو اپنے لئے فخر و مباہات کا سبب قرار دیکر غریبوں، محتاجوں اور اپنے ماتحتوں کی سرکوبی کرے۔ اس کے علاوہ معاشرے کے فرمانرواؤں کو یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ لوگ ان کی اطاعت کرتے ہوئے ان کی ہر فضول بات کو معاشرہ کے پسماندہ اور ناداروں کے مسلم حق کے مقابلہ میں فوقیت دیں۔ نیز اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ کسی بھی طبقہ میں ایک طاقتور لوگ ناحق کمزوروں پر مطلق حکمرانی کریں۔

خدا نے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے: ”اسلام کے پیرو آپس میں بھائی اور مساوی ہیں“^۱۔ نیز فرماتا ہے: ”خدا کا دین تمہاری (اہل کتاب اور مسلمان) آرزوں اور خواہشوں کا تابع نہیں ہے، جو بھی برا کام انجام دے گا، اسے سزا ملے گی“^۲۔

البتہ دین اسلام میں کچھ خصوصیات، جیسے: دین کے پیشواؤں کی اطاعت اور والدین کا احترام، ہیں کہ اس میں مساوات نہیں ہے بلکہ صرف ایک طبقہ کے لئے دوسرے طبقہ کی نسبت کچھ فرائض ہیں، لیکن اس سلسلہ میں بھی جس کے حق میں یہ حکم ہے، وہ دوسروں پر برتری نہیں جتلا سکتا، یعنی وہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے مقام پر فخر نہیں کر سکتا ہے۔ جی ہاں، چونکہ انسان فطری طور پر امتیاز و فضیلت طلبی کی جبلت رکھتا ہے، اسلام نے اس کی اس فطری جبلت کو سرکوب کئے بغیر اس کے لئے ایک عمل معین فرمایا ہے اور وہ ”تقویٰ“ ہے۔ اسلام میں حقیقی قدر و قیمت پر ہیزگاری کے لئے ہے اور چونکہ تقویٰ کا حساب چکانے والا خدا نے متعال ہے، اس لئے یہ امتیاز جس قدر زیادہ ہو جائے، کوئی رکاوٹ ایجاد نہیں کرتا، اس کے برعکس طبقاتی امتیاز معاشرے میں فساد پھیلانے کا سب سے بڑا سبب اور افراد کے آپس میں ایک دوسرے کے لئے رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔ اسلام کی نظر میں، ایک پر ہیزگار فقیر، بے تقویٰ سرمایہ داروں کے ایک گروہ پر فضیلت رکھتا ہے اور ایک پر ہیزگار عورت سیکڑوں لالہ بالی مردوں سے بہتر ہے۔ خدا نے متعال فرماتا ہے: ”انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پر ہیزگار ہے

^۱ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ...) (حجرات / ۱۰)۔

^۲ (لَيْسَ بَالَمَا نِيَكُمْ وَلَا اِمَانِي اِہْلَ الْکِتَابِ مَن یَعْمَلْ سُوْءً اِیْجِزْ بِہِ) (نساء / ۱۲۲)۔

۱۔ ”نیز فرماتا ہے: ”میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، سب ایک نوع سے ہیں اور انسان ہیں۔“ ۲

۲۔ چونکہ تمام افراد، انسانیت اور معاشرے کے رکن ہونے کے لحاظ سے شریک ہیں اور تمام لوگوں کا کام اور ان کی کوشش محترم ہے، لہذا کچھ قوانین بنائے گئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ہر فرد کے مفادات کا تعین ہو سکے اور اجتماعی تجاوز اور کشمکش کا راستہ خود بخود بند ہو جائے۔ ابتدائی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ قوانین کچھ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ معاشرے کے مختلف طبقاتی فاصلے بالکل ختم ہو جائیں، دوریوں کو نزدیکیوں میں بدل دیا جائے۔ ان بیانات کی روشنی میں مفادات کے تحفظ اور معاشرے کے اختلافات کو دور کرنے کے سلسلہ میں اسلام کا خاص طریقہ اجمالی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

عداوت و اختلاف سے اسلام کا مقابلہ

معاشرے کے مختلف طبقات میں طبعی طور پر پیدا ہونے والے اختلافات جیسے رعایا اور حاکم کا طبقہ، غلام و مالک اور کام لینے والے و مزدور کے درمیان اختلافات دو طریقوں سے وجود میں آتے ہیں: ۱۔ ایک شخص کا دوسرے شخص کے حقوق پر تجاوز کرنے سے؛ مثلاً کام لینے والا، مزدور کی مزدوری ادا نہ کرے، ایک مالک اپنے نوکر کی پوری اجرت نہ دے اس کے حق میں ظلم اور نا انصافی کرے یا حاکم اپنی رعایا میں سے کسی کے حق میں ظالمانہ حکم جاری کرے۔ اسلام نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے بہت سے قوانین مقرر کئے ہیں کہ ان کو نافذ کرنے سے ہر ایک کے حقوق محفوظ رہ سکتے ہیں اور ہر شخص اپنے کھوئے ہوئے حقوق کو پاسکتا ہے۔ اسلام نے اس کام کے لئے معاشرے کی ہر فرد کو اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ ظلم کرے (چاہے وہ حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو) تو قاضی کے پاس شکایت کرنی چاہئے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے زمانہ میں ایک مسلمان کا حضرت کے ساتھ کچھ اختلاف ہو گیا، اس نے قاضی کے پاس جا کر استغاثہ کیا۔ حضرت ایک عام شخص کی طرح اس

۱ (يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ) (حجرات ۱۳)۔

۲ (إِنِّي لَا أَضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ) (ال عمران ۱۹۵)۔

قاضی (جسے خود آپ نے منصوب فرمایا تھا) کے پاس حاضر ہوئے اور فیصلہ ہوا۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ حضرت نے قاضی سے فرمایا کہ شکایت کرنے والے اور میرے درمیان برتاؤ میں کسی قسم کا فرق نہ کرے۔

۲۔ ایک طاقتور شخص کا کمزور اور اپنے ماتحت کے اوپر دھونس جانا اور اس کے ساتھ زیادتی کرنا، جیسے ایک کام لینے والا اپنے مزدوروں کو ذلیل و خوار سمجھے، کوئی مالک اپنے سامنے کھڑا رکھے، اور اسے اپنے سامنے جھک کر تعظیم کرنے پر مجبور کرے یا حاکم اپنی رعایا سے اعتراض اور استغاثہ کا حق چھین لے، کیونکہ اس قسم کے برتاؤ میں غیر خدا کی پرستش کا پہلو پایا جاتا ہے، اس لئے اسلام نے ان چیزوں سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ اسلام میں کوئی بھی شخص اپنے ماتحت سے انجام فریضہ کے علاوہ کسی قسم کی توقع نہیں رکھ سکتا ہے اور ان پر اپنی بزرگی و عظمت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا ہے۔ اسلام میں بہت سے ایسے اخلاقی احکام موجود ہیں جو لوگوں کو سچائی، انصاف اور حسن اخلاق کی دعوت دیتے ہیں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں، نیکی اور خدمت کرنے والوں کی تشویق کرتے ہیں اور بد کرداروں، نا اہلوں اور برے لوگوں کو سزا دیتے ہیں۔

یہ ایسے پسندیدہ اخلاق ہیں کہ اگر معاشرے میں یہ نہ ہوں تو معاشرہ بد بختی سے دوچار ہو جائے گا اور دنیا و آخرت میں ناکامی و بد بختی میں مبتلا ہوگا۔ ممکن ہے کہ کسی کو ان قوانین سے بے اعتنائی اور ان پر عمل نہ کرنا اس کے لئے بظاہر معمولی فائدہ ہو، لیکن دوسری طرف یہ ایک ناپاک اور خطرناک ماحول کو پیدا کرتا ہے کہ جو اس کو اس معمولی فائدہ سے محروم کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سے فائدوں سے اس کو محروم کرتا ہے اور اس شخص کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو ایک عمارت کے سنگ بنیاد کو باہر نکال کر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر کرتا ہے اور اس طرح اس عمارت کی ویرانی کا سبب بنتا ہے۔

رفع اختلاف کے لئے ایک عام وسیلہ

اسلام نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ معاشرے کے فائدے کے بارے میں سوچیں اور خود خواہی سے پرہیز کر کے اپنے

ذاتی مفاد کو اسلامی معاشرے کے فائدہ میں دیکھیں اور معاشرے کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھیں۔ ایک مسلمان کو پہلے حقیقی مسلمان ہونا چاہئے، اس کے بعد وہ ایک تاجر، کسان، صنعت گریا مزدور بنے اور جو شخص خاندان کو تشکیل دینا چاہتا ہے، اسے پہلے مسلمان ہونا چاہئے اس کے بعد اپنے فیصلہ پر عمل کرے۔ مختصر یہ کہ وہ جو بھی کام انجام دینا چاہے اور جو بھی مقام اور عمدہ سنبھالنا چاہے، اس کے لئے صحیح دین و ایمان کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص ہر کام اور ہر فیصلہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسلام و مسلمین کی مصلحتوں اور فائدوں کو مد نظر رکھتا ہے، اس کے بعد اپنی ذاتی مصلحت کو مد نظر رکھتا ہے اور وہ ہرگز کوئی ایسا کام انجام نہیں دیتا جس میں اسلام و مسلمین کے لئے نقصان ہو اگرچہ اس کام میں اس کا ذاتی فائدہ بھی نہ ہو۔

البتہ معلوم ہے اگر کسی معاشرے میں اس قسم کی فکر پیدا ہو جائے تو اس معاشرے کے افراد میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (واعصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا) ^۱ ”اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کرو“، نیز فرماتا ہے: (وان ہذا صراطی مستقیماً فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ) ^۲ ”اور یہ ہمارا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ جاؤ کہ راہ خدا سے الگ ہو جاؤ گے۔“

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی ہونا چاہئے تاکہ ان کے مقابلہ میں ایک طاقت کی صورت یآئیں۔“ ^۳

مازہ روزہ اور حج یا رفع اختلافات کا وسیلہ

اسلام کے فخر و مباہات میں سے ایک مسئلہ ”عبادت“ ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے ادیان کے لوگ جیسے یہود و نصاریٰ اپنے دینی احکام کے مطابق عمومی عبادت خانوں کے علاوہ عبادت سے محروم ہیں اور ان کے مذہبی قانون کی نظر میں وہ کلیسا اور اپنے

^۱ آل عمران ۱۰۳

^۲ انعام ۱۵۳

^۳ والمسلمون تتکافأ دماؤہم وبہم ید علی من سواہم... (اصول کافی، ج ۱، ص ۴۰۳)۔

عبادت خانوں کے علاوہ کہیں عبادت انجام نہیں دے سکتے اور نماز نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن اسلام میں ان پابندیوں کو ختم کر دیا گیا ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنی عبادت کو جہاں چاہے انجام دے، مسجد میں ہو یا کہیں اور، مسلمان معاشرے میں ہو یا کفر کے معاشرے میں، لوگوں کے درمیان ہو یا تنہا، صحت مندی کی حالت میں ہو یا بیماری کی حالت میں۔

بہر حال اپنی عبادت کو انجام دینا چاہئے، اور یہ بذات خود اسلام کی کامیابی کے اسرار میں سے ایک ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ”میرے لئے تمام روئے زمین عبادت خانہ اور پرستش گاہ ہے۔“ اسی لئے شریعت اسلام نے نماز، روزہ اور حج کو پہلے مرحلہ میں انفرادی قرار دیا ہے، اس معنی میں کہ ہر فرد سے اس کی انجام دہی کا مطالبہ کیا ہے اور جماعت میں شریک ہونے کو لازم نہیں کیا ہے۔ لیکن دوسرے مرحلہ میں ان عبادتوں کے اجتماعی فوائد کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور انہیں اجتماعی اہمیت دی ہے مثلاً انسان اس کے ذریعہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اپنی بندگی و نیاز مندی کا اظہار کرتا ہے لہذا جماعت میں حاضر ہونا مستحب قرار دیا ہے۔ اسی طرح روزہ جو انفرادی ریاضت کے لئے قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو سال میں ایک مہینہ دن کے میں کھانے پینے اور جنسی آمیزش سے پرہیز کرنا چاہئے اور اس کے ذریعہ اپنے اندر پرہیزگاری اور تقویٰ پیدا کرے، اس کے باوجود اس کے کہ یہ ایک انفرادی فریضہ ہے اور اس میں اجتماعی پہلو نہیں پایا جاتا، لیکن شوال کی پہلی تاریخ کو ماہ مبارک رمضان میں فریضہ کے انجام کے شکرانہ میں مسلمان عید منائیں اور ان پر فرض ہے کہ نماز عید فطر کو باجماعت پڑھیں۔

اسی طرح حج میں جس کے ذریعہ خدا کی دعوت پر لبیک اور مادی میلانات سے دوری اور پروردگار کی ذات کی طرف توجہ کرنا ہوتا ہے باوجودیکہ یہ ایک انفرادی عبادت ہے، لیکن چونکہ عبادت کی ایک خاص و معین جگہ ہے، لہذا دنیا کے مسلمان مجبوراً ایک جگہ پر جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو۔ جس دن حج کے بعض اعمال انجام دیئے جاتے ہیں۔ اسلامی عید قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ ایک جگہ جمع ہو کر نماز عید پڑھیں۔ اسلام

میں جو یہ اجتماعات مقرر ہوئے ہیں یہ لوگوں کے طبقاتی اختلافات کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہے، کیونکہ طبقاتی اختلافات کو بڑے اکھاڑ کر پھینک دینے کے لئے موثر ترین طریقہ ایک دوسرے کے درمیان موجود غلط فہمی کو دور کرنا ہے اور یہ خاصیت اجتماعی عبادت میں مکمل طور پر موجود ہے کیونکہ جو خدا کی عبادت کو اخلاص کے ساتھ انجام دیتا ہے، اس کا خدا کے سوا کسی اور کے ساتھ سروکار نہیں ہوتا ہے اور خدا کی رحمتوں کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں اور اس کی ابدی نعمتوں کا خزانہ کبھی ختم ہونیوالا نہیں ہے اور اس کی ذات اقدس رکاوٹ کے بغیر ہر ایک کو قبول کرتی ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی عبادت کے دوران جو انس، اور الفت و محبت لوگوں میں پیدا ہوتی ہے وہ اختلافات اور کدورتوں کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ چنانچہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ دین مقدس اسلام کے معارف کلی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہوئے ہیں: ”اصول دین، اخلاق اور فقہی فروع۔“ واضح ہے کہ اس کے علاوہ اصول دین یعنی دین کی بنیاد، تین اصولوں پر مشتمل ہے کہ انسان ان میں سے ایک کے نہ ہونے پر دین سے خارج ہو جاتا ہے: ۱۔ توحید یعنی کائنات کے پروردگار کی یکتائی کا اعتقاد۔

۲۔ خدائے متعال کے انبیاء علیہم السلام پر عقیدہ رکھنا ہے جن کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

۳۔ معاد پر ایمان یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ خدائے متعال موت کے بعد سب کو زندہ کرے گا اور ان کے اعمال کا حساب و کتاب لیا جائے گا، نیک لوگوں کو ان کی نیکی کی جزا دی جائے گی اور برے لوگوں کو ان کی برائی کی سزا دی جائے گی۔ مذکورہ تین اصولوں میں دو اصولوں کا اور اضافہ کیا جاتا ہے، جو شیعہ عقائد کا حصہ اور مسلمات میں سے ہیں، اور انسان ان میں سے کسی ایک پر عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے شیعہ مذہب سے خارج ہو جاتا ہے، اگرچہ اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا یہ دو اصول حسب ذیل ہیں: ۱۔ عدل

۲۔ امامت

عقائد

۱۔ توحید

۲۔ نبوت

۳۔ معاد

۴۔ عدل

۵۔ امامت

۱۔ توحید

اثبات صلح

انسان جب حقیقت بینی کی فطرت سے کام لیتا ہے تو عالم حتیٰ کے ہر گوشہ و کنار پر نظر ڈالنے سے اسے پروردگار عالم اور خالق کائنات کے وجود کی بہت سی دلیلیں نظر آتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی حقیقت پسندانہ فطرت سے محسوس کرتا ہے کہ مخلوقات میں سے ہر ایک وجود کی نعمت سے مالا مال ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے وجود میں، قمری طور پر ایک معین راستہ کو طے کر رہا ہے اور ایک مدت کے بعد وہ اپنی جگہ کو دوسرے کے لئے چھوڑتا ہے، اس نے ہرگز اپنے اس وجود کو خود ہی اپنے لئے فراہم نہیں کیا ہے اور جس منظم راہ پر گامزن ہے، اسے خود ہی اپنے لئے نہیں بنایا ہے اور اپنے سفر کے راستہ کی ایجاد اور اس کے نظم و نسق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں رکھتا، کیونکہ انسان نے، انسانیت اور انسانی خصوصیات کو اپنے لئے خود اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور انسانی خصوصیات اسے عطا کی گئی ہیں۔

اسی طرح حقیقت پسندانہ انسانی فطرت اس بات کو قبول نہیں کرتی ہے کہ یہ سب اشیاء خود بخود وجود میں آئی ہوں گی اور کائنات میں موجود نظام یوں ہی کسی حساب و کتاب کے بغیر وجود میں آگئے ہوں گے، جبکہ انسان کا ضمیر اس قسم کے اتفاق کو منظم طور پر ایک دوسرے کے اوپر چنی گئی چند ایٹموں کے بارے میں قبول نہیں کرتا۔ یہاں پر انسان کی حقیقت پسندانہ فطرت اعلان کرتی ہے کہ عالم ہستی کی ضرورت کوئی پناہ گاہ ہے، جو ہستی کا سرچشمہ، اور کائنات کو پیدا کرنے اور اسے باقی رکھنے کے لئے اس کی حفاظت کرنے والا

ہے، اور وہ لامحدود وجود اور علم و قدرت کا سرچشمہ، خدائے متعال کی ذات ہے، اور اس کائنات کے وجود کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ہدیٰ) ”(خالق کائنات) وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے۔“ اسی فطرت کی وجہ سے، جہاں تک تاریخ بتاتی ہے، انسانی معاشرہ کی اکثریت، کائنات کیلئے ایک خدا کے قائل رہے ہیں اور اسلام کے علاوہ دوسرے تمام ادیان جیسے نصرانیت، یہودیت، مجوسیت اور بدھ مت اس سلسلہ میں ہم عقیدہ ہیں اور جو پروردگار کے وجود کے مخالف ہیں، ان کے پاس اسکے وجود کے انکار کے سلسلہ میں ہرگز کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ کہتے ہیں کہ: ہم پروردگار کے وجود کی کوئی دلیل نہیں رکھتے یہ نہیں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے عدم وجود کی کوئی دلیل ہے۔

مادہ پرست انسان کہتا ہے: ”میں نہیں جانتا“، یہ نہیں کہتا ہے ”نہیں ہے“، دوسرے الفاظ میں مادہ پرست انسان مذہب ہے نہ منکر۔ خدائے متعال اپنے کلام میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وقالوا ما ہی الا حیاتنا الدنیا نموت و نختا وما یملکنا الا الدھر وما لہم بذلک من علم ان ہم الا یظنون^۱) ”اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اس میں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان کے خیالات ہیں اور بس۔“

ابتدائے خلقت کی بحث

انسان اپنی خداداد فطرت سے ہر منظر و حادثہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس کے وجود میں آنے کی علت تلاش کرتا ہے اور ہرگز احتمال نہیں دیتا ہے کہ کوئی چیز خود بخود اور کسی سبب کے بغیر وجود میں آئی ہوگی۔ اگر کسی ڈرائیور کی گاڑی خراب ہو جاتی ہے تو وہ گاڑی سے اتر کر گاڑی میں اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں خراب ہونے کا احتمال ہوتا ہے تاکہ گاڑی کے رکنے کا سبب معلوم کر سکے اور اسے ہرگز یقین نہیں ہوتا ہے کہ گاڑی خرابی کے بغیر رک گئی، اور گاڑی کو پھر چلانے کے لئے اس کے تمام وسائل سے استفادہ

کرتا ہے اور ہرگز اس اتفاق کا منظر نہیں رہتا ہے کہ گاڑی خود بخود چلے گی۔ انسان کو اگر بھوک لگ جائے تو وہ روٹی کی فکر میں پڑتا ہے اور جب اسے پیاس لگتی ہے تو پانی تلاش کرتا ہے اور اگر سردی محسوس کرتا ہے تو لباس اور آگ ڈھونڈتا ہے۔ وہ کبھی کسی اتفاق کے ذریعہ ان ضرورتوں کو دور کرنے کا انتظار نہیں کرتا اور اس خوش فہمی میں آرام سے نہیں بیٹھتا۔ جو شخص کسی عارت کو تعمیر کرنا چاہتا ہے وہ لامحالہ اس کے ساز و سامان، معمار اور مزدور وغیرہ کا انتظام کرتا ہے اور وہ بالکل یہ امید نہیں رکھتا کہ اس کی آرزو خود بخود پوری ہو جائے۔ انسان جب سے ہے اسی وقت زمین پر پہاڑ، جنگل، وسیع دریا اور سمندر موجود ہیں۔

اور اس وقت سے سورج، چاند اور بھٹکنے ہوئے ستاروں کو آسمان پر منظم اور مسلسل متحرک دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود دنیا کے سائنسدان اپنی اتھک علمی کوشش اور تگ دو سے مخلوقات اور حیرت انگیز مظاہر کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور وہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ جب سے ہم میں اسی وقت سے ان کو اسی طرح دیکھ رہے ہیں، لہذا یہ خود بخود پیدا ہوئے ہیں۔ اسی جستجو کی فطرت اور اسباب و علل کی بحث و تحقیق نے انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ عالم ہستی اور اس کے حیرت انگیز نظام کی پیدائش کے بارے میں کھوج کرے کہ کیا یہ وسیع کائنات جس کے اجزاء ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور حقیقت میں ایک عظیم منظر ہے، خود بخود وجود میں آیا ہے یا اس کا سرچشمہ کہیں اور ہے؟ اور کیا یہ حیرت انگیز نظام، جو ثابت اور بلا استثناء قوانین کے مطابق کائنات کے گوشہ و کنار میں جاری ہے اور ہر چیز کو اس کے خاص مقصد کی طرف راہنمائی کرتا ہے، ایک بے انتہا قدرت اور علم کی طرف سے جاری اور اس کا نظام چلایا جاتا ہے یا کسی حادثہ اور اتفاق کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے؟

معرفت خدا اور ملتیں

ہم جانتے ہیں کہ عہد حاضر میں روئے زمین پر دین داروں کی اکثریت ہے، اور وہ خالق کائنات پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ کل کے انسان کی حالت بھی آج کے انسان کی سی تھی، جہاں تک تاریخ بتاتی ہے، وہ یہ کہ انسانوں کی اکثریت دین دار تھی اور وہ کائنات کے لئے ایک خدا کے قائل تھے۔ اگرچہ خدا شناس اور دین دار معاشروں میں، فکری اختلاف بھی تھا اور ہر قوم

چشمہ تخلیق کو مخصوص اوصاف سے متصف کرتی تھی، لیکن اصل مقصد میں وہ اتفاق نظر رکھتے تھے، حتیٰ قدیم ترین تمدن کے آثار جنہیں انسان نے کشف کیا ہے، ان میں دین اور خدا شناسی کی علامتیں پائی جاتی ہیں اور ایسی علامتیں بھی ملی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماورائے طبیعت پر بھی اعتقاد و ایمان رکھتے تھے۔

حتیٰ جدید براعظموں جیسے امریکہ اور آسٹریلیا اور قدیمی براعظموں کے دور دراز جزائر جو آخری صدیوں میں کشف ہوئے ہیں، ان کے اصل باشندے بھی خدا کے معتقد تھے اور وہ تصور کائنات کے سلسلہ میں اختلافات نظر کے باوجود کائنات کا ایک سرچشمہ تسلیم کرتے تھے اگرچہ قدیم دنیا سے ان کے رابطہ کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔

اس بات پر غور کرنا کہ خدا کا اعتقاد انسانوں کے درمیان ہمیشہ سے موجود تھا، اس مطلب کو واضح کرتا ہے کہ خدا کو پہچاننا انسان کی فطرت ہے اور انسان اپنی خداداد فطرت سے، کائنات کی تخلیق کے لئے ایک خدا کو ثابت کرتا ہے۔ خدائے متعال نے انسان کی اس فطری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: (وَلَمَّا سَأَلْتُم مِّنْ خَلْقِهِمْ لِيَقُولنَّ اَللّٰهُ) ”اگر ان سے پوچھ لو گے کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً کہیں گے خدائے“ نیز فرماتا ہے: (وَلَمَّا سَأَلْتُم مِّنْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لِيَقُولنَّ اَللّٰهُ) ”اگر ان سے پوچھ لو گے کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً کہیں گے: خدا“

انسان کی زندگی میں تجسس کا اثر

اگر انسان نے خالق کائنات اور اس کے نظام کے پیدا کرنے والے۔ جو کہ اس کی فطرت کا اقتضاء ہے۔ کے بارے میں مثبت جواب دیا، تو اس نے کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظام کی پیدائش کے لافانی مبداء کو ثابت کیا اور اس نے تمام چیزوں کو خدا کے محکم ارادہ سے جو اسکی لامحدود قدرت و علم پر مبنی ہے۔ اور نتیجہ میں وہ پورے وجود میں ایک قسم کے اطمینان و اعتماد کو محسوس

کرتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی میں رونا ہونے والی ہر قسم کی مشکلات اور سختیوں سے دوچار ہونے پر ہرگز ناامید نہیں ہوتا ہے بلکہ ان سے نپٹنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر سے کام لیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی علت و سبب۔ خواہ وہ کتنا قوی ہو۔ اس کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز اس کے زیر فرمان ہے۔ ایسا شخص کبھی اسباب و علل کے سامنے سراپا تسلیم نہیں ہوتا اور جب کبھی دنیا کے حالات اس کے مطابق ہوتے ہیں تو غرور و تکبر سے اس کا دماغ خراب نہیں ہوتا اور وہ اپنی اور کائنات کی حقیقی حیثیت کو فراموش نہیں کرتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ظاہری اسباب و علل خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق حکم خدا سے ہے۔

آخر کار ایسا انسان یہ جان لیتا ہے کہ عالم ہستی میں خدائے متعال کے علاوہ کسی اور کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہئے اور خدا کے فرمان کے علاوہ کسی بھی فرمان کے سامنے مطلق طور پر تسلیم نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن جس نے مذکورہ سوالات کا منفی جواب دیا، وہ اس امید اور حقیقت پسندی عالی نشی اور فطری شجاعت کا حامل نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن ملتوں میں مادیت کا غلبہ ہے وہاں روز بروز خود کشی کے واقعات زیادہ رونا ہوتے ہیں، اور جن کا اعتقاد حسی اسباب و علل تک محدود ہو وہ چھوٹے سے چھوٹے نامناسب حالات کے رونا ہونے پر اپنی سعادت و کامیابی سے ناامید ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں، لیکن جو لوگ خدا شناسی کی نعمت سے مالا مال ہیں، وہ موت کے دہانے پر بھی ناامید نہیں ہوتے، کیونکہ وہ خدائے قادر و مینا پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے مطمئن و امیدوار ہوتے ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جبکہ چاروں طرف سے دشمن کے تیر و تلوار کا نشانہ بنے ہوئے تھے، فرماتے ہیں ”بتھا جو چیز اس ناگوار مصیبت کو میرے لئے آسان بنا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ میں خدائے متعال کو مستقل اپنے اعمال پر ناظر دیکھتا ہوں۔“

توحید کے بارے میں قرآن مجید کا اسلوب

اگر انسان پاک طبیعت اور مطمئن دل سے کائنات پر نظر ڈالے تو اس کے ہر گوشہ و کنار میں وجود خدا کے آثار و دلائل کا مشاہدہ کرے گا اور اس حقیقت کے ثبوت میں ہر در و دیوار سے گواہی سن لے گا۔ اس دنیا میں جو چیز بھی انسان کے سامنے آتی ہے وہ خدا کی پیدا کی ہوئی اور منظر ہے یا کوئی خاصیت خدا نے اس میں پیدا کر دی ہے یا ایک ایسا نظام ہے جو خدا کے حکم سے ہر چیز میں جاری ہے اور انسان بھی انہی میں سے ایک ہے اور اس کا پورا وجود اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے، کیونکہ نہ اس کا اپنا وجود اپنے آپ سے ہے اور نہ ہی اس سے ظاہر ہونے والی خاصیتیں اس کے اختیار میں ہیں اور نہ اس نے اپنی زندگی کی اس نظام کو خود بنایا ہے جو اس کی پیدائش سے ابھی تک جاری ہے اور وہ یہ فرض کر سکتا ہے کہ اس کائنات کا نظام اتفاقی طور پر وجود میں آیا ہے، اور نہ ہی وہ اپنے وجود اور اپنے وجود کے نظام کو اس ماحول کی طرف نسبت دے سکتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے، کیونکہ مذکورہ وجود اور یہ نظام خود اس ماحول کی پیداوار نہیں ہے اور نہ وہ اتفاقاً وجود میں آیا ہے۔ یہاں پر انسان کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عالم حتیٰ کے لئے ایک سرچشمہ تسلیم کرے جو اشیا کو خلق کرنے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے۔

وہی ہر مخلوق کو پیدا کرتا ہے اور اس کے بعد بقا اور ایک خاص نظام کی شاہراہ پر اس کے مخصوص کمال کی طرف ہدایت کرتا ہے چونکہ انسان عالم حتیٰ میں اشیا کو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط اور ایک خاص نظام سے منسلک پاتا ہے، اس لئے مجبوراً فیصلہ کرتا ہے کہ خلقت کا سرچشمہ اور اس کے نظام کو چلانے والا ایک ہی ہے۔ انسان پر یہ حقیقت معمولی توجہ سے واضح ہو جاتی ہے، اور اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں پایا جاتا۔ سوائے اس کے کہ انسان کبھی زندگی کی کٹکٹوں میں ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ اپنی عقل و شعور کی تمام توانائیوں کو حیاتی مبارزوں کی راہ میں استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام وقت کو زندگی کی دوڑ و دوپ میں صرف کرتا ہے، اور اس قسم کی چیزوں کے بارے میں غور کرنے کی تھوڑی سی بھی فرصت نہیں نکال پاتا اور نتیجہ میں اس حقیقت سے غافل رہتا ہے، یا یہ کہ طبیعت کے دل فریب مظاہر سے متاثر ہو کر ہوس رانیوں اور عیاشیوں میں سرگرم ہوتا ہے۔

چونکہ ان حقائق کی پابندی انسان کو بہت سی مادی لالابیوں سے روکتی ہے، اس لئے وہ فطری طور پر ان حقائق کی تحقیق کے سلسلہ میں پہلو تہی کرتا ہے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن مجید میں مخلوقات کی پیدائش اور ان میں جاری نظام کے بارے میں گونا گون طریقوں سے بہت زیادہ توجہ دلائے گئی ہے اور برہان و دلائل پیش کئے گئے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ خاص کر وہ لوگ جو فطرت کے دل فریب مظاہر کے شیفہ ہو چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی کی سعادت و کامیابی کو عیاشیوں و خوش گزرائیوں میں پاتے ہیں، اور مادیات و محوسات سے انس و محبت کی وجہ سے فلسفی فکر اور نظریات کی عقلی تحقیق سے محروم ہیں۔ لیکن انسان ہر حالت میں عالم حسی کا ایک جزو ہے اور کائنات کے دیگر اجزاء اور اس میں جاری جزئی اور مکی نظاموں سے ایک لمحہ بھی بے نیاز نہیں ہے، اور ہر لمحہ اپنے ذہن کو عالم حسی اور اس میں جاری نظام کی طرف متوجہ کر سکتا ہے، اور کائنات کے خالق کے وجود کو پاسکتا ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (ان فی السموات والارض لآیت للمؤمنین، و فی خلقتکم و ما یبٹ من دابۃ آیت لقوم یوقنون و اختلاف الیل و النہار و ما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتہا و تصریف الریح ء آیت لقوم یعقلون) ”یشک آسمانوں اور زمینوں میں صاحبان ایمان کے لئے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اور خود تمہاری خلقت میں بھی اور جن جانوروں کو وہ پھیلاتا رہنا ہے ان میں بھی صاحبان یقین کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور رات دن کی رفت و آمد میں اور جو رزق خدا نے آسمان سے نازل کیا ہے، جس کے ذریعہ سے مردہ زمینوں کو زندہ بنایا ہے اور ہواؤں کے چلنے میں اس قوم کے لئے نشانیاں پائی جاتی ہیں جو عقل رکھنے والی ہے۔“

مثال اور وضاحت

قرآن مجید میثاقیت میں، جن میں انسان کو چاند، ستاروں، زمین، آسمان، سورج، پہاڑوں، دریاؤں، نباتات، حیوانات اور خود انسان کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کا جو حیرت انگیز نظام ہے اس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ حقیقت میں کائنات کا نظام، جو کائنات کی گونا گون سرگرمیوں کو خلقت کے مقاصد اور کائنات کے اہداف کی طرف بڑھاتا ہے، وہ نہایت ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے۔ گیہوں کا ایک دانہ یا بادام کی ایک گٹھلی زمین سے اگنے کے بعد ایک پودے یا میوہ دار درخت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور یہ دانہ یا گٹھلی مٹی میں قرار پانے کے بعد شگافہ ہو کر اس کی سبز نوک باہر نکلتی ہے اور اس میں جاتی ہے، جب یہ پودا اپنے مقصد کی منزل تک پہنچتا ہے تو اس دوران مختلف اور عظیم نظام سرگرم ہوتے ہیں کہ جن کی عظمت و وسعت کا مشاہدہ کر کے عقل متحیر رہ جاتی ہے۔

ستارے، آسمان اور چمکتا ہوا سورج اور درخشان اور زمیں ہر ایک اپنی وضعی و انتہائی گردشوں اور اپنے اندر پوشیدہ توانائیوں سے اور اسی طرح اس دانہ یا گٹھلی میں قرار دی گئی، پر اسرار طاقتیں، اور سال کے موسم، اور ان کے حالات، ابرو ہوا اور بارش، اور شب و روز، گندم کے ایک پودے کے اگنے میں مدد کرتے ہیں، اس نئے پودے کو پرورش کے لئے اپنے گوارہ میں سلاتے ہیں، دایا اور نرسوں کے مانند ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہوئے کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ یہ دانہ اپنی بالیدگی و رشد کے آخری مرحلہ تک پہنچ جائے۔ یہی مثال انسان کے ایک نو مولود بچے کی ہے کہ جس کا نظام پیدائش ایک پودے یا کسی دوسری چیز کی پیدائش سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ یہ خلقت کے منظم و پیچیدہ نظام کے لاکھوں بلکہ کروڑوں سال کی سرگرمیوں کا ماحصل ہے۔ ایک انسان کی روزمرہ کی زندگی کی گردش۔ اپنے وجود سے باہر عالم حسی سے رکھنے والے رابطہ کے علاوہ۔ اپنے وجود کے اندر ایک حیرت انگیز نظام سے نشاط سے مربوط ہے کہ دور اندیش سائنسدانوں کی فکریں صدیوں سے مسلسل ان کے ظاہر کا مشاہدہ کرنے میں سرگرم عمل رہی ہیں اور ہر روز ان اسرار سے پردہ اٹھایا جاتا ہے اور ابھی ابھی ان کی معلومات مہجولات کی نسبت بہت کم ہیں۔

قرآن مجید کی نظر میں خدا شناسی کا طریقہ

جس شیر خوار بچہ نے دودھ پینے کے لئے ماں کا پستان پکڑ رکھا ہے اور دودھ پی رہا ہے حقیقت میں وہ دودھ چاہتا ہے، اس کے علاوہ اگر کسی چیز کو ہاتھ میں اٹھاتا ہے تو اسے کھانے کے لئے اپنے منہ تک لے جاتا ہے، دراصل اس چیز کو اس نے کھانے کے لئے اٹھایا تھا اور جوں ہی احساس کرتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے اور اٹھائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے، تو اسے پھینک دیتا ہے۔ اسی ترتیب سے انسان جس مقصد کے پیچھے دوڑتا ہے، اصل میں وہ حقیقت کو چاہتا ہے، اگر اس کے لئے واضح ہو جائے کہ اس نے غلطی کی ہے اور غلط راہ پر چلا ہے، تو اپنی غلطی اور خطا سے ناراض ہوتا ہے اور غلط مقصد کی راہ کی محنت پر افسوس کرتا ہے اور مختصر یہ کہ انسان ہمیشہ اشتباہ اور خطا سے پرہیز کرتا ہے اور حتی الامکان حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرت اور جبلت کی رو سے حقیقت پسند ہے، یعنی لامحالہ ہمیشہ حقیقت کی جستجو اور حق کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے، اس نے اس فطری عادت کو کسی سے یاد اور کہیں سے نہیں سیکھا ہے۔

انسان اگر کبھی سخت رویہ اختیار کر کے حق کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا ہے، وہ اس لئے ہے کہ وہ خطا و اشتباہ سے دو چار ہوتا ہے اور حق و حقیقت اس کے لئے واضح نہیں ہوتی ہے اگر اس کے لئے حق واضح ہوتا تو غلط راستہ پر نہ چلتا۔ کبھی انسان نفسانی خواہشات کی پیروی میں ایک قسم کی دماغی بیماری سے دو چار ہوتا ہے اور حق کی شیرینی کا مزہ اس کے منہ میں کڑوا بن جاتا ہے، اس وقت حق کو جانتے ہوئے بھی اس کی پیروی نہیں کرتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ حق کی حقانیت اور یہ کہ اسے اس کی پیروی کرنی چاہئے، کا اعتراف کرتا ہے، لیکن اسکی اطاعت کرنے سے سرکشی کرتا ہے۔ چنانچہ بہت سے ایسے اتفاقات بھی ہوتے ہیں کہ انسان مضر اور نقصان دہ چیزوں کا عادی ہو کر، اپنی انسانی فطرت، جو کہ خطرہ اور ضرر سے محفوظ رکھتی ہے، کو پامال کرتا ہے، اور ایک ایسے کام کو انجام دیتا ہے، جس کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ نقصان دہ ہے۔ (جیسے: بگکھٹ، شراب اور نشہ آور چیزوں کے عادی لوگ) قرآن مجید انسان کو حق پسندی اور حق کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس سلسلہ میں زیادہ تاکید کرتا ہے اور

گوناگون بیانات کے ذریعہ انسان سے درخواست کرتا ہے کہ حق پسندی اور حق کی پیروی کی فطرت کو اپنے اندر زندہ رکھے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (فاذا بعد الحق الا الضل^۱) ”اور حق کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ (والعصر ان الانسان لفسى خسر الا الذين آمنوا وعلوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر^۲) ”قسم ہے عصر کی بیشک انسان خسارہ میں ہے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت و نصیحت کی۔“

واضح ہے کہ خداوند عالم کی یہ ساری تاکیدیں اس لئے ہیں کہ اگر انسان اپنی حقیقت پسندی کی فطرت کو زندہ نہ رکھے اور حق و حقیقت کی پیروی کی کوشش نہ کرے تو اپنی سعادت و کامیابی کا پابند نہ ہوگا اور وہ نفسانی خواہشات اور اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے گا کئے گا اور جو چاہے گا کرے گا۔ اور غلط تصورات اور خرافانی افکار میں گرفتار ہوگا اور اس وقت ایک چوپایہ کی طرح اپنی راہ (جو انسانی سرمایہ ہے) سے بھٹک کر، ہوا و ہوس، لالہ ابالی اور اپنی نادانی کی پھینٹ چڑھ جائیگا۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (ارعیّت من اتخذ الله هوه افانت تكلون عليه وكيلا * ام تحب ان اكثرهم يسمعون او يعقلون ان هم الا كالانعام بل هم اضل سبيلا^۳) ”کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا خدا بنا لیا ہے، کیا آپ اس کی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں، کیا آپ کا خیال یہ ہے ان کی اکثریت کچھ سنتی اور سمجھتی ہے؟ ہرگز نہیں یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ کم کردہ راہ میں۔“ البتہ جب انسان کی حقیقت پسندانہ فطرت زندہ ہوتی ہے اور حق کی پیروی کرنے کی عادت اس میں کار فرما رہتی ہے، تو یکے بعد دیگرے اس کے لئے حقائق واضح ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ جس حق و حقیقت کو پالے گا اسے دل سے قبول کرے گا اور سعادت و خوشنہی کی راہ میں روز بروز آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ خداوند متعال تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے کمال کیا ہے؟ ایک گھر کو اس وقت کامل گھر کہہ سکتے ہیں جب ایک گھر انے کی ضروریات زندگی کے تمام چیزیں اس میں موجود ہوں چنانچہ اس میں مہمان خانہ، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ کے لئے کافی کمرے موجود ہوں، جس گھر میں جس قدر یہ وسائل کم ہوں اسی قدر اسے ناقص سمجھا

^۱ یونس، ۳۲

^۲ عصر، ۱-۳

^۳ فرقان، ۴۴، ۴۳

جائے گا۔ اسی طرح ایک انسان میں اس کی فطری خلقت کے مطابق جن چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے، اگر وہ سب اس میں پائی جاتی ہوں تو وہ کامل ہے، اگر ان میں سے کسی ایک کی کمی ہو، یعنی وہ ہاتھ پاؤں یا آنکھ سے محروم ہو تو اسی اعتبار سے ناقص سمجھا جائے گا۔ لہذا مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ صفت کمال وہ چیز ہے کہ جو خلقت کی ضرورتوں کو پیدا کرتی ہے اور اس کے نقص کو دور کرتی ہے، علم کی صفت کے مانند کہ جہل کی تاریکی کو دور کر کے عالم کے لئے معلوم کو واضح کر دیتا ہے اور ”قدرت“ کہ صاحب قدرت شخص کے مقاصد اور اغراض کو ممکن بنا دیتی ہے اور اسے ان پر مسلط کر دیتی ہے ایسے ہی دوسرے صفات میں جیسے صفت حیات وغیرہ۔

ہمارا ضمیر فیصلہ کرتا ہے کہ خالق کائنات (جو حقیقی عالم اور مخلوقات عالم کا سرچشمہ ہے، ہر فرض کی گئی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہر نعمت و کمال کو فراہم کرتا ہے) تمام صفات کمال کا مالک ہے، کیونکہ ایک حقیقت پسند نظر کے مطابق یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی شخص ایسی نعمت کسی کو بخش دے جو خود نہ رکھتا ہو یا جس عیب میں وہ خود مبتلا ہو دوسروں سے اس کو دور کرے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں اپنے تمام صفات کمال کی ستائش کرتا ہے اور خود کو ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک و منزہ قرار دیتا ہے: (وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ) ”تیرا پروردگار بے نیاز اور مہربان ہے“ (اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ) ”وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اس کے لئے بہترین نام ہیں۔“ وہ زندہ، عالم، دیکھنے والا، سننے والا، قادر، خالق اور بے نیاز ہے، پس خدائے متعال کو تمام صفات کمال کا مالک اور اس کی ذات اقدس کو ہر صفت نقص سے پاک و منزہ جاننا چاہئے، کیونکہ اگر اس میں نقص ہوتا تو اسی لحاظ سے نیاز مند ہوتا اور اس اعتبار سے اس سے بالاتر کسی اور خدا کو ہونا چاہئے تھا جو اس کی نیاز مندی کو دور کر سکتا۔ (سجاء و تعالیٰ عاشر کون) ”وہ پاک و پاکیزہ ہے اور ان کے شرک سے بلند و برتر ہے“

۱ انعام ۱۳۳

۲ طہ ۸

۳ یونس ۵

توحید اور کثاتی

(لو کان فیہا آلہۃ الا اللہ لفسدتا) ”یاد رکھو اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان دونوں برباد ہو جاتے۔“

و مناحت

اگر کائنات پر کئی خداؤں کی حکومت ہوتی جیسا کہ بت پرست کہتے ہیں کہ کائنات کے ہر شعبہ کا ایک الگ خدا ہے۔ زمین و آسمان اور دریا و جنگل کا الگ الگ خدا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کائنات کی ہر جگہ پر خداؤں کے درمیان اختلاف کی وجہ سے الگ الگ انتظام برقرار ہوتا اور اس صورت میں کائنات کا کام لامحالہ تباہی و بربادی سے دوچار ہوتا چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کے تمام اجزاء آپس میں ہم آہنگ اور مکمل طور پر موافق ہیں اور سب مل کر ایک نظام کو تشکیل دیتے ہیں، اس بنا پر، کہنا چاہئے کہ خالق کائنات ایک سے زیادہ نہیں ہے۔

یہاں پر یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ فرض کئے گئے خدا، چونکہ عاقل ہوں گے اور وہ جانتے ہوں گے کہ ان کا اختلاف کائنات کو تباہی و بربادی کی طرف لے جائے گا، لہذا وہ ہرگز آپس میں اختلاف نہیں کریں گے، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے کے کام میں مؤثر ہوں گے اور ہر ایک دوسرے کی موافقت اور اجازت کا محتاج ہوگا اور اکیلے ہی کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ جب کہ خدائے تعالیٰ کو احتیاج سے منزہ و پاک ہونا چاہئے۔

خدائے متعال کا وجود، قدرت اور علم

اس وسیع و عریض کائنات کے آپس میں ملے ہوئے اجزاء، اور اس کی عام اور حیرت انگیز گردش، اور کائنات کے گوشہ و کنار میں جاری، آپس میں مرتبط اور آنکھوں کو خیرہ دینے والے جزئی نظام اور نتیجہ کے طور پر مختلف انواع کے مظاہر اپنے خاص مقصد کی

طرف انتہائی نظم و ترتیب کے ساتھ حرکت میں ہیں یہ نظم ہر عقلمند انسان کے لئے واضح کر دیتا ہے کہ عالم حسی اور جو کچھ اس میں ہے اپنے وجود و بقا کے لئے ایک لافانی وجود سے متسل میں جس نے اپنی لامحدود قدرت و علم سے کائنات اور کائنات میں موجود ہر شے کو خلق کیا ہے اور اپنی ہر مخلوق کو پرورش کے گوارہ میں قرار دیا ہے اور اپنی خاص عنایتوں سے ان کے مطلوب کمال کی طرف ابھارتا ہے یہ وہی ہے جس کی حسی لافانی ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے اور اس پر قادر ہے، خدا نے متعال فرماتا ہے: (کہ ملک السموات والارض یحییٰ ویمیت وہو علیٰ کل شیء قدير * ہوا الاول والاخر والظاهر والباطن وہو بکل شیء علیم^۱) ”آسمان وزمین کا کل اختیار اسی کے پاس ہے اور وہی حیات و موت کا دینے والا ہے اور ہر شے پر اختیار رکھنے والا ہے۔ وہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے وہی باطن اور وہی ہر شے کا جاننے والا ہے۔“

خدا کی قدرت (وللہ ملک السموات والارض وما بینہما یخلق ما یشاء واللہ علیٰ کل شیء قدير^۲) ”اور اللہ ہی کے لئے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی کل حکومت ہے۔ وہ جیسے بھی چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔“

وضاحت

جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص موٹر کار خریدنے کی قدرت رکھتا ہے، تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو موٹر کار خریدنے کا محتاج ہے اس کے پاس اس کے خریدنے کی مالی طاقت ہے، اور اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص بیس کلو گرام وزنی پتھر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے، تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں بیس کلو گرام پتھر اٹھانے کی طاقت موجود ہے۔ حقیقت میں کسی چیز پر توانائی و قدرت رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے تمام ضروری وسائل اس کے پاس ہیں، اور چونکہ عالم حسی میں جس وجود کو بھی فرض کیا جائے، اس کی

^۱ حدید، ۳، ۲
^۲ مائدہ، ۱۷، ۲

نیاز مندی اور زندگی کی گردش کی ضرورت خدا کے وجود سے پوری ہوتی ہے یہ کہنا چاہئے کہ خدائے متعال ہر چیز کی قدرت و توانائی رکھتا ہے اور اسی کی ذات پاک کائنات کا سرچشمہ ہے۔ خدا کا علم (أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ) ”کیا پیدا کرنے والا نہیں جانتا ہے؟“

وضاحت

چونکہ ہر مخلوق اپنی پیدائش و حسی میں خدائے متعال کی لا محدود ذات کی محتاج ہے، اس لئے اس مخلوق اور خدا کے درمیان پردے اور رکاوٹ کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے یا اس کا خدا سے پوشیدہ ہونا تصور نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے لئے ہر چیز آشکار ہے اور ہر چیز کے داخل و خارج پر تسلط اور احاطہ کرتا ہے۔

خدا کی رحمت

جب ہم ایک ناتوان محتاج کو دیکھتے ہیں، تو اپنی توانائی کے مطابق اس کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں یا کسی مصیبت زدہ بے چارہ کی مدد کرتے ہیں یا ایک نابینا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کی منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ ایسے کاموں کو ہم مہربانی اور رحمت شمار کر کے پسندیدہ اور قابل ستائش جانتے ہیں۔ جن کاموں کو کارساز اور بے نیاز خدا انجام دیتا ہے، وہ رحمت کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ اپنی بے شمار نعمتوں کو بخش کر سبھی کو بہرہ مند کرتا ہے اور ہر بخشش سے۔ خود کسی کا نیاز مند ہوئے بغیر۔ مخلوقات کی ضرورتوں کے ایک حصہ کو پورا کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے: (وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا^۱) ”اگر تم اس کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو ہر گز شمار نہیں کر سکتے۔“ (ورحمتی وسعت کل شیء^۲) ”اور میری رحمت نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔ تمام صفات کمالیہ (وَبِكِ الْغَنَى ذُو الْحَمِيَّةِ^۳)“ تمہارے پروردگار بے نیاز اور صاحب رحمت ہے“

^۱ ملکہ ۱۴

^۲ ابراہیم ۳۴

^۳ اعراف ۱۵۶

^۴ انعام ۳۴

و مباحث

کائنات میں موجود ہر خوبی اور زیبائی، جس کمال کی صفت کے بارے میں تصور کریں، وہ ایک نعمت ہے جسے خدائے متعال نے اپنی مخلوقات کو عطا کیا ہے اور اس کے ذریعہ خلقت کی ضرورتوں میں سے کسی ایک کو پورا کیا ہے، البتہ اگر وہ خود اس کمال کا مالک نہ ہوتا، تو اس کمال کو دوسروں کو بخشے میں عاجز ہوتا اور خود بھی ضرورتوں میں دوسروں کا شریک بن جاتا پس خداوند عالم کے تمام صفات کمال خود اسی کے ہیں اور اس نے کوئی کمال کسی دوسرے سے حاصل نہیں کیا ہے اور اس نے کسی کے سامنے دست نیاز دراز نہیں کیا ہے، بلکہ خود تمام صفات کمال، جیسے: حیات، علم، قدرت وغیرہ کا مالک ہے اور تمام صفات عیب اور نیاز مندی و احتیاج کے اسباب جیسے: ناتوانی، نادانی، موت، گرفتاری وغیرہ سے پاک و منزہ ہے۔

۲۔ نبوت

انسان کو پیغمبر کی ضرورت

خدائے متعال نے اپنی کامل قدرت سے جو کہ ہر اعتبار سے بے نیاز ہے کائنات اور کائنات میں گوناگوں مخلوقات کو خلق کیا اور انہیں بشارتوں سے نوازا ہے۔ انسان اور تمام دوسری جان دار وغیرہ جان دار مخلوقات کی پرورش پیدائش کے دن سے لیکر کائنات کے آخری دن تک، خدا ہی کرتا ہے، اور ان میں سے ہر ایک، خاص نظم و نسق اور خاص تربیت سے ایک معلوم و معین مقصد کی طرف ہدایت پاتے ہیں اور اسی کی طرف بڑھتے ہیں جبکہ تمام لمحات میں وہ اپنی شایان شان عنایتوں سے نوازے جاتے ہیں۔ اگر ہم صرف اپنی زندگی کے بارے میں غور و خوض کریں، یعنی شیر خوارگی، بچپن، جوانی اور بوڑھاپے کے دور پر نظر ڈالیں، تو خدائے متعال کا وہ کامل لطف و کرم جو ہمارے شامل حال ہے، کے بارے میں ہمارا ضمیر گواہی دے گا، اور جب یہ مسئلہ ہمارے لئے واضح ہو جائے گا تو یقیناً ہماری عقل فیصلہ دے گی کہ خالق کائنات، اپنی مخلوق کے لئے سب سے زیادہ مہربان ہے۔ اسی مہربانی کی وجہ سے ہمیشہ ان کے حالات کے مطابق مصلحت کی رعایت کرتا ہے اور حکمت و مصلحت کے بغیر ہرگز ان کے فساد

و تباہی کے کاموں سے راضی نہیں ہوتا۔ انسان خدا کی ایک ایسی مخلوق ہے۔ کہ جس کی فلاح و بہبود اور سعادت اس میں ہے کہ حقیقت پسند اور نیک منش ہو یعنی اس میں صحیح عقائد پسندیدہ اخلاق اور نیک کردار ہونا چاہئے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ انسان اپنی خدا داد عقل سے اچھے اور برے کو پہچان سکتا ہے اور چاہ کو راہ سے تشخیص دے سکتا ہے، لیکن یہ جاننا چاہئے کہ عقل اکیلے ہی اس گرہ کو کھول کر انسان کی حقیقت پسندی اور نیکی کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتی، کیونکہ انسانی معاشرے میں جو مشاہدہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ تر برائیاں ان لوگوں سے انجام پا رہے ہیں، جو عقل و شعور اور برے بھلے کی تمیز رکھتے ہیں، لیکن خود پرستی، منافع پرستی اور ہوس رانی کے نتیجے میں ان کی عقل اس کے جذبات اور ہوا و ہوس کی تابع ہو کر گمراہی سے دوچار ہوتی ہے۔ لہذا خدائے متعال کو ایک دوسرے راستے سے یا ایک ایسے وسیلہ سے سعادت کی طرف ہماری راہنمائی کرنا چاہئے جو کبھی ہوا و ہوس سے مغلوب نہ ہو اور اپنی رہبری میں کبھی اشتباہ و غلطی کا شکار نہ ہو، ایسا راستہ صرف نبوت کا ہے۔

انبیاء کی تبلیغ

ہماری عقل جو فیصلہ کرتی ہے اور اس کے مطابق حکم دیتی ہے کہ انسان کے لئے ”نبوت“ کے نام کا ایک راستہ کھلا ہونا چاہئے۔ یہ چیز عطا بھی مورد تاکید قرار پا کر انجام پایا ہے۔ انسانوں میں سے (انبیاء) نامی کا ایک گروہ خدائے متعال کی طرف سے منتخب ہوا ہے۔ جنہوں نے لوگوں کی ہدایت کے لئے اعتقادی کچھ عملی قوانین و ضوابط پیش کئے اور ان کو صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دی ہے ان پیغمبروں نے اپنے دعویٰ کے صحیح ہونے اور اپنے دین کے سچے ہونے کو معقول طریقوں سے لوگوں کے لئے ثابت کیا، اور اپنے تربیتی مکتب میں کچھ شائستہ افراد کی پرورش کی۔ عقل معاش، جسے ہم عقل علمی بھی کہتے ہیں (وہ شعور جس سے ہم اپنی زندگی کو چلاتے ہیں) ہمیشہ اجازت دیتی ہے کہ ہم اپنی زندگی کے فائدے کے لئے ہر قابل استفادہ چیز سے استفادہ کریں جیسے: فضا، ہوا، درختوں، ان کے پھل پتوں اور لکڑیوں، حیوانات، ان کے گوشت، دودھ، اون اور کھال سے استفادہ کریں۔ اسی طرح ہم اپنی بے شمار ضرورتوں کے پیش نظر اپنے ہم نوع انسانوں کی سرگرمیوں سے بھی اپنے نفع میں استفادہ کرتے ہیں۔ ان چیزوں کے

مصرف اور استفادہ کا حکم ہمیں ہماری عقل و شعور نے دیا ہے اور اسی نے ان کے جائز ہونے کی تصدیق کی ہے، اس لئے ہے کہ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ بھوک کے وقت تم کیوں کھانا کھاتے ہو؟ پیاس کے وقت کیوں پانی پیتے ہو؟ یا میں کیوں سانس لیتے ہو؟ تو اس کے یہ سوالات مضحکہ خیز ہوں گے۔ لیکن جب ہم اپنے ہم نوع انسان کے کام و کوشش سے استفادہ کرنے کے لئے ان سے پہلی بار رابطہ برقرار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ہماری طرح میں جس طرح ہم ان کی سرگرمیوں کے نتیجہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح وہ بھی ہماری سرگرمیوں کے نتیجہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی سرگرمیوں کے نتیجہ کو انہیں مفت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں لہذا ان کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ اسے مفت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اجتماعی طور پر ایک دوسرے کا تعاون کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنے ہم نوع انسان کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں تاکہ اس کے مقابلہ میں وہ بھی ہماری مدد کریں۔

اسی احتیاج و ضرورت کے پیش نظر، مختلف انسان آپس میں جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کی مدد اور کام سے استفادہ کرتے ہیں، حقیقت میں مختلف افراد کے کام اور ان کی کوششیں ایک دوسرے پر بٹ جاتی ہیں، اور اس کے بعد ہر ایک اپنی حیثیت اور اجتماعی سرگرمی کے مطابق اس سے استفادہ کرتا ہے۔

معاشرے میں قوانین و قواعد کی ضرورت

جیسا کہ بیان کیا جا چکا کہ انسان مجبور ہو کر اجتماعی تعاون پر آمادہ ہوتا ہے ورنہ فطری طور پر وہ صرف اپنی زندگی کے نفع کا خواہاں ہے، لہذا جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ دوسروں کے منافع پر تجاوز کرتا ہے جبکہ اس نے اپنے منافع سے کوئی چیز دوسروں کو انہیں دی ہے کہ تعادل برقرار رہے۔ اسی لئے ہر معاشرے میں کچھ قوانین و مقررات کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کی رعایت کرنے سے انسان کی اجتماعی قدر و قیمت محفوظ رہے، اور ان کو تجاوز کرنے سے روکا جاسکے۔ قوانین و ضوابط کو لوگوں کے اتفاق نظریا ان کی اکثریت کی رائے سے منظور کیا جانا چاہئے تاکہ ہر فرد اپنے انفرادی و اجتماعی فرائض سے آگاہ ہو جائے۔ قواعد و ضوابط کی تکوینی بنیاد

قوانین و ضوابط ایسے فرائض میں جو انسانی زندگی کی مصلحتوں کی حفاظت کے لئے وضع ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی قدر و قیمت اجتماعی ہے نہ فطری و تکوینی۔ یعنی فطرت میں حکم فرما قوانین کا خود بخود کوئی اثر نہیں ہے بلکہ جب معاشرے کے لوگ انہیں جاری کرتے ہیں تو یہ جاری ہوتے ہیں ورنہ یہ ایک بے اثر افسانہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود یہ قوانین و ضوابط، فطرت و تکوین سے بے ربط بھی نہیں ہیں بلکہ ان میں تکوین کی اصل موجود ہے۔ فطرت اور انسان کی فطری ضرورت ان کا سرچشمہ ہے یعنی خدائے متعال نے انسان کی خلقت کچھ اس طرح کی ہے کہ خواہ نخواستہ اجتماعی انکسار کے ایک سلسلہ کو وجود میں لا کر انہیں قابل استفادہ قرار دیتا ہے اور اپنی تکوینی زندگی کو ان پر تطبیق کرتا ہے اور اپنے وجودی مقاصد تک پہنچتا ہے۔

زندگی کے قوانین کی طرف تکوینی ہدایت

ہم جانتے ہیں کہ خدائے متعال اپنی عنایت کاملہ اور بے پناہ محبت کی بدولت اپنی ہر مخلوق کو اس کے وجودی مقصد تک پہنچاتا ہے اور انسان بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے پس خدائے متعال کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے لئے کچھ ایسے قوانین و ضوابط وضع کرے جو اس کی زندگی کی راہ و رسم کو تشکیل دے اور ان پر عمل کے ذریعہ انسان کی مصلحتیں اور منافع پورے ہو سکیں اور ان کو حاصل کرنے کے لئے صرف عقل کافی نہیں ہے۔ کیونکہ کبھی خود عقل بھی درک کرنے میں خلا کرتی ہے اور اکثر اوقات عقل عادت، تقلید اور وراثت میں ملی صفات سے متاثر ہو کر ہوا و ہوس سے مغلوب ہو کر انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم جان چکے کہ عقل انسان کو منافع طلبی کے قانون کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور اگر انسان کبھی دوسروں کے لئے حق کا قائل ہوتا ہے اور عام قانون کی پیروی کرتا ہے، تو وہ بنا بر مجبوری اور اپنے شخصی منافع کو حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے، اسی وجہ سے اکثر لوگ جب قدرت و توانائی کے عروج پر پہنچتے ہیں تو اپنے مقابلہ میں کسی حریف اور مخالف کو کچھ نہیں سمجھتے، ہر قانون و حکم کی سرکشی کرتے ہیں اور دوسروں کے منافع کو اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں اور ان کے حقوق کو پامال کرتے ہیں۔

لہذا خدائے متعال کو چاہئے کہ لوگوں کو ان کی زندگی کی راہ و رسم کے بارے میں ایک ایسے طریقہ سے راہنمائی کرے جو ہر قسم کی خطا و لغزش سے محفوظ ہو اور وہ طریقہ (نبوت) ہے اور وہ یہ ہے کہ خدائے متعال اپنے بعض بندوں کو راہ فکر و عقل کے علاوہ ایک اور راہ (راہ وحی) سے معارف و احکام کے ایک سلسلہ کی تعلیم دے تاکہ ان پر عمل کے ذریعہ لوگوں کی حقیقی سعادت کی طرف راہنمائی کر سکے۔

نتیجہ

مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ خدائے متعال کو چاہئے کہ اپنے بعض بندوں کو غیبی تعلیم کے قوانین سے آگاہ کر کے بھیجے جو انسانی سعادت کے ضامن ہیں۔ خدا کے پیغام لانے والے انسان کو پیغمبر یا خدا کا رسول کہتے ہیں اور خدا کی طرف سے لائے گئے پیغامات کے مجموعہ کو ”دین“ کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے دینی معارف اور الہی قوانین کو صحیح طور پر تبدیل اور کمی بیشی کے بغیر لوگوں کے پاس پہنچنا چاہئے۔ یعنی خدا کا پیغمبر وحی الہی کو حاصل کرنے میں خطا نہ کرے اور اس کی حفاظت میں بھول چوک اور لغزش سے دو چار نہ ہو اور اس کو لوگوں تک پہنچانے میں غلطی یا خیانت نہ کرے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ ضروری معارف اور زندگی کے قوانین کی طرف لوگوں کی ہدایت نظام خلقت کا جزو ہے اور یہ انسان کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔ خلقت اپنی راہ کو طے کرنے میں ہرگز خطا اور لغزش کو قبول نہیں کرتی، مثال کے طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ نظام خلقت انسان کے تناسل سے ایک پتھر یا پودے کو وجود میں لائے یا گیہوں کے دانہ کو بونے کے بعد ایک حیوان پیدا ہو یا انسان کی آنکھ موجودہ حالت میں معدہ کا کام انجام دے یا کان دل کا کام انجام دے۔ اس چیز سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے انبیاء کو معصوم ہونا چاہئے۔ یعنی جس کام کو وہ خود واجب جانتے ہوں اسے ترک نہ کریں اور جس کام کو وہ خود گناہ جانتے ہوں انہیں انجام نہ دیں، کیونکہ ہم (انسان) اپنے ضمیر سے جانتے ہیں کہ جو اپنی بات پر عمل نہ کرے، حقیقت میں وہ اس بات کے صحیح اور سچ ہونے کا قائل نہیں ہے۔ اس صورت میں اگر پیغمبر گناہ کا مرتکب ہو جائے، تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا اور تبلیغ کا

مسئلہ بے اثر ہوگا اور اگر بعد میں توبہ اور اظہارِ ندامت بھی کرتا ہے تو بھی ہمارا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہوگا اور ہر حالت میں تبلیغ کا مقصد فوت پر جائے گا۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احداً* الا من ارضی من رسول فانہ یسکک من بین یدیه ومن خلفہ رعداً* لعلہم ان قد ابلغوا رسلت ربہم!) ”وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا۔“

مگر جس رسول کو پسند کر لے تو اس کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے۔ ”انسان اور دوسری مخلوقات کی ہدایت میں فرق توحید کی بحثوں سے واضح ہوتا ہے کہ اشیاء کی تخلیق خدا کی طرف سے ہے، لہذا ان کی پرورش بھی اسی سے مربوط ہے۔ واضح الفاظ میں یہ کہا جائے کہ کائنات کی ہر مخلوق، اپنی پیدائش کے آغاز سے اپنی بقا اور نقائص کو دور کرنے میں سرگرم عمل ہوتی ہے اور اپنی کمیوں و ضرورتوں کو یکے بعد دیگر رفع کرتی ہے اور امکان کی حد تک اپنے آپ کو کامل اور بے نیاز کرتی ہے۔“

اپنی بقا کے سفر میں ایک منظم حرکت کے تحت اپنے وجود کو جاری رکھتی ہے، اس سفر کو منظم کرنے والا اور ہر منزل پر اسکا رہبر خدائے متعال ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ایک قطعی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر قسم کی مخلوق ایک خاص تکوینی پروگرام کے تحت باقی ہے اور اس میں اپنی خاص سرگرمی ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، کائنات کے مظاہر میں سے ہر معین گروہ کے لئے، اپنی بقا کے سفر میں کچھ معین فرائض ہیں جو خدائے متعال کی طرف سے انھیں عطا ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ہدیٰ) ”... ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے“، خلقت کے تمام اجزاء اس حکم میں شامل ہیں اور ان میں سے ہرگز کوئی مشنی نہیں ہے آسمان کے ستارے اور ہمارے پیروں سے زمین اور ان میں موجود عناصر اور ابتدائی مظاہر کو ظاہر کرنے

والی ترکیبیں اور نباتات و حیوانات، بھی کی یہی حالت ہے۔ اس عام ہدایت میں انسان کی حالت بھی دوسری مخلوقات کے مانند ہے، سوائے یہ کہ انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان ایک فرق ہے۔



ترجمہ تحریک
Translation Movement

انسان اور دوسری مخلوقات میں فرق

مثال کے طور پر کرۂ زمین کو لاکھوں سال پہلے خلق کیا گیا ہے، جو اپنی تمام پوشیدہ توانائیوں کو استعمال میں لا کر اپنے دائرہ حدود میں جب تک مخالف عوامل مانع نہیں ہوتے اس وقت تک سرگرم عمل ہے اور اپنی وضعی و انتہائی حرکت کے نتیجہ میں اپنے وجودی آثار کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح اپنی بقا کی ضمانت حاصل کرتا ہے اور جب تک کوئی اس سے قوی مخالف عامل رکاوٹ نہ بنے، اسی سرگرمی کو جاری رکھے گا، اور اپنے فرائض کو نبھانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرے گا۔ بادام کا درخت گٹھلی سے باہر آنے کے وقت سے کامل درخت کی صورت اختیار کرنے تک تغذیہ، رشد و نمو وغیرہ میں دوسرے الفاظ میں اپنے بحال کے سفر کی راہ میں کچھ فرائض انجام دیتا ہے کہ اگر کوئی قوی تر مخالف عامل رکاوٹ نہ بنے تو اپنے فرائض کو انجام دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کریگا اور کوئی کوتاہی کر بھی نہیں سکتا۔ ہر دوسری مخلوق کی بھی یہی حالت ہے۔

لیکن انسان، اپنی خصوصی سرگرمیوں کو اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے اور جو کام انجام دیتا ہے، اس کا سرچشمہ اس کی فکر اور اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے انسان کبھی ایک ایسے کام کو انجام دینے سے پہلو تہی کرے جو سو فیصدی اس کے نفع میں ہو اور کوئی مخالف عامل بھی رکاوٹ نہ بنے اور اس کے مقابلہ میں ایک ایسے کام کو جان بوجھ کر انجام دے جس میں سو فیصدی ضرر اور نقصان ہو، مثلاً کبھی دوائی کھانے سے پرہیز کرتا ہے اور کبھی جام زہر نوش کر کے خود کشی کرتا ہے۔

البتہ واضح ہے کہ جو مخلوق مختار پیدا کی گئی ہے، ہو عام ہدایت اس کے لئے جبری نہیں ہوگی۔ یعنی انبیاء، خیر و شر اور سعادت و بد بختی کی راہ کو خدائے متعال کی طرف سے لوگوں کو بیان کرتے ہیں اور دین کے پیروں کو ثواب کا مژدہ سن کر پروردگار کی رحمت سے امیدوار بناتے ہیں سرکشوں اور باغیوں کو خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں اور وہ ان میں سے ہر ایک کو اختیار کرنے میں آزاد و مختار ہوں گے۔ صحیح ہے کہ انسان اپنے خیر و شر اور نفع و نقصان کو اجالا عقل سے سمجھتا ہے۔ لیکن یہی عقل، اکثر اوقات اپنے

کو گم کر کے نفسانی خواہشات کی پیروی کرتی ہے، اور کبھی غلط راستہ پر چلتی ہے لہذا خدا کی ہدایت عقل کے علاوہ کسی اور راستہ سے بھی انجام پانی چاہئے اور وہ اس راستہ کو خطا و لغزش سے بالکل محفوظ ہونا چاہئے۔ یا دوسرے الفاظ میں خدائے متعال اپنے احکام کو اجالی طور پر عقل سے لوگوں کو سمجھاتا، اور ایک دوسرے راستہ سے اس کی تصدیق فرماتا۔

یہ راستہ وہی ”تہوت“ کا راستہ ہے کہ خدائے متعال اپنے سعادت بخش احکام کو وحی کے ذریعہ اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو سمجھاتا ہے اور اسے مامور کرتا ہے کہ انھیں لوگوں تک پہنچائے اور انھیں امید و خوف کے ذریعہ شوق دلا کر اور ڈرا کر ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (اَنَا أَوْحِيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا بِشَرِينٍ وَمُزْدَلِّينَ لَتَكُنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرِّسَالِ) ”ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی نازل کی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے انبیاء کی طرف وحی کی تھی یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خدا پر قائم نہ ہونے پائے“

پیغمبر کی صفات

مذکورہ بیان سے واضح ہوا کہ پیغمبر میں حسب ذیل صفات ہونی چاہئیں: ۱۔ اپنے فریضہ کو انجام دینے میں خطا سے محفوظ اور معصوم ہونا چاہئے اور ہر طرح کی فراموشی اور دوسری ذہنی آفتوں سے بھی محفوظ ہونا چاہئے تاکہ جو چیز اس پر وحی ہوتی ہے اس کو صحیح طور پر حاصل کر کے، کسی لغزش و غلطی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دے، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا تو الہی ہدایت اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتی اور عام ہدایت کا قانون اپنی کلی حیثیت کو کھو کر انسان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ہے۔

۲۔ پیغمبر کو اپنے کردار و گفتار میں لغزش اور گناہ سے محفوظ ہونا چاہئے چونکہ گناہ کی صورت میں تبلیغ موثر واقع نہیں ہوتی، جس کے قول و فعل میں اختلاف ہو، لوگ اس کے قول کو قابل قدر نہیں جانتے حتیٰ اس کے کردار کو بھی جھوٹ کی دلیل سمجھ کر کہتے ہیں: (اگر وہ

سچ کہتا تو وہ اپنی بات پر عمل کرتا (ان دو مطالب کو ایک عبارت میں جمع کیا جاسکتا ہے: تبلیغ کے صحیح و موثر واقع ہونے کے لئے پیغمبر کا خطا اور معصیت سے معصوم ہونا ضروری ہے جیسا کہ قرآن مجید کی دلیل بھی بیان کی گئی)۔

۳۔ پیغمبر کو اخلاقی فضائل کا مالک ہونا چاہئے، جیسے: عفت، شجاعت، عدالت وغیرہ کیونکہ یہ سب پسندیدہ صفات شمار ہوتی ہیں اور جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور دین کی مکمل طور پر اطاعت کرتا ہو اس کا دامن کبھی اخلاقی برائیوں سے داغدار نہیں ہو سکتا۔

انبیاء، انسانوں کے درمیان

تاریخ کی رو سے مسلم ہے کہ لوگوں کے درمیان کچھ پیغمبر تھے جنہوں نے دعوت کے ذریعہ انقلاب برپا کیا ہے، لیکن پھر بھی ان کی زندگی کے بارے میں تاریخ زیادہ واضح نہیں ہے۔ صرف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی تاریخ میں کسی طرح کا ابہام نہیں ہے۔ اور قرآن مجید، جو آنحضرتؐ کی آسمانی کتاب ہے اور اس میں آپؐ کے دین کے عالی مقاصد درج ہیں، گزشتہ انبیاء کی دعوت کے موضوع کو بھی واضح کرتا ہے اور ان کے مقاصد کو بھی بیان کرتا ہے۔ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ خدائے متعال کی طرف سے بہت سے انبیاء لوگوں کی طرف آئے ہیں اور انہوں نے متفقہ طور پر توحید اور دین کی دعوت کی ہے، چنانچہ فرماتا ہے: (وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیہ انزلنا لہ الا انما فاعبدون^۱) اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کی طرف وحی کرتے رہے کہ میرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، لہذا سب لوگ میری ہی عبادت کرو۔“

صاحب شریعت انبیاء

قرآن مجید بیان فرماتا ہے کہ خدا کے سارے نبی آسمانی کتاب کے حامل نہیں تھے اور نہ ہی مستقل شریعت لے کر آئے تھے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (شرع کلم من الدین ما وضعی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابرہیم و موسیٰ و عیسیٰ^۲) اس نے

^۱ جن ۲۶، ۲۸۔

^۲ انبیاء، ۲۵۔

^۳ شوریٰ، ۱۳۔

تمہارے لئے دین میں وہ راستہ مقرر کیا ہے جس کی نصیحت نوح کو کی ہے اور جس کی وحی پیغمبر! تمہاری طرف بھی کی ہے اور جس کی نصیحت ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی کی ہے۔“ اس بنا پر بڑے انبیاء میں سے پانچ نبی جو صاحب شریعت اور آسمانی کتابوں کے حامل تھے، حسب ذیل ہیں: ۱۔ حضرت نوح علیہ السلام

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

۳۔ حضرت موسیٰ (کلم) علیہ السلام

۴۔ حضرت عیسیٰ (مسیح) علیہ السلام

۵۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ان انبیاء میں سے ہر ایک کی شریعت اپنے گزشتہ نبی کی شریعت کو مکمل کرنے والی تھی۔

اولوالعزم پیغمبر اور دوسرے انبیاء

ہم یہ بیان کر چکے کہ جو پیغمبر آسمانی کتاب اور مستقل شریعت لے کر آئے تھے وہ پانچ ہیں لیکن خدا کے رسول صرف یہی پانچ افراد نہیں تھے بلکہ ہر امت کا ایک نبی تھا اور خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے بہت سے انبیاء بھیجے گئے ہیں، کہ ان سے میں صرف میں افراد کا نام قرآن مجید میں موجود ہے، چنانچہ خدا نے متعال فرماتا ہے: (منم من قصصنا علیک ومنم من لم نقص لیک)۔ ”جن میں سے بعض کا تذکرہ آپ سے کیا ہے اور بعض کا تذکرہ بھی نہیں کیا ہے“ (ولکل امت رسول)۔ ”اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے۔“ (ولکل قوم ہاد)۔ ”اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا ہے“۔ ”جی ہاں، اولوالعزم پیغمبروں میں سے

۱ غافر، ۷۸

۲ یونس، ۴۷

۳ رعد، ۷

ہر ایک کے بعد جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں، انہوں نے انسانوں کو انہی پیغمبروں کی شریعت کی طرف دعوت دی ہے اور اس طرح بہشت و دعوت کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ خدائے متعال نے پیغمبر اکرم حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گزشتہ پیغمبروں کے سلسلہ کو ختم کرنے اور آخری احکام و کامل ترین دینی ضوابط کو پہنچانے کے لئے مبعوث فرمایا اور آپ کی آسمانی کتاب کو آخری آسمانی کتاب قرار دیا نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین قیامت تک جاری رہے گا اور آپ کی شریعت ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گی۔

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام: سب سے پہلے پیغمبر جسے خدائے متعال نے شریعت اور آسمانی کتاب کے ساتھ عالم بشریت میں بھیجا، حضرت نوح علیہ السلام تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کو توحید یکتا پرستی کی ترغیب اور شرک و بت پرستی سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کے قصوں سے واضح ہے کہ طبقاتی اختلافات کو ختم کرنے اور ظلم و ستم کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے آپ سخت جہاد و مبارزہ کرتے تھے اور استدلال کے ذریعہ جو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نیا تھا، اپنی تعلیمات پہنچاتے تھے۔ آئے ایک طولانی مدت تک جاہل، ضدی اور سرکش لوگوں سے دست بگریبان ہونے کے بعد ایک چھوٹے گروہ کی ہدایت کی اور خدائے متعال نے ایک طوفان کے ذریعہ کفار کو ہلاک کر کے زمین کو ان کے ناپاک وجود سے پاک فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے کچھ پیروؤں کے ساتھ نجات پانے کے بعد دنیا میں ایک نئے دینی معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ معزز پیغمبر، شریعت توحید کے بانی اور خدا کے پہلے کچھ مور میں، مکہ جنہوں نے ظلم و ستم اور سرکشی کا مقابلہ کیا اور دین حق و حقیقت کی عظیم خدمت کی لہذا خدائے متعال کی طرف سے خاص درود و سلام کے مستحق قرار پائے اور رہتی دنیا تک زندہ و پائندہ رہیں گے: (سلم علی نوح فی العلمین) ”ساری خدائی میں نوح پر ہمارا سلام“

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام: حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اور اس عرصہ میں اگرچہ بہت سے انبیاء جیسے حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے علاوہ دوسرے انبیاء لوگوں کی خدائے متعال اور حق کی طرف رہنمائی فرماتے رہے، لیکن پھر بھی دن بدن شرک و بت پرستی کا بازار گرم ہوتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ تمام عالم میں بت پرستی پھیل گئی اور خدائے متعال نے اپنی حکمت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فطری انسان کے ایک کامل نمونہ تھے۔ آپ نے پاک و بے آلائش فطرت سے حقیقت کے لئے جستجو کر کے خالق کائنات کی وحدانیت کو پایا اور اپنی زندگی کے آخری لمحات تک شرک و ظلم سے لڑتے رہے۔ جیسا کہ قرآن مجید سے ثابت ہے اور اہل بیت کی روایتیں بھی دلالت کرتی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بچپن شرک کے شور و غل سے دور ایک غار میں گزرا۔ آپ کی ملاقات صرف کبھی کبھی اپنی والدہ سے اس وقت ہوتی تھی جب وہ آپ کے لئے کھانا پانی لے کر آتی تھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دن اپنی والدہ کے ساتھ غار سے باہر نکلے اور شہر تشریف لائے۔ اور اپنے چچا آزر کے پاس گئے۔ وہ جو چیز بھی دیکھتے تھے وہ ان کے لئے نئی اور حیرت انگیز ہوتی تھی۔ ان کی پاکیزہ فطرت ہزاروں حیرت و تعجب کے عالم میں بڑی بے چینی و بے تابی کے ساتھ ان چیزوں کی خلقت کی طرف متوجہ تھی جن کا وہ مشاہدہ کرتے تھے اور وہ ان کی تخلیق کے اسرار تک پہنچنے کی جستجو میں تھے۔ جب انہوں نے ان بتوں کو دیکھا کہ جنہیں آزر اور دوسرے لوگوں نے تراشا تھا اور وہ ان کی پرستش کرتے تھے۔ تو انکی حقیقت کے بارے میں سوال کیا لیکن ان بتوں کے رب ہونے کے بارے میں جو وضاحت کی جاتی تھی وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ جب حضرت ابراہیم نے کچھ لوگوں کو ستارہ زہرہ، کچھ لوگوں کو چاند اور کچھ لوگوں کو سورج کی پوجا کرتے ہوئے پایا جو کہ ایک مدت کے بعد ڈوب جاتے تھے تو آپ نے ان کے رب ہونے کو قبول نہ کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے بعد خدائے واحد کی پرستش اور شرک سے اپنی بیزاری کا لوگوں میں بلا خوف اعلان کر دیا اور اب وہ بت پرستی اور شرک سے مقابلہ کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔ بت پرستوں کے ساتھ

اتھک مقابلہ کرتے اور ان کو توحید کی طرف دعوت دیتے تھے۔ آخر کار ایک بت خانہ میں داخل ہوئے اور بتوں کا توڑنا ان لوگوں میں سب سے بڑا جرم شمار ہوتا تھا آپ کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔ مقدمہ کی سماعت کے بعد آپ کو آگ میں جلانے کی سزا سنادی گئی، کاروائی مکمل کرنے کے بعد آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا، لیکن خدائے متعال نے آپ کی حفاظت فرمائی اور آپ آگ سے صحیح و سالم باہر نکل آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ مدت کے بعد اپنی جائے پیدائش ملک بابل سے سرزمین شام اور فلسطین کی طرف ہجرت کی اور اس علاقہ میں اپنی دعوت کو جاری رکھا۔

زندگی کے آخری ایام میں خدائے متعال نے آپ کو دو فرزند عطا کئے۔ ان میں سے ایک حضرت اسحاق تھے جو اسرائیل کے والد اور دوسرے اسماعیل، تھے جو مصری عرب کے باپ ہیں۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو شیرخواری کے ایام میں ہی خدا کے حکم سے ان کی والدہ کے ہمراہ حجاز لے جا کر تمامہ کے پہاڑوں کے بیچ میں ایک بے آب و گیاہ اور باشندوں سے خالی سرزمین میں چھوڑ دیا، اس طرح صحرائین عربوں کو توحید کی دعوت دی۔ اس کے بعد خانہ کعبہ کی سنگ بنیاد ڈالی اور اعمال حج انجام دینے کا تشرع فرمایا کہ اسلام کے ظہور اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تک یہ عمل عربوں میں رائج تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام قرآن مجید کی نص کے مطابق دین فطرت کے حامل تھے۔ آپ وہ پہلے شخص ہیں کہ جس نے خدا کے دین کو اسلام اور اس کے پیروؤں کو مسلمین کہا، اور دنیا میں ادیان توحید یعنی یہودیت، نصرانیت اور اسلام آپ پر منتہی ہوتے ہیں، کیونکہ ان تینوں ادیان کے پیشوا حضرت موسیٰ کلیم، حضرت عیسیٰ مہیج اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اور یہ سب دعوت دینے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر تھے۔

۳۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام: حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام تیسرے اولوالعزم پیغمبر اور صاحب کتاب و شریعت ہیں۔ آپ اسرائیل (یعقوب) کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی شور و غل سے بھری ہوئی تھی۔ آپ کی

پیدائش کے وقت بنی اسرائیل مصر میں قہیوں کے درمیان ذلت و اسیری کی زندگی گزار رہے تھے اور فرعون کے حکم سے بچوں کے سر قلم کئے جا رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو خواب میں جو حکم دیا گیا تھا اس کے مطابق موسیٰ کو لکڑی کے ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔ پانی نے صندوق کو بہا کر فرعون کے محل کے قریب پہنچا دیا۔ فرعون کے حکم سے صندوق کو پانی سے نکالا گیا، جب صندوق کو کھولا گیا تو اس میں ایک خوبصورت بچے کو پایا گیا۔ فرعون نے ملکہ کے اصرار پر بچے کو قتل نہیں کیا، اور چونکہ وہ لا ولد تھا، لہذا اسے اپنا بیٹا بنالیا اور دایہ کے حوالہ کیا گیا اتفاق سے وہی اس کی ماں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابتدائے جوانی تک فرعون کے دربار میں تھے۔ اس کے بعد ایک قتل کے حادثہ کی وجہ سے فرعون سے ڈر کر، مصر سے بھاگ کر مدین چلے گئے اور وہاں پر حضرت شعیبؑ پینمبر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور حضرت شعیب کی ایک بیٹی سے شادی کی۔ کئی سال تک حضرت شعیب کی بھیر بکریوں کو چراتے رہے۔ ایک دن انھیں اپنے وطن کی یاد آئی۔

اپنے اہل و عیال اور ساز و سامان کے ساتھ راہی مصر ہوئے۔ اس سفر کے دوران جب رات کے وقت طور سینا پہنچے تو خدائے متعال کی طرف سے رسالت کے عہدہ پر فائز ہوئے اور آپ کو مامور کیا گیا کہ فرعون کو دین توحید کی دعوت دیں اور بنی اسرائیل کو قہیوں سے نجات دلائیں اور اپنے بھائی ہارون کو اپنا وزیر قرار دیں۔ لیکن اپنے فریضہ کو انجام دینے اور پیغام الہی کو پہنچانے کے بعد فرعون، جو کہ بت پرست تھا اور خود کو خدا کہتا تھا، نے آپ کی رسالت اور دعوت کو مسترد کر دیا اور بنی اسرائیل کی آزادی کا ضامن نہیں ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سالہا سال تک لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور بہت سے معجزے دکھائے لیکن اس کے باوجود فرعون اور اس کی قوم ان کے ساتھ سختی اور تند مزاجی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کے ہمراہ رات کے اندھیرے میں مصر سے کوچ کر کے صحرائے سینا کی طرف چلے گئے۔ جب وہ بحر احمر پہنچے تو

^۱ مصر میں بادشاہ کو (فرعون) کہتے تھے۔

فرعون کو یہ معلوم ہو گیا اور اس نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معجزہ کے ذریعہ سمندر کو ٹکافتہ کیا اور اپنی قوم کے ساتھ پانی سے گزر گئے، لیکن فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد خدائے متعال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توحید نازل فرمائی اور بنی اسرائیل میں کلہی شریعت کو نافذ کیا۔

۴۔ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام: حضرت مسیح اولوالعزم اور صاحب کتاب و صاحب شریعت پیغمبروں میں سے چوتھے پیغمبر ہیں۔ آپ کی پیدائش غیر معمولی تھی۔ آپ کی والدہ حضرت مریم ایک مقدس و پارسا دوشیزہ تھیں جو بیت المقدس میں عبادت کرنے میں مشغول تھیں کہ خدا کی طرف سے روح القدس آپ پر نازل ہوئے اور حضرت مسیح کی بشارت دی پھر ان کی آستین میں پھونک ماری کہ جس سے وہ حاملہ ہو گئیں۔

حضرت مسیح نے پیدا ہونے کے بعد اپنی ماں پر لوگوں کی طرف سے لگائی جانے والی تہمتوں کا جواب گوارہ میں دیا اور اپنی والدہ کا دفاع کیا اور اپنی نبوت اور کتاب کے بارے میں لوگوں کو خبر دی۔ اس کے بعد جوانی میں لوگوں کو دعوت دینے میں مشغول ہوئے اور حضرت موسیٰ کی شریعت میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اسے زندہ کیا۔ آپ اپنے حواریوں کو اسلام کے مبلغ کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے۔ ایک مدت کے بعد جب ان کی دعوت پھیل گئی تو یہودی (آپ کی قوم) آپ کو قتل کرنے کے در پے ہو گئے، لیکن خدائے متعال نے آپ کو نجات دی اور یہودیوں نے آپ کی جگہ پر کسی اور کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خدائے متعال نے قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کا نام ”انجیل“ بیان کیا ہے یہ ”انجیل“ ان انجیلوں کے علاوہ ہے، جو آپ کے بعد آپ کی سیرت اور دعوت کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے چار انجیلیں لوقا، مرقس، متی اور یوحنا کی تالیف رسمی طور پر قبول کی گئی ہیں۔

۵۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۵۳ء میں ہجرت سے ۵۳ سال پہلے حجاز کے ایک شریف و نجیب ترین عرب خاندان (بنی ہاشم) میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا حیرت انگیز حد تک اخلاقی گراؤ سے دوچار تھی اور دن بدن جہل و نادانی کے بھنور میں پھنس کر اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی اور ہر لمحہ انسانی مغویات سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ خاص کر جزیہ نامے عرب جس کے اکثر باشندے صحرائین تھے اور قبیلوں کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے تمام شہری حقوق سے محروم تھے۔ وہ لوگ کچھ خرائنی اور یہودہ انکار (من جلد اپنے ہاتھوں سے پتھر، بکڑی اور کبھی خشک دہی کے بنائے گئے، توں کی پرستش) میں زندگی گزارتے تھے۔

اور اپنے اسلاف کی تقلید کرنے، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کے علاوہ کسی قسم کا فخر و مباہات نہیں رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ آپ کے والد گرامی عبداللہ اس دنیا سے رحلت کر گئے اور چار سال کے بعد آپ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ لہذا آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ کے دادا عبدالطلب نے سنبھالی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اپنے دادا سے بھی محروم ہو گئے اور آپ کے چچا حضرت ابوطالب آپ کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے ایک بیٹے کی طرح آپ کو پالا۔ مکہ کے عرب دوسرے عربوں کی مانند بھیڑ بکری اور اونٹ پالتے تھے اور کبھی اپنے ہمسایہ مالک باخصوص شام کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ ان پڑھ تھے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ ان کے درمیان زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن بچپن سے ہی کچھ پسندیدہ اوصاف کی وجہ سے معاشرے میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے، آہر گزرتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے، جھوٹ نہیں بولتے تھے، چوری اور خیانت نہیں کرتے تھے، برے ناپسند اور نامناسب کام انجام دینے سے پرہیز کرتے تھے، عقل و شعور رکھتے تھے، اسی لئے تھوڑے ہی عرصہ میں لوگوں کے درمیان قابل توجہ محبوبیت حاصل کر لی اور ”محمد امین“ کے نام سے مشہور ہوئے، چونکہ عرب اپنی امانتوں کو آپ کے سپرد کرتے تھے اور آپ کی امانتداری اور لیاقت کی تعریفیں کرتے تھے۔ آپ تقریباً بیس سال کے تھے کہ مکہ کی ایک

دولت مند عورت (خدیجہ کبریٰ) نے آپ کو اپنی تجارت کے کارندہ کی حیثیت سے معین کیا۔ آپ کی سچائی، اچھائی اور عقل و لیاقت کی وجہ سے اس کو تجارت میں کافی منافع ملا اور فطری طور پر آپ کی شخصیت سے متاثر ہوئی، اور آخر کار آپ کے ساتھ شادی کرنے کی پیش کش کی، آپ نے بھی اسے قبول کیا اور ان کے ساتھ شادی کی اور اس کے بعد بھی برسوں تک اپنی شریک حیات کے ساتھ تجارت میں مشغول رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس برس تک لوگوں میں عام زندگی بسر کرتے تھے اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ آپ پسندیدہ اخلاق کے مالک تھے اور دوسرے لوگوں کے مانند بد کرداری میں آلودہ نہیں تھے۔ آپہیں ظلم، سنگدلی اور جاہ طلبی کا شائبہ تک نہیں تھا، اس وجہ سے لوگوں میں محترم اور قابل اعتماد تھے۔ جب عربوں نے خانہ کعبہ کی مرمت کرنا چاہی اور حجر اسود کو نصب کرنے کے بارے میں عرب قبائل کے درمیان اختلاف اور جھگڑا پیدا ہوا تو انہوں نے آنحضرت کو حکم قرار دیا اور آپ کے حکم سے ایک عبا کو پھیلا کر حجر اسود کو اس میں رکھا گیا اور قبائل کے سرداروں نے عبا کے اطراف کو پکڑ کر اٹھایا اور آئے اپنے ہاتھوں سے حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب فرمایا اور اس طرح قبائل کے درمیان کشمکش، لڑائی جھگڑا اور احتمالی خونریزی کا خاتمہ ہوا۔ آنحضرت بیٹھتے پہلے اگرچہ خدائے یکتا کی پرستش کرتے تھے اور بت پرستی سے اجتناب کرتے تھے، لیکن بت پرستی کے عقائد سے مقابلہ نہیں کرتے تھے اس لئے لوگ آپ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ اس زمانے میں دوسرے ادیان کے پیرو جیسے یہود و نصاریٰ بھی عربوں میں محترمانہ طور پر زندگی گزارتے تھے اور اعراب ان کے لئے بھی کوئی مزاحمت ایجاد نہیں کرتے تھے۔

بحیرا احب کا قصہ

جن دنوں آنحضرت اپنے چچا حضرت ابو طالب کے ہاں زندگی بسر کر رہے تھے اور ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے، ان دنوں حضرت ابو طالب تجارت کی غرض سے شام گئے اور آنحضرت کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک بڑا قافلہ تھا، کافی مال تجارت کے ساتھ لوگوں کی

ایک بڑی تعداد تھی قافلہ سرزمین غام میں داخل ہوا اور شہر بصری میں پہنچا ایک دیر کے قریب پڑاؤ ڈالا اور نیچے نصب کر کے آرام کرنے لگے۔ ایک راہب جس کا لقب ”بھیرا“ دیر سے باہر آیا اور قافلہ کی دعوت کی، سب نے بھیرا کی دعوت قبول کی اور دیر میں گئے۔ حضرت ابو طالب بھی آنحضرت کو سامان کے پاس بیٹھا کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بھیرا کی دعوت پر گئے۔ بھیرا نے پوچھا کیا سب آگئے؟ ابو طالب نے کہا: سب سے چھوٹے ایک نوجوان کے علاوہ سب لوگ آگئے ہیں۔

بھیرا نے کہا: اے بھی لے کے آئیے۔ آنحضرت تینوں کے ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے، حضرت ابو طالب نے آپ کو بلایا اور ابھی راہب کے پاس آگئے۔ بھیرا نے آنحضرت پر ایک گرمی نظر ڈالنے کے بعد کہا: میرے قریب آ جاؤ، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آنحضرت کو ایک طرف لے گیا۔ حضرت ابو طالب بھی ان کے پاس گئے۔ بھیرا نے آنحضرت سے کہا: آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اور تم کو لات وعزی کی قسم دیتا ہوں کہ جواب ضرور دینا۔ (لات وعزی دو بتوں کے نام ہیں کہ جن کی مکہ کے لوگ پرستش کرتے تھے) آنحضرت نے فرمایا: سب سے زیادہ میں ان دونوں بتوں سے نفرت کرتا ہوں۔ بھیرا نے کہا: تم کو خدا نے یکتا کی قسم دیتا ہوں سچ کہنا۔ آتے فرمایا: میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہوں آپ اپنا سوال کیجئے۔

بھیرا نے پوچھا: کس چیز کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا: تنہائی کو۔ بھیرا نے پوچھا: کس چیز پر زیادہ نظر ڈالتے ہو اور اسے دیکھنا پسند کرتے ہو؟ آتے نے فرمایا: آسمان اور اس میں موجود ستاروں کو۔ بھیرا نے پوچھا: کیا سوچ رہے ہو؟ آنحضرت نے خاموشی اختیار کی لیکن بھیرا بغور اور سنجیدگی کے ساتھ آپ کی پیشانی کو دیکھتا رہا۔ بھیرا نے کہا: کس وقت اور کس فکر میں سوتے ہو؟ آتے نے فرمایا: اس وقت جب آنکھیں آسمان پر جائے ہوتا ہوں اور ستاروں کو دیکھتا ہوں، انہیں اپنی آغوش میں اور خود کو ان کے اوپر پاتا ہوں۔ بھیرا نے کہا: کیا خواب بھی دیکھتے ہو؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں، جو خواب میں دیکھتا ہوں، اے بیداری میں بھی دیکھتا ہوں۔ بھیرا نے کہا: مثلاً، خواب میں کیا دیکھتے ہو؟ آنحضرت نے خاموشی اختیار کی اور بھیرا بھی خاموش رہا۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد

بحیرا نے پوچھا: کیا میں آپ کے دونوں شانوں کے درمیان دیکھ سکتا ہوں؟ آنحضرتؐ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولے: آؤ اور دیکھ لو۔ بحیرا اپنی جگہ سے اٹھا، آپ کے قریب آیا، آنحضرتؐ کے شانوں سے لباس ہٹایا، ایک سیاہ تل نظر آیا، ایک نظر ڈال کر زیر لب بولا: وہی ہے! ابو طالب نے پوچھا: کون ہے؟ کیا کہتے ہو؟ بحیرا نے کہا: ایک علامت جس کی ہماری کتابوں میں خبر دی گئی ہے۔ ابو طالب نے پوچھا: کون سی علامت؟ بحیرا نے دریافت کیا: اس جوان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟ ابو طالب چونکہ آپ کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے، اس لئے بولے: یہ میرا بیٹا ہے۔ بحیرا نے کہا: نہیں، اس جوان کا باپ مرچکا ہونا چاہئے۔ ابو طالب نے پوچھا: تم کیسے جانتے ہو؟ جی ہاں، یہ جوان میرا بھتیجا ہے! بحیرا نے ابو طالب سے کہا: سن لو، اس جوان کا مستقبل اتنا درخشاں اور حیرت انگیز ہے، کہ جو میں نے دیکھا ہے اگر اسے دوسرے دیکھ لیں گے اور اسے پہچان لیں گے تو اسے قتل کر ڈالیں گے، اسے دشمنوں سے مٹھی رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا۔ ابو طالب نے کہا: بتاؤ وہ کون ہے؟ بحیرا نے کہا: اس کی آنکھوں میں ایک عظیم پیغمبر کی علامت اور اس کی پشت پر اس کی واضح نشانی ہے۔

نظور راہب کا قصہ

چند برسوں کے بعد آنحضرتؐ حضرت خدیجہ کبریٰ کی تجارت کے کارندے کی حیثیت سے ان کا مال لیکر دوبارہ شام گئے۔ حضرت خدیجہ نے میسرہ نامی اپنے ایک غلام کو آپ کے ہمراہ بھیجا اور اس سے تاکید کی کہ مکمل طور پر آپ کی اطاعت کرے۔ اس سفر میں بھی جب قافلہ شام کی سرزمین پر پہنچا، تو شہر بصری کے نزدیک ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا، وہاں قریب میں نظور نامی ایک راہب کی عبادت گاہ تھی، جسے میسرہ پہلے سے جانتا تھا۔ نظور نے میسرہ سے پوچھا: درخت کے نیچے سویا ہوا کون ہے؟ میسرہ نے کہا: قریش سے ایک مرد ہے۔ راہب نے کہا: اس درخت کے نیچے اب تک کوئی نہیں ٹھہرا ہے اور نہ ٹھہرے گا، مگر یہ کہ خدا کے پیغمبروں میں سے ہو۔ اس کے بعد پوچھا: کیا اس کی آنکھوں میں سرخی ہے؟ میسرہ نے کہا: جی ہاں، اس کی آنکھیں

ہمیشہ اسی حالت میں ہوتی ہیں۔ راہب نے کہا: یہ وہی ہے اور وہ خدا کے پیغمبروں میں سے آخری پیغمبر ہے، کاش میں اس دن کو دیکھتا، جس دن وہ دعوت پر مامور ہوں گے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر میں، جنہیں خدائے متعال نے لوگوں کی ہدایت کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔ چودہ سو سال پہلے، عالم بشریت ایک ایسی حالت سے گزر رہی تھی کہ جب دین اور توحید کا صرف نام باقی تھا۔ لوگ یکتا پرستی اور خدا شناسی سے بالکل دور ہو چکے تھے۔ معاشرے سے انسانیت کے آداب اور عدالت ختم ہو چکی تھی۔ جزیرہ نمائے عرب، میں خانہ خدا اور دین ابراہیم کا مرکز ہونے کے باوجود، کعبہ شریف بت خانہ میں اور دین ابراہیم بت پرستی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ عربوں کی زندگی، قبیلوں پر مشتمل تھی، یہاں تک کہ چند شر جو حجاز اور یمن وغیرہ میں تھے، اسی ترتیب سے چلائے جاتے تھے۔ دنیائے عرب بدترین حالات سے گزر رہی تھی تہذیب و تمدن کے بجائے ان میں بے حیائی، عیاشی، شراب نوشی اور جوا کھیلنا رائج تھا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا۔ لوگوں کی زندگی اکثر چوری، ڈاکہ زنی، قتل اور مال مویشوں کو لوٹ کر چلائی جاتی تھی۔ ظلم و ستم اور خونریزی کو سب سے بڑا فخر سمجھا جاتا تھا۔ خدائے متعال نے ایسے ماحول میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا کی اصلاح اور رہبری کے لئے مبعوث فرمایا اور قرآن مجید کو آپس نازل کیا۔ جس میں حق شناسی کے معارف، انصاف کے نفاذ کے طریقے اور مفید نصیحتیں موجود ہیں، اور آنحضرتؐ کو مامور فرمایا تاکہ آسمانی سند سے لوگوں کو انسانیت اور حق پیروی کرنے کی دعوت دیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت سے پہلے بت پرستی کے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باوجود کبھی بتوں کی تعظیم میں سر تسلیم خم نہیں کیا اور ہمیشہ خدائے یکتا کی پرستش کرتے رہے، کبھی مکہ کے نزدیک واقع غار حرا میں جاتے تھے اور لوگوں کے شور و غوغا سے دور اپنے پروردگار سے مناجات کرتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عمر شریف کے چالیس سال گزارنے کے بعد پروردگار عالم کی طرف سے مقام رسالت و پیغمبری پر مبعوث ہوئے تو قرآن مجید کا پہلا سورہ (اقرأ باسم

رہک (آپہر نازل ہوا اور آپلوگوں کی دعوت و تبلیغ پر مامور ہوئے۔ ابتدائی مرحلہ میں جو ماموریت ذمہ داری آپ پر تھی وہ یہ تھی کہ دعوت کو محض طور پر شروع کریں۔

سب سے پہلے جو شخص آپہر ایمان لایا وہ حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام تھے، وہ آپ کے گھر میں زندگی بسر کرتے تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ان کی تربیت فرماتے تھے، حضرت علیؑ کے بعد حضرت خدیجہ کبریٰ سلام اللہ علیہا نے اسلام قبول کیا۔ ایک مدت تک یہ دونوں آنحضرتؐ کے ساتھ نماز پڑھتے رہے جبکہ اس وقت دوسرے لوگ شرک و کفر میں زندگی بسر کر رہے تھے کچھ دنوں کے بعد تھوڑے سے لوگ آنحضرتؐ پر ایمان لائے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین سال کے بعد خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اعلانیہ طور پر دعوت دیں اور اپنے رشتہ داروں سے اس کا آغاز کریں۔ آنحضرتؐ نے اس حکم کے مطابق اپنے تمام رشتہ داروں کو جمع کیا اور ان کے سامنے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور یہ بشارت دی کہ جو بھی ان میں سب سے پہلے آپ کی دعوت کو قبول کرے گا وہی آپ کا جانشین ہوگا آئیں اس اعلان کو تین بار دوہرایا لیکن ان میں سے کسی نے قبول نہیں کیا، بلکہ ہر بار صرف حضرت علیؑ علیہ السلام اٹھے اور آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہل کو قبول کیا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور ان کو اپنا جانشین بنانے کا وعدہ کیا۔ آخر میں ان لوگوں نے کھڑے ہو کر نبی اڑاتے ہوئے حضرت ابوطالب سے مخاطب ہو کر کہا: ”اس کے بعد تمہیں اپنے فرزند کی اطاعت کرنی چاہئے“ پھر وہ لوگ چلے گئے۔ اسکے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانیہ طور پر عام دعوت کا آغاز کیا، لیکن لوگوں سے شدید، سخت، عجیب اور ناقابل برداشت مقابلہ کرنا پڑا۔ مکہ کے لوگ اپنے وشیانہ مزاج اور اپنی بت پرستی کی عادت کی وجہ سے دشمنی اور ضد پر اتر آئے اور آنحضرتؐ اور آپ کے پیروؤں کو جہانی اذیت پہنچانے، مضحکہ اور توہین کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے اور ہر روز اپنی بیوقوفی اور سختی میں اضافہ کرتے تھے۔ بتنا لوگوں کی طرف سے سختی اور دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، اتنا ہی آنحضرتؐ کی دعوت میں صبر و استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور اسلام کے پیروؤں میں تدریجاً اضافہ ہوتا رہا

لہذا کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لالچ دینا شروع کیا کہ انہیں کافی مال و دولت دیں گے یا انہیں حاکم کے طور پر منتخب کریں گے تاکہ وہ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں یا صرف اپنے خدا کی طرف دعوت دیں اور ان کے خداؤں کو نہ چھیڑیں۔

لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تجویز کو ٹھکرا دیا اور اس خدائی فریضہ کو انجام دینے اور دعوت کو جاری رکھنے کے اپنے مستحکم عزم و ارادے کا اعلان کیا۔ کفار جب طمع و لالچ کے راستے سے ناامید ہو گئے تو انہوں نے دوبارہ اپنے دباؤ میں اضافہ کیا اور مسلمانوں کو سخت جسمانی اذیتیں تکلیفیں پہنچانے لگے اور کبھی ان میں سے کچھ کو قتل کرتے تھے تاکہ انہیں اسلام سے روک سکیں۔ کفار نے قبیلہ بنی ہاشم کے سردار حضرت ابوطالب کے لحاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے سے اجتناب کیا، لیکن یہ لحاظ دوسری اذیتوں اور تکلیفوں کو روک نہ سکا۔ ایک مدت کے بعد مسلمانوں کا عرصہ حیات اور تنگ ہو گیا اور ظلم و ستم اپنی انتہا کو پہنچ گیا حال یہ ہو گئی تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو جشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دیدی تاکہ کچھ دنوں تک آرام کی سانس لے لیں۔ ایک جماعت نے حضرت علیؑ کے بھائی حضرت جعفر بن ابیطالب کی سرکردگی میں اپنے اہل و عیال کے ہمراہ جشہ کی طرف ہجرت کی (جعفر پیغمبر اکرم کے منتخب صحابیوں میں سے تھے)۔ کفار مکہ جب مسلمانوں کی ہجرت سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے اپنے دو تجربہ کار افراد کو کافی مقدار میں تحفہ و تحائف کے ساتھ جشہ کے بادشاہ کے پاس بھیجا، اور انہوں نے بادشاہ سے مکہ کے مہاجرین کو واپس بھیجنے کا تقاضا کیا، لیکن جعفر بن ابیطالب نے اپنے بیانات سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سراپا نورانی شخصیت اور اسلام کے بلند اصولوں کی جشہ کے بادشاہ، مہمبی پادریوں اور ملک کے حکام کے سامنے تشریح کی اور سورہ مریم کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی۔

حضرت جعفر بن ابیطالب کا حق پر مبنی یہ بیان ایسا دلچسپ و موثر تھا کہ بادشاہ اور مجلس میں موجود تمام لوگوں نے آنسو بہائے۔ نتیجہ میں بادشاہ نے کفار مکہ کے تقاضا کو مسترد کیا اور ان کے بھیجے ہوئے تحفوں کو واپس کر دیا اور حکم دیا کہ مسلمان مہاجرین کے آرام و آسائش کے تمام امکانات فراہم کئے جائیں۔ کفار مکہ نے اس روئداد کے بعد آپس میں معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم، جو پیغمبر اسلام کے رشتہ

دار تھے، اور ان کے حامیوں کے ساتھ قطع تعلق کر کے مکمل طور پر سوشل بائیکاٹ کریں، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک عہد نامہ لکھا اور عام لوگوں سے دستخط لے کر اسے کعبہ میں رکھا۔ بنی ہاشم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مکہ سے باہر جانے پر مجبور ہوئے اور شعب ابو طالب نامی کے ایک درہ میں پناہ لی اور انتہائی سختی اور بھوک میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اس مدت کے دوران کسی نے شعب ابو طالب سے باہر آنے کی جرات تک نہیں کی، دن میں شدید گرمی اور رات کو عورتوں اور بچوں کی فریادوں سے دست و گریبان تھے۔ کفار تین سال کے بعد عہد نامہ کے محو ہونے اور بہت سے قبائل کی طرف سے ملامتوں کے نتیجے میں اپنے معاہدہ سے دست بردار ہوئے اور بنی ہاشم کا محاصرہ ختم ہوا، لیکن انہی دنوں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تنہا حامی حضرت ابو طالب اور آنحضرتؐ شریک حیات حضرت خدیجہ کبریٰ کا انتقال ہو گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اور مشکل ہو گئی۔ آپہیں یہ طاقت نہیں رہی کہ لوگوں کے درمیان جائیں یا خود کو کسی کے سامنے ظاہر کریں یا کسی خاص جگہ پر رہیں۔ یہاں تک کہ آپؐ کی جان کی کوئی حفاظت نہیں تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طائف کی طرف سفر جس سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بنی ہاشم شعب ابو طالب کے محاصرہ سے باہر آئے، وہ بعثت کا تیرھواں سال تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہی دنوں شہر طائف کی طرف سفر کیا۔ (طائف مکہ سے تقریباً سو کلومیٹر کی دوری پر ایک شہر ہے) آتے طائف کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی، لیکن اس شہر کے جاہل ہر طرف سے آپہر حملہ آور ہوئے اور آپکو برا بھلا کہا، سنگسار کیا اور آخر کار آنحضرتؐ کو شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف سے مکہ لوٹے اور کچھ مدت تک مکہ میں رہے، چونکہ وہاں پر جان کی کوئی حفاظت نہیں تھی، اس لئے لوگوں کے درمیان نہیں آتے تھے۔ کفار مکہ کے سردار اور بزرگ شیع رسالت کو گل کرنے کی خاطر مناسب فرصت کو دیکھتے ہوئے، دار الندوہ۔ جو مجلس شوری کے مانند تھا۔ میں جمع ہوئے اور ایک مخفیانہ مٹینگ میں آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا آخری منصوبہ بنایا۔ مذکورہ منصوبہ یہ تھا کہ قبائل عرب کے ہر قبیلہ سے ایک شخص کو چن لیا جائے اور تمام منتخب افراد ایک ساتھ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پر حملہ کر کے

آپ کو قتل کر ڈالیں۔ اس منصوبہ میں تمام قبائل کو شریک کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آنحضرتؐ کا قبیلہ بنی ہاشم آپ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے قیام نہ کر سکے اور قتل کا منصوبہ بنانے والوں سے نہ لڑ سکے۔ اور اسی طرح بنی ہاشم میں سے ایک آدمی کو شریک کر کے قبیلہ بنی ہاشم کی زبان مکمل طور پر بند کر دی۔ اس فیصلے کے مطابق، مختلف قبائل کے تقریباً چالیس افراد آنحضرتؐ کے قتل کے لئے منتخب ہوئے، انہوں نے رات کے اندھیرے میں آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کیا، حملہ آور سحر کے وقت گھر میں داخل ہوئے تاکہ منصوبہ کو عملی جامہ پہنائیں، لیکن ارادۃ الہی ان کے ارادہ سے بلند ہے، کہ جس سے ان کے منصوبہ پر پانی پھر گیا۔ خدائے متعال نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کئی اور کفار کے منصوبہ سے آگاہ فرمایا اور حکم فرمایا کہ راتوں رات مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ کی روداد سے حضرت علی علیہ السلام کو آگاہ فرمایا اور حکم دیا کہ رات کو آپ کے بستر پر سو جائیں اور ان سے کچھ وصیتیں لیں اور رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلے راستے میں حضرت ابو بکر کو دیکھا، انھیں بھی اپنے ساتھ مدینہ لے کر گئے۔ مدینہ کے کچھ بزرگ آنحضرتؐ کی ہجرت سے پہلے مکہ آکر آپؐ سے ملاقات کی اور آپؐ پر ایمان لائے تھے اور ضمناً ایک عہد نامہ لکھا تھا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں تو وہ ان کی حمایت میں ایسے ہی دفاع کریں گے جیسا وہ اپنی جان و عزت کا دفاع کرتے ہیں۔

مدینہ کے یہودیوں کی بشارت

یہودیوں کے بہت سے قبیلوں نے آنحضرتؐ کے اوصاف اور آپؐ کی جگہ کے بارے میں اپنی کتابوں میں پڑھا تھا اور اپنے وطن کو ترک کر کے جازا کر مدینہ اور اس کے اطراف میں پڑاؤ ڈالا تھا اور نبی امی کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔ چونکہ وہ لوگ دولت مند تھے، اس لئے اعراب کبھی کبھی ان پر حملہ کر کے ان کے مال و دولت کو لوٹ لیتے تھے۔ یہودی ہمیشہ مظلومیت کے عالم میں ان سے مخاطب ہو کر کہتے تھے: ”ہم تم لوگوں کے ظلم و ستم پر یہاں تک صبر کریں گے کہ نبی امی مکہ سے ہجرت کر کے اس علاقہ میا جائیں، اس دن ہم آنحضرتؐ پر ایمان لا کر تم لوگوں سے انتقام لیں گے“۔ اہل مدینہ کے فوراً ایمان لانے کے اہم عوامل میں سے ایک ان

ہی بشارتوں کا ان کے ذہنوں پر اثر تھا، آخر کار وہ لوگ ایمان لے آئے۔ لیکن یہودیوں نے قومی تعصب کی بنا پر ایمان لانے سے گریز کیا۔

نبی کی بشارتوں کی طرف قرآن مجید کا اشارہ

خدا نے تعالٰیٰ اپنے کلام پاک میں کئی جگہوں پر ان بشارتوں کی طرف اشارہ فرماتا، بالخصوص اہل کتاب کے ایک گروہ کے ایمان کے بارے میں فرماتا ہے۔ (الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَ سَمِيعِ النَّبِيِّينَ وَالنَّبِيُّ الَّذِي يَأْتِي بِنُورٍ مِّنَ اللَّهِ يُبَيِّنُ لِنَاسٍ مَّا كَانَتْ تَرْتَابُ عَلَيْهِمْ) ”جو لوگ کہ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہو جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھا دیتا ہے“۔ ”مزید فرماتا ہے: (وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ) ”... اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب آئی ہے جو ان کی توریت وغیرہ کی تصدیق بھی کرنے والی ہے اور اسکے پہلے وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اسی کے ذریعہ طلب فتح بھی کرتے تھے۔“

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ میں ورود اسلام کی ترقی کی زمین شریثرب جس کا بعد میں مدینہ نام رکھا گیا۔ میں ہموار ہوی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اہل مدینہ داخلی جنگ۔ جو برسوں سے اوس و خزرج نامی دو قبیلوں کے درمیان جاری تھی۔ سے تگ آچکے تھے، آخر کار وہ اس فکر میں تھے کہ اپنے لئے ایک بادشاہ کا انتخاب کر کے اس قتل و غارت کو ختم کریں۔ انہوں نے اس کام کے لئے اپنے چند معروف افراد کو مکہ بھیجا تاکہ اس سلسلہ میں مکہ کے سرداروں سے گفتگو کریں۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب مکہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو اعلانیہ طور پر شروع کیا تھا۔ مدینہ کی معروف شخصیتیں جب مکہ پہنچ گئیں اور

انہوں نے اپنے مقصد کو قریش کے سرداروں کے سامنے پیش کیا تو قریش کے سرداروں نے اس عذرو بہانہ سے ان کے ساتھ صلاح و مشورہ کرنے سے پہلو تکی کی کہ ایک مدت سے اس شہر میں محمدؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ہمارے مقدس خداؤں کو برا بھلا کہا ہے، اور ہمارے جوانوں کو گمراہ کیا ہے اور ہمیں فکر مند کیا ہے۔ اس بات کو سن کر اہل مدینہ ہل کر رہ گئے، کیونکہ انہوں نے مدینہ میں یہودیوں سے بارہا یہ پیشگوئی سنی تھی کہ مکہ میں نبی امیؐ ظہور کریں گے، لہذا ان کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر انھیں دیکھیں اور ان کی دعوت کی کیفیت سے آگاہ ہو جائیں۔ جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے اور آپؐ کے بیانات اور قرآن مجید کی آیات کو سنا تو وہ ایمان لے آئے اور آنحضرتؐ سے وعدہ کیا کہ اگلے سال مدینہ کے کچھ لوگوں کے ہمراہ آکر اسلام کی ترقی کے اسباب فراہم کریں گے۔ دوسرے سال مدینہ کے سرداروں کی ایک جماعت مکہ آئی رات کے وقت شہر سے باہر تنہائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور آپؐ کی بیعت کی اور مدینہ میں دین اسلام کو رائج کرنے کا عہد و پیمان کیا اور کہا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں تو وہ دشمنوں سے آپؐ کی اس طرح حفاظت و دفاع کریں گے جیسا وہ اپنے خاندان کا دفاع کرتے ہیں اس کے بعد یہ لوگ مدینہ لوٹے، اہل مدینہ میں سے اکثر لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اس طرح شہر مدینہ اسلام کا پہلا شہر بن گیا۔

لہذا جب انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف لانے کی خبر سنی تو وہ بہت خوشحال ہوئے اور انتہائی بے تابی کے ساتھ آنحضرتؐ کے استقبال کے لئے بڑھے اور آپؐ کا شایان شان استقبال کیا اور انتہائی خلوص نیت سے اپنی جان و مال کو اسلام کی ترقی کے لئے آپؐ کی خدمت میں پیش کیا اسی لئے ان کا نام ”انصار“ رکھا گیا۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے واقعہ اور انصار کی خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی قدر دانی کرتا ہے: (وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْأَيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يَجْعَلُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ) (تحریر ۹) اور جن لوگوں نے دار الحجرت اور ایمان کو ان سے پہلے اختیار کیا تھا وہ ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور جو کچھ انھیں دیا

گیا ہے اپنے دلوں میں اس کی طرف سے کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے ہیں اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں چاہے انہیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔“

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگوں کا ایک مختصر جائزہ

۱۔ جنگ بدر: آخر کار ۳ میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان پہلی جنگ سرزمین بدر میں ہوئی۔ اس جنگ میں کفار کے سپاہیوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی جو جنگی ساز و سامان اور اسلحہ سے مکمل طور پر لیس تھے اور مسلمانوں کے پاس ان کی نسبت ایک تہائی افراد تھے جو اچھی طرح سے مسلح بھی نہیں تھے۔ لیکن خدائے متعال کی عنایتوں سے اس جنگ میں مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور کفار کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں کفار کے ستر افراد مارے گئے، ان میں سے تقریباً نصف حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے قتل ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کے ستر آدمی اسیر کر لئے گئے اور باقی افراد تمام جنگی ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

۲۔ جنگ احد: ۳ ہجری میں کفار مکہ نے ابوسفیان کی سرکردگی میں تین ہزار افراد کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا اور احد کے بیابان میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ آمناسامنا ہوا۔ پیغمبر اسلام نے اس جنگ میں سات سو مسلمانوں کے ہمراہ کفار کے سامنے صف آرائی کی۔ جنگ کی ابتداء میں مسلمانوں کا پہلا بھاری تھا، لیکن کئی گھنٹوں کے بعد بعض مسلمانوں کی کوتاہی کی وجہ سے لشکر اسلام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور کفار نے ہر طرف سے مسلمانوں پر تلواروں سے وار کیا۔

اس جنگ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ تقریباً ستر اصحاب پیغمبر، جن میں اکثر انصار تھے، کے ساتھ شہید ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک زخمی ہوئی اور آپ کے سامنے کے دانتوں میں سے ایک دانت ٹوٹ گیا۔ ایک کافر نے آپ کے شانہ مبارک پر ایک ضرب لگا کر آواز دی: ”میں نے محمد کو قتل کر دیا“ اس کے نتیجے میں لشکر اسلام پر اگندہ ہوا۔

۔ صرف حضرت علی علیہ السلام چند افراد کے ہمراہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارد گرد آپ کی حفاظت کرتے ہوئے ثابت قدم رہے اور حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ سب شہید ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے آخر تک مقابلہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا۔ آخری وقت، اسلام کے فراری فوجی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد دوبارہ جمع ہوئے، لیکن دشمن کے لشکر نے اس قدر کامیابی کو غنیمت سمجھ کر جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا اور مکہ روانہ ہوئے۔ لشکر کفار چند فرسخ طے کرنے کے بعد اس بات پر غور کرنے کے بعد سخت پشیمان ہوئے کہ انہوں نے جنگ کو آخری فتح تک کیوں جاری نہ رکھا تاکہ مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کر کے ان کے اموال کو لوٹ لیتے۔ اس لئے مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ لیکن انہیں یہ خبر ملی کہ لشکر اسلام جنگ کو جاری رکھنے کے لئے ان کے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ اس خبر کو سن کر مرعوب ہوئے اور پھر سے مدینہ لوٹنے کا ارادہ ترک کر کے تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھ گئے۔

حقیقت بھی یہی تھی، کیوں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے مصیبت زدہ لوگوں کا ایک مسلح لشکر تیار کر کے حضرت علی علیہ السلام کی سرپرستی میں ان کے پیچھے روانہ کیا تھا۔ اس جنگ میں اگرچہ مسلمانوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا لیکن حقیقت میں یہ اسلام کے نفع میں ختم ہوئی خصوصاً اس لحاظ سے کہ دونوں طرف نے جب جنگ بندی کے معاہدہ پر اتفاق کیا تو اسی وقت طے پایا تھا کہ اگلے سال اسی وقت بدر میں پھر سے جنگ لڑیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ایک گروہ کے ساتھ وعدہ کے مطابق وقت پر بدر میں حاضر ہو گئے، لیکن کفار وہاں نہ پہنچے۔ اس جنگ کے بعد مسلمانوں نے اپنے حالات کو بہتر بنایا اور جزیرہ نمائے عرب میں مکہ اور طائف کے علاوہ تمام علاقوں میں پیش قدمی کی۔

۳۔ جنگ خندق: تیسری جنگ جو عرب کفار نے پیغمبر اسلام کے ساتھ لڑی، اور جو اہل مکہ کی رہبری میں آخری اور ایک زبردست جنگ تھی، اسے ”جنگ خندق“ یا ”جنگ احزاب“ کہتے ہیں۔ جنگ احد کے بعد مکہ کے سردار ابوسفیان کی سرکردگی میں اس فکر میں تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخری اور کاری ضرب لگا کر نور اسلام کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیں۔ اس کام کے

لئے عرب قبائل کو ابھارا اور اپنے تعاون اور مدد کے لئے دعوت دی۔ طوائف کے یہودی بھی اسلام کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے باوجود چوری چھپے اس آگ کو ہوا دے رہے تھے اور آخر کار اپنے عہد و پیمان کو توڑ کر کفار کے ساتھ تعاون کرنے کا کھل کر معاہدہ کیا۔ جس کے نتیجے میں ۵۵ھ میں قریش، عربوں کے مختلف قبائل اور طوائف کے یہودیوں پر مثل ایک بڑا اور سنگین لشکر تمام جنگی ساز و سامان سے لیس ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی دشمن کے اس منصوبے سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اس لئے آئے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ ایک طویل گفتگو اور صلاح و مشورہ کے بعد، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک معزز صحابی سلمان فارسی کی تجویز پر شہر مدینہ کے ارد گرد ایک خندق کھودی گئی اور لشکر اسلام نے شہر کے اندر پناہ لی۔ دشمن کی فوجیں جب مدینہ پہنچیں تو انھیں مدینہ کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیں ملا، مجبور ہو کر انہوں نے شہر مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا اور اسی صورت میں جنگ شروع کی۔ جنگ اور محاصرہ کچھ طولانی ہو گیا۔ اسی جنگ میں عرب کا نامور شجاع اور شہسوار عمرو بن عبدود، حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ آخر کار طوفان، سردی، محاصرہ کے طولانی ہونے، عربوں کی جنگی اور یہود و اعراب کے درمیان اختلاف کے نتیجے میں محاصرہ ختم ہوا اور کفار کا لشکر مدینہ سے چلا گیا۔

۴۔ جنگ خیبر: جنگ خندق کے بعد، جس کے اصلی محرک یہودی تھے جنہوں نے کفار عرب کا تعاون کر کے اعلانیہ طور پر اسلام کے ساتھ اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا، پیغمبر اسلام نے خدا کے حکم سے مدینہ میں موجود یہودی کے قبائل کی گوثالی اور تنبیہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ چند جنگیں لڑیں اور یہ سب جنگیں مسلمانوں کی فحیابی پر ختم ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم ”جنگ خیبر“ تھی۔ خیبر کے یہودیوں کے قبضہ میں چند مستحکم اور مضبوط قلعے تھے اور ان کے پاس جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد تھی، جو جنگی ساز و سامان سے لیس تھے۔ اس جنگ میں حضرت علی علیہ السلام نے یہودیوں کے نامور پہلوان ”مرحب“ کو قتل کر کے یہودیوں کے لشکر کو تہس نہس کر دیا اور اس کے بعد قلعہ پر حملہ کیا اور قلعہ کے صدر دروازے کو اکھاڑ دیا اور اس طرح اسلام کا لشکر قلعہ کے اندر داخل ہوا اور فتح و غفر کے پرچم کو قلعہ پر لہرایا۔ اسی جنگ میں، جو ۵۵ھ میں ختم ہوئی، جاز کے یہودیوں کا خاتمہ ہوا۔

بادشاہوں اور سلاطین کو دعوت اسلام

۴۔ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بادشاہوں، سلاطین اور فرمانرواؤں، جیسے: شاہ ایران، قیصر روم، سلطان مصر اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام چند خطوط تحریر فرمائے اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ نصرانیوں اور مجوسیوں کے ایک گروہ نے جزیہ دے کر امن سے رہنے کا وعدہ کیا اور اس طرح اسلام کے ذمہ میا گئے۔ آنحضرتؐ نے کفار مکہ سے جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کے جملہ شرائط میں یہ شرط بھی تھی کہ مکہ میں موجود مسلمانوں کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے اور اسلام کے دشمنوں کی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں مدد نہ کی جائے۔

لیکن کفار مکہ نے کچھ مدت کے بعد اس معاہدہ کو توڑ دیا، جس کے نتیجے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۲ھ میں دس ہزار کے ایک لشکر کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا۔ مکہ کسی جنگ، خونریزی اور مزامحت کے بغیر فتح کیا اور خانہ کعبہ کو، توں سے صاف کیا۔ عام معافی کا اعلان فرمایا۔ مکہ کے سرداروں کو، جنہوں نے بیس سال کے عرصہ میں آئے کافی دشمنی کی تھی اور آپ کے اور آپ کے اصحاب کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔ اپنے پاس بلایا اور کسی قسم کی شدت، برے سلوک اور سختی کے بغیر نہایت مہربانی اور لطف و کرم سے انھیں معاف فرمایا۔

۵۔ جنگ حنین: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کرنے کے بعد، اس کے اطراف منجملہ شہر طائف کو فتح کرنے کے لئے اقدام کیا اور اس سلسلہ میں عربوں سے متعدد جنگیں لڑیں کہ ان میں سے ایک ”جنگ حنین“ ہے۔ ”جنگ حنین“، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہم جنگوں میں سے ہے۔

یہ جنگ فتح مکہ کے کچھ ہی دنوں بعد حنین میں قبیلہ حوازن سے ہوئی۔ لشکر اسلام نے دو ہزار سپاہیوں سے حوازن کے کئی ہزار سواروں کا مقابلہ کیا اور ان کے درمیان ایک گھسان کی جنگ ہوئی۔ حوازن نے جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو بری طرح شکست

دیدیں یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام کہ جن کے ہاتھ میں اسلام کا پرچم تھا، جو پیغمبر اسلام کے آگے آگے لڑ رہے تھے اور چند گئے چنے افراد کے علاوہ سب بھاگ گئے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ہی پہلے انصار اور پھر دوسرے مسلمان دوبارہ میدان کارزار کی طرف واپس لوٹے اور ایک شدید اور سخت جنگ لڑی اور دشمن کو تیس ہس کر کے رکھ دیا۔ اس جنگ میں دشمن کے پانچ ہزار سپاہی لشکر اسلام کے ہاتھوں اسیر ہوئے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر مسلمانوں نے تمام اسیروں کو آزاد کر دیا، صرف چند افراد ناراض تھے کہ آنحضرت نے ان کے حصے میں آئے افراد کو پیسے دیکر خرید لیا اور پھر انہیں آزاد کر دیا۔

۶۔ جنگ تبوک: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۹ ہجری میں قیصر روم سے جنگ کرنے کی غرض سے تبوک پر لشکر کشی کی (تبوک شام اور حجاز کی سرحد پر ایک جگہ ہے) کیونکہ افواج پھیلی تھی کہ قیصر روم نے اس جگہ پر رومیوں اور اعراب کے ایک لشکر کو تشکیل دیا ہے۔ جنگ موتہ بھی اس کے بعد رومیوں کے ساتھ وہیں پر لڑی گئی جس کے نتیجے میں جعفر بن ابیطالب، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ جیسے اسلامی فوج کے سردار شہید ہوئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ تبوک پر حملہ کیا لیکن اسلامی لشکر کے پہنچنے پر وہاں موجود افراد بھاگ گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین دن تبوک میں ٹھہرے۔ اس کے اطراف کی پاک سازی کرنے کے بعد واپس مدینہ لوٹے۔

اسلام کی دوسری جنگیں: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ جنگوں کے علاوہ مدینہ منورہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران تقریباً اسی چھوٹی بڑی جنگیں لڑی ہیں، جن میں سے ایک چوتھائی جنگوں میں آہستہ بذات خود شرکت فرمائی۔

آنحضرت نے جن جنگوں میں شرکت فرمائی، دوسرے کمانڈروں کے برخلاف کہ وہ پناہ گاہ میں بیٹھ کر فرمان جاری کرتے ہیں، آپ بذات خود سپاہیوں کے شانہ بہ شانہ لڑتے تھے، لیکن کسی کو ذاتی طور پر قتل کرنے کا آپ کے لئے کبھی اتفاق پیش نہیں آیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مغوی شخصیت کا ایک جائزہ

مستند تاریخی اسناد کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جو جہالت، فساد اور خلاقی برائیوں کے لحاظ سے بدترین ماحول تھا۔ آہٹے ایک ایسے ہی ماحول میں کسی تعلیم و تربیت کے بغیر اپنے بچپن اور جوانی کے ایام گزارے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگرچہ ہرگز بت پرستی نہیں کی اور خلاف انسانیت کاموں میں آلودہ نہیں ہوئے، لیکن آپا یسے لوگوں میں زندگی گزار رہے تھے کہ کسی بھی صورت میں آپ کی زندگی سے اس قسم کے روشن مستقبل کا اشارہ تک نہیں ملتا تھا، سچ یہ ہے کہ ایک غریب و نادار یتیم اور کسی سے تعلیم و تربیت حاصل نہ کرنے والے شخص سے یہ سب برکتیں قابل یقین نہیں تھیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی حالت میں ایک زمانہ گزارا، یہاں تک کہ انہی راتوں میں سے ایک رات کو جب آپ اپنے آرام ضمیر اور خالی ذہن کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے، اچانک اپنے آپ کو ایک دوسری شخصیت میں پایا۔ آپکی پوشیدہ باطنی شخصیت ایک آسمانی شخصیت میں تبدیل ہو گئی، انسانی معاشرے کے ہزاروں سال پہلے کہ انھار کو خرافات سمجھا اور دنیا والوں کی روش اور دین کو اپنی حقیقت پسندانہ نگاہوں سے ظلم و ستم کے روپ میں دیکھا۔

دنیا کے ماضی اور مستقبل کو آپس میں جوڑ دیا، سعادت بشری کی راہ کی تشخیص کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ اور کان نے حق و حقیقت کے علاوہ نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ سنا، آپ کی زبان کلام خدا سے پیغام آسمانی اور حکمت و موعظہ کے لئے کھل گئی، اندرونی ضمیر جو تجارت، لین دین اور روزہ مرہ کی مصلحتوں میں سرگرم تھا، وہ دل و جان سے دنیا اور دنیا والوں کی اصلاح اور بشر کی ہزاروں سال کی گمراہی اور ظلم و ستم کو ختم کرنے پر اتر آیا اور حق و حقیقت کو زندہ کرنے کے لئے تنہا قیام کیا اور دنیا کی وحشتناک متحد مخالف طاقتوں کی کوئی پروا نہ کی معارف الہیہ کو بیان کیا اور کائنات کے تمام حقائق کا سرچشمہ خالق کائنات کی وحدانیت کو سمجھا۔ انسان کے اعلیٰ اخلاق کی بہترین تشریح فرمائی اور ان کے روابط کو کشف اور واضح کیا، جو بیان فرماتے تھے خود دوسروں سے پہلے

اس کے قائل ہوتے تھے اور جس چیز کی ترضیب فرماتے تھے، پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے۔ شریعت اور احکام، جو عبادتوں اور پرستشوں کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہیں، وہ خدائے یکتا کی عظمت و کبریائی کے سامنے بندگی کو ایک اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ عدلیہ اور تعزیرات سے متعلق دوسرے قوانین بھی لائے کہ جو انسانی معاشرے کے تمام ضروری مسائل کا اطمینان بخش جواب دیتے ہیں، وہ ایسے قوانین ہیں جو آپس میں مکمل طور پر ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور توحید، انسانی احترام و عالی اخلاق کی بنیاد پر استوار و پائدار ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی عبادات و معاملات پر مشتمل قوانین کا مجموعہ، اس قدر وسیع اور جامع ہے کہ عالم بشریت میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام مسائل موجود ہیں اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پیش آنے والی گوناگوں ضرورتوں کی تحقیق کر کے تشخیص کا حکم دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دین کے قوانین کو عالمی اور ابدی جانتے ہیں، یعنی آپکا اعتقاد ہے کہ آپ کا دین تمام انسانی معاشروں کی دنیوی و اخروی ضرورتوں کو ہر زمانے میں پورا کر سکتا ہے، اور لوگوں کو اپنی سعادت کے لئے اسی روش کو اختیار کرنا چاہئے۔

البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو بحث اور مطالعہ کے بغیر نہیں فرمایا ہے بلکہ خلقت کی تحقیق اور عالم انسانیت کے مستقبل کی پیشنگوئی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ: اولاً: اپنے قوانین اور انسان کی جسمی اور روحی خلقت کے درمیان مکمل توافق و ہم آہنگی کو واضح کر دیا۔ ثانیاً: مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور مسلمانوں کے معاشرے کو پہنچنے والے نقصانات کو مکمل طور پر مد نظر رکھنے کے بعد اپنے دین کے احکام کے ابدی ہونے کا حکم فرمایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو پیشنگویاں قطعی دلیلوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں، ان کے مطابق آپ نے اپنی رحلت تک کے عمومی حالات کی تشریح فرمائی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان معارف کے اصولوں اور شرائط کو پراکندہ طور پر قرآن مجید میں لوگوں کے لئے تلاوت فرمائی ہیں کہ اس کی حیرت انگیز فصاحت و بلاغت نے عرب دنیا کے فصاحت و بلاغت کے اساتذہ اور ماہروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور دنیا کے دانشمندیوں کے انکار کو متحیر کر کے رکھ دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام کارناموں کو ۲۳ سال کے عرصہ میں انجام دیا ہے کہ جن میں سے ۳ سال جہانی اذیت، اور کفار مکہ کی ناقابل برداشت مزاحمتوں میں گزارے اور باقی دس سال بھی جنگ، فکد کشی، کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ بیرونی مقابلہ اور منافقین اور روڑے اٹھانے والوں کے ساتھ اندرونی مقابلہ اور مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور سنبھالنے میں اور ان کے عقائد و اخلاق و اعمال اور ہزاروں دوسری مشکلات کی اصلاح کرنے میں گزارے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پورا راستہ ایک ایسے غیر متزلزل ارادہ سے طے کیا، جو حق کی پیروی اور اسے زندہ کرنے کے لئے تھا۔ آپ کی حقیقت پسندانہ نظر صرف حق پر ہوتی تھی اور خلاف حق کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اگر کسی چیز کو اپنے منافع کے یا میلانات اور اپنے عمومی جذبات کے موافق پاتے تھے تو ان میں سے جس کو حق جانتے اسے قبول فرماتے اور اسے مسترد نہیں کرتے تھے اور جس کو باطل سمجھتے تھے اسے مسترد کر دیتے اور ہرگز قبول نہیں کرتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی معنوی شخصیت

اگر ہم انصاف سے مذکورہ مطالب پر تھوڑا سا غور و خوص کریں گے، تو کسی شک و شبہ کے بغیر یہ قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ان حالات اور ماحول میں ایسی شخصیت کا پیدا ہونا معجزہ اور خدائے متعال کی خاص تائید کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس لحاظ سے، خدائے متعال اپنے کلام پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امی ہونے، یتیمی اور سابقہ مفلسی کے بارے میں یاد دہانی کراتا ہے، اور ان کو عطا کی گئی شخصیت کو ایک آسمانی معجزہ شمار کرتا ہے اور اسی سے آپ کی دعوت کی حقانیت کا استدلال کرتا ہے چنانچہ فرماتا

ہے: (الم بجدک یتما فآوی * و وجدک ضالاً فمدی * و وجدک عائلاً فاعنی^۱) ”کیا اس نے تم کو یتیم پا کر پناہ نہیں دی ہے؟ اور کیا تم کو گم گشتہ پا کر منزل تک نہیں پہنچایا ہے؟ اور تم کو تنگ دست پا کر غنی نہیں بنایا ہے؟“ (وما کنتم تسئلوا من قبلہ من کتاب ولا تحفظہ بینکم^۲) ”اور اے پیغمبر! آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے“۔

(وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتو بسورۃ من مثله^۳) ”اگر تمہیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کا جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ“۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت

تہا اصل جس پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے اپنے دین کی بنیاد رکھی اور اسے دنیا والوں کے لئے سعادت کا سبب قرار دیا، وہ توحید کی اصل ہے۔ توحید کی اصل کے مطابق جو خالق کائنات پرستش کا سزاوار ہے وہ خدائے یکتا ہے، اور خدائے متعال کے علاوہ کسی اور کے لئے سر تعظیم خم نہیں کیا جاسکتا۔

اس بنا پر، انسانی معاشرہ میں جو روش عام ہونی چاہئے، وہ یہ ہے کہ سب آپس میں متحد اور بھائی بھائی ہوں اور کوئی اپنے لئے خدا کے سوا کسی کو بلا قید و شرط حاکم مطلق قرار نہ دے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سوائے بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشکر بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ^۴) ”اے پیغمبر! آپ کہیں کہ اہل کتاب! آؤ ایک منصفانہ کلمہ پر اتفاق کر لیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں“۔ اس آسمانی حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سیرت میں سبھی کو برابر و برابر قرار دیتے تھے اور احکام وحدود الہی کے

^۱ ضحیٰ ۸، ۶

^۲ عنکبوت ۴۸

^۳ بقرہ ۲۳

^۴ آل عمران ۶۴

نفاذ میں ہرگز امتیازی سلوک اور استثنا کے قائل نہیں تھے، اس طرح اپنے اور پرانے طاقت ور اور کمزور، امیر و غریب اور مرد اور عورت میں فرق نہیں کرتے تھے اور ہر ایک کے حق کو دین کے احکام و قوانین کے مطابق اس تک پہنچاتے تھے۔

کسی کو کسی دوسرے پر حکم فرمائی اور فرمانروائی اور زبردستی کرنے کا حق نہیں تھا۔ لوگ قانون کے حدود کے اندر زیادہ سے زیادہ آزادی رکھتے تھے۔ (البتہ قانون کے مقابلہ میں آزادی نہ صرف اسلام میں بلکہ دنیا کے اجتماعی قوانین میں بھی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے) آزادی اور اجتماعی عدالت کی اسی روش کے بارے میں خدائے متعال اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے: (الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لِمِ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَى الْغَيْرِ وَالَّذِينَ كَانَتْ عَلَيْهِمْ أَلْفَاظٌ مِّنَ الْكِتَابِ يُحِبُّونَ اللَّهَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ مِّنَ الْكِتَابِ يُحِبُّونَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ أَلْفَاظٌ مِّنَ الْكِتَابِ يُحِبُّونَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ أَلْفَاظٌ مِّنَ الْكِتَابِ) ”جو لوگ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں کہ جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھا دیتا ہے پس جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس کا احترام کیا، اس کی امداد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی درحقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہے۔“ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اللہ کا رسول اور نمائندہ ہوں، یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی میں اپنے لئے کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتے تھے اور ہرگز وہ شخص جو پہلے سے آپ کو نہیں جانتا تھا، اس میں اور دوسروں میں امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ آپ اپنے گھر کا کام خود انجام دیتے تھے، ہر ایک کو ذاتی طور پر شرف یابی بخشے تھے، حاجتمندوں کی باتوں کو خود سنتے تھے، تخت اور صدر محفل کی جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے۔ راستہ چلتے وقت جاہ و شتم اور سرکاری تکلفات سے نہیں چلتے تھے۔ اگر کوئی مال آپ کے ہاتھ میں آتا تو اپنے ضروری مخارج کے علاوہ باقی مال کو فقرا میں تقسیم

کرتے تھے اور کبھی اپنی ضرورت کی اشیاء کو بھی حاجتمندوں میں تقسیم کر کے خود بھوکے رہتے تھے اور ہمیشہ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے اور فقراء کے ساتھ ہم نشین ہوتے تھے، لوگوں کے حقوق کی دادرسی میں کبھی غفلت اور لاپرواہی نہیں کرتے تھے، لیکن اپنے ذاتی حقوق میں زیادہ تر عفو و بخشش سے کام لیتے تھے۔ جب فتح مکہ کے بعد قریش کے سرداروں کو آپ کی خدمت میں حاضر کیا گیا تو آئے کسی قسم کی تندی اور سختی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ سبھی کو عفو کیا جبکہ ہجرت سے پہلے انہوں نے مقتل آپ پر ظلم کئے تھے اور ہجرت کے بعد بھی قتلے برپا کر کے آپ کے ساتھ خونین جنگیں لڑی تھیں۔ آپ اور آپ کے اہل بیت پر خدا کا درود و سلام ہو۔

بخوبی جان لینا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین اور توحید کے نشر کے علاوہ کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے، اور اچھے اخلاق، خندہ پیشانی اور واضح ترین استدلال و برہان سے لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے تھے اور اپنے اصحاب کو بھی اسی روش پر عمل کرنے کی نصیحت فرماتے تھے، چنانچہ خدائے متعال آپ کو اس طرح حکم فرماتا ہے: (قل ہذہ سبیل اداء الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی) ”آپ کھدیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے کہ میں بصیرت کے ساتھ خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میرے ساتھ میرا اتباع کرنے والا بھی ہے“، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امر کی طرف انتہائی توجہ رکھتے تھے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد (اگرچہ غیر مسلمان اور اسلام کے ذمہ دار میں ہو) اپنا حق حاصل کرے اور الٰہی قوانین کے نفاذ میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا ہونے نہ پائے اور حق و عدل کے سامنے سب مساوی ہوں، کوئی کسی پر (تقویٰ کے علاوہ) کسی قسم کا امتیاز نہ جتلائے اور مال و دولت یا حسب و نسب اور عام قدرت کے بل بوتے پر کسی پر ترجیح حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، فخر نہ جتلائے اور معاشرے کے مالدار لوگ کمزوروں اور محتاجوں پر زبردستی نہ کریں اور اپنے ماتحتوں پر ظلم نہ کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اور اٹھنے بیٹھنے اور راستہ چلنے میں ہرگز تکلفات سے کام نہیں لیتے تھے۔ اپنے گھریلو کام بھی انجام دیتے تھے، آپ کے پاس محافظ و نگہبان نہیں تھے۔ لوگوں کے درمیان عام شخص جیسے گلتے تھے

جب لوگوں کے ہمراہ چلتے تھے تو کبھی آگے نہیں بڑھتے تھے، جب کسی محفل میں داخل ہوتے تو نزدیک ترین خالی جگہ پر بیٹھ جاتے، اصحاب کو نصیحت فرماتے تھے کہ دائرے کی صورت میں بیٹھیں تاکہ محفل صدر نشین کی حالت پیدائہ کرے، جس کو دیکھتے، چاہے عورت ہو یا بچہ سب کو سلام کرتے تھے۔

ایک دن آپ کا ایک صحابی آپ کے سامنے خاک پر گر کر سجدہ کرنا چاہتا تھا تو آتے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ یہ قیصر و کسری کی روش ہے اور میری شان پیغمبری اور بندگی ہے۔ آتے اپنے صحابیوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ حاجتمندوں کی حاجتوں اور کمزوروں کی شکایتوں کو مجھ تک ضرور پہنچائیں اور اس سلسلہ میں کوتاہی نہ کریں۔ کہا جاتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو آخری نصیحت لوگوں کو کی وہ غلاموں اور عورتوں کے بارے میں تھی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں چند نکات

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نیک اخلاق میں دوست و دشمن میں معروف و مشہور تھے۔ آپ کے حسن اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ظالم دشمنوں اور نادان دوستوں کی بد اخلاقی اور آزار و بے ادبی و جہانی افیتوں کے باوجود آپ کی تیوری پر بل نہ آتے تھے اور ناراضگی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ سلام کرنے میں عورتوں بچوں اور ماتحتوں پر سبقت کرتے تھے۔ جب آپ کو خدا کی طرف سے دین کی تبلیغ اور لوگوں کی رہبری کرنے کی ذمہ داری ملی تو آتے فریضہ کی انجام دہی میں ایک لمحہ بھی کوتاہی نہیں کی اور اپنی اٹھک کوششوں کی بنا پر کبھی آرام سے نہیں بیٹھے۔ ہجرت سے تیرہ سال پہلے مکہ میں، مشرکین عرب کی طرف سے ناقابل برداشت مشکلات اور افیتوں کے باوجود عبادت و دین خدا کی تبلیغ میں مسلسل مشغول رہتے تھے۔ ہجرت کے بعد دس سال کے دوران بھی دین کے دشمنوں کی طرف سے روز بروز مشکلات اور یہودیوں اور مسلمان نامنا فحوں کی طرف سے روڑے اٹھائے جاتے رہے۔ معارف دین اور قوانین اسلام کو حیرت انگیز وسعت کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا دشمنان اسلام سے ۸۰ سے زیادہ جنگیں لڑیں اس کے علاوہ اسلامی معاشرے کی باگ ڈور۔ جو ان دنوں تمام جزیرہ نما عرب پر پھیلا ہوا تھا۔ آپ کے ہاتھوں میں تھی، یہاں تک کہ

لوگوں کی چھوٹی سے چھوٹی شکایتوں اور ضرورتوں کو بھی کسی رکاوٹ کے بغیر خود بر طرف فرماتے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت اور شہامت کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ آئے اس وقت تنہا حق کی دعوت کا پرچم بلند کیا، جبکہ دنیا بھر میں ظلم و زبردستی اور حق کشی کے علاوہ حکومت نہیں کی جاسکتی تھی آئے وقت کے ظالموں سے بے اتہا جہانی اذیتیں اور تکفیں اٹھائیں، لیکن یہ سب چیزیں آپ کے عزم و ارادے میں سستی اور کمزوری پیدا نہ کر سکیں اور آپ نے کسی جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت پاکیزہ نفس کے مالک تھے، فقیرانہ لباس پہنتے تھے اور سادہ زندگی گزارتے تھے آپ کے اور نوکروں و غلاموں کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، آپ کے پاس کافی مال و منال آتا تھا لیکن اسے مسلمان فقراء میں تقسیم کرتے تھے، تھوڑی مقدار میں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی زندگی کے لئے لیتے تھے۔

بعض اوقات کئی دنوں تک آپ کے گھر سے دھواں نہیں اٹھتا تھا اور ہکا ہوا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ زندگی میں صفائی خاص کر عطر کو بہت پسند فرماتے تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنی حالت نہیں بدلی، جو تواضع و فروتنی آپ کی ابتدائی زندگی میں تھی وہی آخر تک رہی اور اس گراں قدر حیثیت کے مالک ہونے کے باوجود، ہرگز اپنے لئے ایسے امتیاز کے قائل نہ ہوئے جس سے آپ کی اجتماعی قدر و منزلت دکھائی دیتی۔ آپ کبھی تخت پر نہیں بیٹھے، محفل کی صدر نشین کو کبھی اپنے لئے مخصوص نہ کیا، راستہ چلتے وقت کبھی دوسروں سے آگے نہیں بڑھے اور کبھی حکمران اور فرمانروا کا قیافہ اختیار نہیں کیا۔ جب اپنے اصحاب کے ساتھ کسی عام محفل میں تشریف فرما ہوتے تھے، تو اگر کوئی اجنبی شخص آئے ملاقات کے لئے آجاتا تھا تو وہ آپ کو نہیں پہچان پاتا تھا اور وہاں پر موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا تھا: آپ میں کون شخص پیغمبر خدا ہے؟ پھر لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو گالی نہیں دی اور کبھی یہودہ کلام نہیں کیا، کبھی قہقہہ لگا کر نہیں منے اور کوئی ہکا اور بے فائدہ کام انجام نہ دیا۔ غور و خوض کو پسند فرماتے تھے، ہر درد مند کی بات اور ہر ایک کا اعتراض سنتے تھے پھر جواب دیتے تھے، کبھی کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، آزاد فکر میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے، لیکن اشتباہ

کرنے والے کو اشتباہ کو واضح کر کے اس کے اندرونی زخم پر مرہم لگاتے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہربان اور انتہائی نرم دل تھے، ہر مصیبت زدہ کی مصیبت کو دیکھ کر رنجیدہ ہوتے تھے، لیکن بدکاروں اور مجرموں کو سزا دینے میں نرمی نہیں کرتے تھے اور سزا کو جاری کرتے وقت اپنے اور پر ایے اور بیگانہ و آشنا میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ ایک انصاری کے گھر میں چوری ہوئی تھی، اس سلسلہ میں ایک یہودی اور ایک مسلمان ملزم ٹھہرائے گئے۔ انصار کی ایک بڑی جماعت آنحضرت کے پاس آئی اور دباؤ ڈالا کہ مسلمانوں خاص کر انصار کی آبرو بچانے کے لئے، صرف یہودی کو سزا دی جائے۔ کیونکہ انصار کے ساتھ یہودیوں کی کھلم کھلا دشمنی تھی۔ لیکن آنحضرت نے حق کو ان کی مرضی کے برخلاف ثابت کیا یہودی کی آشکارا طور پر حمایت کی اور مسلمان کو سزا سنادی۔

جنگ بدر کی پکڑ دھکڑ کے دوران مسلمانوں کی صفوں کو منظم کرتے ہوئے جب آنحضرت ایک سپاہی کے پاس پہنچے جو تھوڑا سا آگے تھا تو آپ نے اپنے عصا سے اس سپاہی کے پیٹ پر رکھ کر تھوڑا سا ڈھکیلاتا کہ اچھے بیٹے اور صف سیدھی ہو جائے۔ سپاہی نے کہا: یا رسول اللہ! خدا کی قسم میرے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ میں آتے قصابوں کا۔ آنحضرت نے اپنے عصا کو اس کے ہاتھ میں دیدیا، اور اپنے کلم سے لباس ہٹا دیا اور فرمایا آؤ قصاب لے لو۔ سپاہی نے بڑھ کر آنحضرت کے کلم مبارک کو چوما اور کہا: ”میں جانتا ہوں کہ آج قتل کیا جاؤں گا، میں اس طرح آپ کے بدن مقدس کا بوسہ لینا چاہتا تھا“ اس کے بعد اس سپاہی نے دشمن پر حملہ کیا اور تلوار چلائی یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔

مسلمانوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت

عالم بشریت، کائنات کے دوسرے ان تمام اجزاء کے مانند تغیر و تبدل کی حالت میں ہے کہ جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور لوگوں کی بناوٹ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے انسان میں مختلف سلیقے وجود میں آئے ہیں کہ جن کے نتیجے میں لوگ، فہم و ادراک کی

تیزی و کندی، حفظ اور افکار کی فراموشی میں مختلف ہیں۔ اس لحاظ سے، عقائد اور اسی طرح رسومات اور ایک معاشرہ میں جاری قوانین کی ایک پائدار بنیاد کی حفاظت کے لئے اگر باایمان و قابل اعتماد نگہبان و محافظ نہ ہوں، تو وہ تھوڑی ہی مدت کے بعد تغیر و تبدل اور انحراف کا شکار ہو کر نابود ہو جائیں گے۔ مشاہدہ اور تجربہ ہمارے لئے اس مسئلہ کو واضح ترین صورت میں ثابت کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عالمی اور ابدی دین کو درپیش خطرے سے بچانے کے لئے پائدار و محکم سند اور باصلاحیت محافظ کے طور پر کتاب خدا اور اپنے اہل بیت علیہم السلام کو لوگوں کے سامنے پیش کیا چنانچہ شیعہ اور سنی راویوں نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارہا فرمایا: ”میں اپنے بعد، خدا کی کتاب اور اہل بیت کو تم لوگوں میں چھوڑ رہا ہوں یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، جب تک تم لوگ ان سے متمسک رہو گے، گمراہ نہیں ہو گے۔“

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت اور جانشینی کا مسئلہ

وہ آخری شہر جس کا فتح ہونا اسلام کے جزیرہ نما عرب پر تسلط جانے کا سبب بنا، شہر ”مکہ“ تھا، کہ جہاں پر حرم خدا اور کعبہ ہے۔ یہ شہر ۱۱ھ میں اسلامی لشکر کے ہاتھوں فتح ہوا اور اس کے فوراً ہی بعد شہر طائف بھی فتح ہوا۔ ۱۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فریضہ حج انجام دینے کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ حج کے اعمال اور لوگوں تک ضروری تعلیمات پہنچانے کے بعد مدینہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں ”غدير خم“ نامی ایک جگہ پر قافلہ کو آگے بڑھنے سے روکنے کا حکم فرمایا اور مختلف علاقوں سے آئے ہوئے ایک لاکھ بیس ہزار حاجیوں کے درمیان حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو پکڑ کر بلند کیا اور تمام لوگوں میں حضرت علی کی ولایت اور جانشینی کا اعلان فرمایا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اقدام سے اسلامی معاشرہ میں والی کا مسئلہ۔ کہ جو اسلامی معاشرہ میں مسلمانوں کے امور پر ولایت رکھتا ہے اور کتاب و سنت اور دینی معارف اور قوانین کی حفاظت کرتا ہے۔ حل ہوا اور آیہ

^۱ (انی تارک فیکم الثقلین إکتاب اللہ و عترتی اہل بیٹی ! ما ان تمسکتکم بہمالن تضلوا بعدی ابدانہمالن یفترقا حتی یرداعلی الحوض) (غایۃ المرام، ص ۲۱۲ الغدیر، ج ۱، ص ۵۵)

شریفہ: (یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فابلغ رسالتہ^۱) کا حکم نافذ ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ لوٹے، ستر دن کے بعد، تقریباً ۲۸ ماہ صفر^۲ کو رحلت فرمائی۔

قرآن مجید، نبوت کی سند

سب سے بڑی دلیل کہ جس کو پیغمبر اکرمؐ نے سند نبوت کے طور پر پیش کیا ہے نیز معارف اسلام یعنی اصول و فروع کے لئے ماخذ و مصدر ہے کہ جس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے وہ کتاب آسمانی یعنی قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید خدائے متعال کے کلام اور خطاب کا ایک مجموعہ ہے، جو مقام کبریائی کی عزت و عظمت کے مصدر ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور اس کے ذریعہ راہ سعادت کی نشاندہی کی گئی۔ قرآن مجید عالم بشریت کو ایسے علمی و علمی احکام و قوانین کی نشاندہی کرتا ہے کہ جن پر عمل کر کے انسان دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کر سکتا ہے۔

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا معجزہ، حجت اور ایک ایسی سند و ثبوت ہے جو دشمن کو ہر جہت سے عاجز اور کمزور بنا دیتا ہے اور ہر قسم کے عذر، اعتراض، نزاع اور لڑائی جھگڑے کے راستہ کو اس کے لئے بند کر دیتا ہے اور اپنے مقاصد کو واضح ترین صورت میں ثابت کرتا ہے۔ قرآن مجید اپنے مقاصد میں لوگوں کو آنکھیں بند کر کے تقلید کرنے کی دعوت دینے کے بجائے اس کے ساتھ عام اور خدا داد منطق کی زبان میں بات کرتا ہے اور کچھ معلومات کی یاد دہانی کرتا ہے، جنہیں انسان خواہ مخواہ اپنی فطرت سے درک کرتا ہے، اور یاد دہانی کرتا ہے کہ انسان کبھی ان کو قبول کرنے اور اعتراف کرنے سے پہلو تہی نہیں کر سکتا ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (إِنَّ لِقَوْلِ فَصْلًا * وَمَا هُوَ إِلَّا نَزْلٌ) ”بیشک یہ قول فیصل ہے اور مذاق نہیں ہے۔“ قرآن مجید ایک مطلب کو بیان کرتا ہے جہاں تک اس کی دلالت کی شاعیں پھیلتی ہیں، ہمیشہ اور بھی کے لئے زندہ و پایندہ ہے، نہ لوگوں کی معمولی باتوں کے مانند بعض جہات سے فہم و تفکر کے ذریعہ اس پر احاطہ کیا جاسکتا ہے اور بعض لحاظ سے غفلت اور لاپرواہی کا اس میں

^۱ مانند ۶۷

^۲ طارق ۱۳، ۱۴

امکان ہو بلکہ یہ ایسے خدائے متعال کا کلام ہے جو ہر ظاہر و باطن اور مصلحت و مفیدہ سے آگاہ ہے۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنی حقیقت پسندانہ آنکھوں کو کھول دے اور ہمیشہ ان دو آیہ شریفہ کو مد نظر رکھے، خدا کے کلام کو زندہ اور پائندہ جانے۔ اور جو دوسروں نے سمجھ کر بیان کیا ہے، اس پر اکتفا نہ کرے، آزاد فکر کے راستے کو اپنے اوپر بند نہ کرے، کیونکہ یہ انسانیت کا تنہا خصوصی سرمایہ ہے اور قرآن مجید اس پر عمل کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے۔

قرآن مجید ہمیشہ اور سبھی کے لئے قول فیصل اور ایک زندہ حجت ہے اور یہ کتاب کسی خاص گروہ کے فہم تک محدود و منحصر نہیں ہو سکتی ہے، خدائے متعال فرماتا ہے: (ولایکونوا کالتذین اوتوا الکتب من قبل فحال علیم الالہ فقت قلوبہم) 'اور وہ (مسلمان) ان اہل کتاب کی طرح نہ ہو جائیں، جنہیں کتاب دی گئی تو ایک عرصہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے،' قرآن مجید لوگوں سے چاہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کی طرف پلٹیں، حق کو قبول کریں، یعنی پہلے اپنے آپ کو بلا قید و شرط حق کو قبول کرنے پر آمادہ کریں اور جب دیکھیں کہ یہ حق ہے اور ان کی دنیوی و اخروی سعادت و منافع اسی میں ہے، تو شیطانی وسوسوں اور ہوا و ہوس کی آواز کی طرف کان دھرے بغیر اسے قبول کریں۔ اس کے بعد، اسلامی معارف کو اپنے زندہ شعور کے سپرد کریں، اگر دیکھیں کہ یہ حق ہے اور انہیں قبول کر کے ان پر عمل کرنے میں ان کے لئے حقیقی مصلحت و آسودگی ہے تو ان کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور البتہ اس صورت میں انسانی معاشرے میں عام ہونے والی زندگی کی روش اور دین، ایسے ضوابط اور احکام ہوں گے جنہیں انسان اپنے فطری میلانات کے تحت چاہتا ہے۔ آخر ایک یگانہ روش ہوگی جس کے تمام اجزاء و مواد انسان کی خصوصی بناوٹ سے مکمل ہم آہنگ ہوں گے اور تضاد و تناقض سے مکمل طور پر دور ہوں گے، نہ ایک ایسی متضاد روش جو کہیں پر مغنویات سے وجود میں آتی ہو اور کہیں پر مادیات سے اور کہیں عقل سلیم کے موافق ہو اور بعض مواقع پر ہوا و ہوس کے تابع ہو۔

خدا نے متعال قرآن مجید کی توصیف میں فرماتا ہے: (یہدی الی الحق والی طریق مستقیم) (یہ کتاب) حق و انصاف اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرنے والی ہے، نیز فرماتا ہے: (ان ہذا القرآن یہدی للقی ہی اقوام) (بیشک یہ قرآن اس راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے)۔ ایک دوسری آیت میں اسلام کی اس توانائی کے سبب کو اسلام کے انسان کی خلقت کے مطابق ہونے کو بتاتا ہے کیونکہ بالکل واضح ہے کہ جو روش و راستہ انسان کی فطری خواہشوں اور حقیقی ضرورتوں کو پورا کرے، وہ انسان کو بہترین صورت میں کامیاب و خوش بخت بنا سکتا ہے: (فاقم وجہک للذین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل خلق اللہ ذلک الدین القیم) (آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا اور خلقت الہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔ یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے)۔ نیز فرماتا ہے: (یکتب انزلہ ایک لتخرج الناس من الظلمات الی النور) (یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو حکم خدا سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے)۔

قرآن مجید، لوگوں کو ایک ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے کہ جو خود بھی روشن ہو اور منزل مقصود کو بھی واضح طور پر دکھائے یہ راستہ قطعاً وہی راستہ ہوگا جو انسان کی فطری خواہشات جو اسکی واقعی ضرورتیں ہیں۔ کو پورا کر سکے اور عقل سلیم کی نظر سے موافق ہونا چاہئے اور یہ وہی دین فطرت ہے جسے ”اسلام“ کہتے ہیں۔ لیکن جس روش کی بنیاد معاشرہ کی ہوا و ہوس اور شہوانی خواہشات کے لئے یا معاشرے کے بااثر افراد کے ذریعہ رکھی گئی ہو، اسی طرح جو روش اسلاف کی اندھی تقلید پر مبنی ہو، اسی طرح جو راہ و روش ایک پسماندہ اور ناتواں ملت نے ایک توانا اور قدرتمند ملت سے حاصل کر کے عقل و منطق سے اس کی تحقیق کئے بغیر جو کچھ اس سے حاصل کیا ہے، اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر کے خود کو اس کے مشابہ بنائے، ایسی روشیں تاریکی میں ڈوبنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے

اور حقیقت میں یہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کے مترادف ہے کہ جہاں منزل مقصود تک پہنچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے پتا نہ خدائے
 متعال فرماتا ہے: (او من کان یتا فاحینہ وجعلنا لہ نوراً یشی بہ فی الناس کمین مثله فی الظلمات یس بجارج منها) ”کیا جو شخص مردہ تھا
 پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے اسکی مثال اسکی جیسی ہو
 سکتی ہے جو تاریکیوں میں ہو اور ان سے نکل بھی نہیں سکتا ہو“۔



قرآن مجید کی اہمیت

قرآن مجید ایک آسمانی کتاب ہے جو عالمی وابدی دین اسلام کی پشت پناہ ہے۔ اس میں معارف اسلامی کے کلیات و دلکش انداز میں بیان ہوئے ہیں، اس لحاظ سے اس کی قدر و قیمت دین خدا کی قدر و قیمت کے مساوی ہے، وہ دین جس سے انسان کی حقیقی سعادت و خوشنہی وابستہ ہے، وہ ہر چیز سے زیادہ قیمتی، اہم اور بلند ہے بلکہ قدر و قیمت میں کوئی چیز اس سے قابل موازنہ نہیں ہے۔ اسکے علاوہ قرآن مجید خدائے متعال کا کلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لافانی معجزہ ہے۔

قرآن مجید کا معجزہ

یقیناً عربی زبان، ایک قوی اور وسیع زبان ہے، جو انسان کے باطنی مقاصد کو واضح ترین اور دقیق ترین صورت میں بیان کر سکتی ہے اور یہ اس خصوصیت میں مکمل ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عصر جاہلیت (قبل از اسلام) کے اعراب اکثر خانہ بدوش اور تہذیب و تمدن سے بے بہرہ اور زندگی کے بیشتر حقوق سے بالکل محروم تھے۔ لیکن وہ قدرت بیان اور کلام کی فصاحت و بلاغت میں ایک بلند مقام رکھتے تھے چنانچہ تاریخ کے صفحات میں ان کا حریف پیدا نہیں کیا جاسکتا۔

ادبیات عرب کے میدان میں، فصیح کلام کی بہت قدر و قیمت تھی اور ادیبانہ اور فصیح کلام کا کافی احترام کیا جاتا تھا، اعراب جس طرح بتوں اور اپنے خداؤں کو خانہ کعبہ میں نصب کرتے تھے، اسی طرح صف اول کے ادیبوں اور شعراء کے دلکش اشعار کو بھی کعبہ کی دیوار پر لٹکاتے تھے۔ اس کے باوجود کہ وہ ایک وسیع زبان کو ان تمام علامتوں اور دقیق قواعد و ضوابط اور کم ترین غلطی اور اشتباہ سے استعمال کرتے تھے اور کلام کی فصاحت و بلاغت میں کمال دکھاتے تھے جب ابتدائی ایام میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید کی چند آیتیں نازل ہوئیں، تو اعراب اور اس قوم کے ادیبوں اور سخنوروں میں ہلچل مچ گئی اور قرآن مجید کا دلکش اور پُر معنی بیان کا دلوں پر ایسا اثر ہوا کہ دل والوں کو اپنا فریشتہ بنا کر رکھ دیا اور وہ ہر فصیح کلام کو بھول گئے اور نامور شعراء جو اپنے

اشعار کعبہ کی دیوار پر لٹکائے تھے، انہیں اتار دیا۔ یہ خدائی کلام، اپنی ابدی زیبائی و دلکشی سے ہر دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا اور اپنی شیرین بیانی سے شیرین زبانوں پر تالا لگادیتا تھا۔ لیکن دوسری جانب مشرکوں اور بت پرستوں کے لئے انتہائی تلخ و ناگوار تھا، کیونکہ خدا کا کلام اپنے موثر بیان اور قطعی حجت سے دین توحید کو بہانہ و استدلال بھٹاتا تھا اور شرک و بت پرست کی روش کی سرزنش کرتا تھا۔ جن بتوں کو لوگ خدا کہتے تھے ان کے سامنے نیاز مندی کا ہاتھ پھیلاتے تھے، ان کی بارگاہ میں قربانیاں پیش کرتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے، قرآن ان کی مذمت کرتا اور انہیں پتھر اور لکڑی کے بے جان و بے فائدہ مجسمے سے تعبیر کرتا تھا، وحشی اعراب جنہوں نے غرور و تکبر میں غرق ہو کر اپنی زندگی کی بنیاد خوشخواری اور ڈاکہ زنی پر ڈالی تھی... کو حق پرستی کے دین اور عدالت و انسانیت کے احترام کی طرف دعوت دیتا تھا یہی وجہ تھی کہ اعراب جنگ و لڑائی کے راستہ سے سامنے آ گئے اور اس شمع ہدایت کو خاموش کرنے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرتے رہے لیکن اپنی بے جا کوششوں میں ناامیدی و ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔ اوائل بعثت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ولید نامی ایک ادیب اور فصاحت و بلاغت کے ماہر کے پاس لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ ”حم سجدہ“ کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی۔ ولید اپنے تکبر و غرور کے باوجود بڑی سنجیدگی سے سن رہا تھا یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے اس آیہ شریفہ کی تلاوت فرمائی: (فان اعرضا فقل انذرکم صقۃ مثل صقۃ عاد و ثمود) ”پھر اگر یہ اعراض کریں تو کہہ دیجئے کہ ہم نے تم کو ویسی ہی بجلی کے عذاب سے ڈرایا ہے جیسی قوم عاد و ثمود پر نازل ہوئی تھی۔“

جوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیہ شریفہ کی تلاوت کی، ولید کی حالت بگڑ گئی، اس کا بدن کا پینے لگا، اس کے ہوش اڑ گئے، محض درہم برہم ہو گئی، اور لوگ متفرق ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ لوگ ولید کے پاس آئے اور اس سے شکوہ کیا اور کہا کہ تم نے ہمیں محمدؐ کے سامنے رسوا کر کے رکھ دیا! اس نے جواب میں کہا: خدا کی قسم ہرگز نہیں! تم لوگ جانتے ہو کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا ہوں اور کوئی لالچ بھی نہیں رکھتا ہوں اور تم لوگ جانتے ہو کہ میں سخن شناس ہوں جو باتیں میں نے محمدؐ سے سنی ان میں لوگوں کی

باتوں کی شبہت نہیں پائی جاتی یہ دلفریب اور دلکش کلام تھا نہ اسے شعر کہہ سکتے ہیں اور نہ نثر با معنی اور عمیق کلام ہے۔ اگر میں اس کلام کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرنے پر مجبور ہی ہوں تو مجھے تین دن کی مہلت دیں تاکہ میں اس پر غور کر سکوں۔ جب تین دن گزرنے کے بعد اس کے پاس گئے تو ولید نے کہا: محمد کا کلام سحر و جادو ہے جو دلوں کو اپنا فریفتہ بنا لیتا ہے۔ مشرکین ولید کی راہنمائی پر قرآن مجید کو سحر و جادو کا نام دیکر اس کو سننے سے پرہیز کرتے تھے اور لوگوں کو بھی اسے سننے سے منع کرتے تھے، بعض اوقات جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے تو کھٹا رشور چاتے اور تالیاں بجاتے تھے تاکہ دوسرے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سن نہ سکیں۔

اس کے باوجود کہ وہ لوگ قرآن مجید کے فصیح اور دلکش بیان کے عاشق ہوئے تھے، اکثر و بیشتر آرام سے نہیں بیٹھتے تھے اور رات کی تاریکی سے استفادہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی دیوار کے پیچھے جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کو سنتے تھے پھر سرگوشی میں ایک دوسرے سے کہتے تھے: اس کلام کو مخلوق کا کلام نہیں کہا جاسکتا ہے، خدا نے متعال اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (نحن اعلم بما يتمعون به اذ يتمعون اليك واذ هم نجوى الظلمون ان تبعون الارجلا مسحورا) ”ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں تو کیا سنتے ہیں اور جب یہ باہم رازداری کی بات کرتے ہیں تو ہم اسے بھی جانتے ہیں، یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں تم لوگ ایک جادو زدہ انسان کی پیروی کر رہے ہو۔“

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض اوقات کعبہ کے نزدیک لوگوں کو قرآن مجید کی تلاوت کی طرف دعوت دیتے تھے، عرب کے مخنور جب آپ کے نزدیک سے گزرتے تھے تو جھک کر گزرتے تھے۔ تاکہ دیکھے اور پہچانے نہ جائیں چنانچہ خدا نے متعال فرماتا ہے: (الا انهم يشنون صدورهم لیتختوا منه) ”ترجمہ کا خلاصہ: وہ اپنے آپ کو پیغمبر سے چھپانے کے لئے جھک جاتے ہیں۔“ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تمہیں کفار و مشرکین نے نہ صرف قرآن مجید کو سحر و جادو کہا بلکہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی پوری دعوت کو ہی جادو کہتے تھے۔ جب بھی آپ لوگوں کو راہ خدا کی دعوت دیتے تھے اور انہیں کچھ حقائق کی یاد دہانی کراتے تھے یا کوئی وعظ و نصیحت فرماتے تھے تو کفار کہتے تھے: ”جادو کر رہا ہے“ جبکہ تمام حالات میں آپان کے لئے ایسے مسائل کو واضح فرماتے تھے کہ وہ خداداد فطرت اور انسانی شعور سے ان کی حقیقت کو درک کرتے تھے اور آپانہیں سیدھا اور واضح راستہ دکھاتے تھے کہ انسانی معاشرے کی سعادت و کامیابی کو جادو نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیا یہ کہنا جادو ہے بلکہ ”اپنے ہاتھوں سے پتھر و کلڑی کے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش نہ کرو اور اپنے فرزندوں کو انکی قربانی نہ کرو اور خرافات کی پیروی نہ کرو“ اور کیا پسندیدہ اخلاق، جیسے سچائی، صحیح، خیر خواہی، انسان دوستی، صلح و صفا، انصاف، عدالت اور انسانی حقوق کے احترام کو جادو کہا جاسکتا ہے؟ خدا نے متعال اپنے کلام پاک میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وَلَمَّا قُلْتَ اَلْکَلْمَ مَبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلُنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنۡ هٰذَا اِلَّا سَحَرٌ مِّمِّیْنَ) ترجمہ کا خلاصہ: ”جب آپ کفار سے کہتے ہیں کہ: موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاؤ گے تو کہتے ہیں کہ جادو کرتا ہے۔“

قرآن مجید کی مشرکین کو مناظرہ کی دعوت

کفار و مشرکین کہ جن کے دلوں میں بت پرستی نے جڑ پکڑ لی تھی، اسلام کی دعوت کو قبول کرنے اور حق و حقیقت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے۔ لہذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید کرتے ہوئے کہتے تھے: ”یہ جھوٹا ہے اور جس قرآن کو خدا سے نسبت دیتا ہے یہ اس کا اپنا کلام ہے“ اس تہمت کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید نے شدید رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے عربوں کے میدان فصاحت و بلاغت کے ہر اول دستے کو مقابلہ کی دعوت دیتے ہوئے ان سے چاہا کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان لوگوں کا شک و شبہ صحیح ہے اور وہ سچ کہتے ہیں تو قرآن مجید کے کلام کے مانند کلام لے آئیں اور اس طرح اسلام کی دعوت کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کریں چنانچہ خدا نے متعال فرماتا ہے: (اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقُوْلُهٗ بَلْ لَیۡو

منون *فلیا تو بحمد مثله ان کا نوا صادقین^۱ یا یہ کہتے ہیں کہ نبی نے قرآن گڑھ لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگر یہ اپنی باتوں میں سچے ہیں تو یہ بھی ایسا ہی کوئی کام لے آئیں۔“ (۱) بقولون افتریہ قل فأتوا سورۃ مثله وادعوا من استطعم من دون اللہ ان کنتم صدقین^۲) کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پیغمبر نے گڑھ لیا ہے تو کھد بیجئے کہ تم اس کے جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہو اپنی مدد کے لئے بلا لو اگر تم الزام میں سچے ہو۔“ کفار و مشرکین عرب جو سخوری کے استاد اور ملک فصاحت و بلاغت کے فرمانروا تھے، سخوری میں اس تکبر و غرور کے باوجود اس دعوت کو قبول کرنے سے پہلو تہی کرتے ہوئے مقابلہ سے چشم پوشی کی اور کلام کے مقابلہ کو خونین مقابلہ میں تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے یعنی ان کے لئے رسوائی اور مقابلہ کی نسبت قتل ہونا زیادہ آسان تھا۔ عرب سخور قرآن مجید کا جواب لانے سے عاجز ہوئے نہ صرف نزول قرآن کے زمانے میں زندگی گزارنے والے بلکہ جو نزول قرآن کے زمانے کے بعد پیدا ہوئے وہ بھی اس کا کوئی جواب نہ لاسکے اور مقابلہ کے بعد شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے۔

انسان کی فطرت ہمیشہ اس چیز کی طرف مائل ہوتی ہے کہ اس سے کوئی شاکار یا ہمز ظاہر ہو جائے اور لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرے، اگرچہ یہ کارنامہ مکہ بازی اور رسی کھینچنے کے مانند معاشرہ میں براہ راست اثر بھی نہ رکھتا ہو پھر بھی لوگوں کی ایک جماعت اس کی جیسی مثال یا اس سے بہتر مثال پیش کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے بھی گھات میں کچھ لوگ ہمیشہ رہے ہیں کہ اگر اس آسمانی کتاب سے مقابلہ کرنے کی فرصت مل جائے تو اس سے گریز نہ کریں گے۔

یہ لوگ مقابلہ سے عاجز آچکے تھے اور سحر و جادو کو بہانہ بنا کر یہ نہیں کہہ سکے کہ قرآن مجید جادو ہے، کیونکہ جادو ایک ایسا عمل ہے جو خاصیت کے مطابق حق کو باطل اور باطل کو حق ظاہر کرتا ہے، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کے روپ میں پیش کرتا ہے اور اگر

^۱ طور، ۳۳، ۳۴

^۲ یونس، ۳۸

قرآن مجید اپنے زیبائے اور فصیح نظم سے دلوں کو جذب کرتا ہے تو یہ اس کی فطری خاصیت کی زیبائی ہے اور علم جادو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر لفظ کے ذریعہ کچھ مقاصد کی طرف دعوت دیتا ہے اور کچھ معارف کے بارے میں لوگوں کو یاد دہانی کراتا ہے کہ انسانی شعور اور خداداد فطرت سے ان کی حقیقت کو سمجھ سکیں اور لوگوں کو کچھ رخسار و کردار کا جیسے: حق شناسی، نیک نیتی، عدل و انصاف اور انسان دوستی کو قبول کرنے پر مجبور کرے تو ان کی تعریف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ چونکہ قرآن مجید، حقیقت کو بیان کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اس لئے یہ لوگ عاجز ہو کر یہ بھی نہ کہہ سکے ہیں کہ قرآن مجید کلام بشر سے مافوق ہے اس لئے کہ زیبائی، دلکشی، بلاغت اور کشش میں بے نظیر ہے اور یہ اس کے کلام خدا ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ ہر ایک صفت یا مہارت، جیسے جرئت، شجاعت، پڑھنا اور لکھنا وغیرہ جو قابل ترقی ہے، لا محالہ تاریخ بشریت میں ان میں سے ایک غیر معمولی ذہنیت والا مقابلہ میں جیت کر اول آتا ہے، کیا حرج ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی بول چال کے اس مقابلہ میں کامیاب قرار پا کر فصاحت و بلاغت میں اول آئیں، اس صورت میں آپ کا کلام باوجود اس کے کہ کلام بشر ہے ناقابل مناسبت ہو گا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر سخن وروں نے یہ بات نہیں کہی اور نہ ہی قرآن مجید کے حریفوں میں سے کوئی شخص یہ کہہ سکا اور ثابت کر سکا، کیونکہ ہر صفت یا مہارت جو کسی غیر معمولی ہنرمند کے ذریعہ ترقی کے کمال تک پہنچتی ہے، کچھ بھی آخر کار یہ ایک ایسا امر ہے جو انسان کی قابلیت اور استعداد سے وجود میں آتا ہے اور فطرت بشر کا نتیجہ ہے، لہذا یہ کام دوسروں کے لئے ممکن ہے کہ اس غیر معمولی ذہین شخص کے نقش قدم پر چل کر ضروری سعی و کوشش کے ذریعہ اسی غیر معمولی ذہین انسان کی طرح ایک کارنامہ انجام دیں اگرچہ کسی بھی جہت سے اس سے بہتر نہ ہو۔

اس حالت میں مذکورہ غیر معمولی شخص جو راستہ کھولنے والا پہلا شخص ہے، صرف پیشوا اور پیش رو ہو سکتا ہے، مثلاً سخاوت میں حاتم طائی سے بلند کوئی شخص نہیں ہو سکتا ہے، لیکن اس کے جیسا کام انجام دیا جاسکتا ہے، خوشنویسی میں میر کے برابر اور نقاشی میں مانی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے ہیں، لیکن مناسب کوشش اور جتو کے نتیجہ میں میر کے نبج پر ایک کلمہ لکھا جاسکتا ہے یا مانی کے

اسلوب پر نقاشی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس عام قانون کی بنا پر، اگر قرآن مجید فصیح و بلیغ ترین انسانی کلام (نہ کلام خدا) ہوتا تو دوسروں کے لئے خاص کر دنیا کے نامور سخن وروں کے لئے ممکن تھا کہ اسی اسلوب کا تجربہ کر کے، ایک کتاب یا کلم از کم قرآن مجید کے سوروں کے مانند ایک سورہ کو بناتے۔ قرآن مجید نے مقابلہ کے مرحلہ میں لوگوں سے اپنے جیسے کلام کا تقاضا کیا ہے نہ کہ اس سے بہتر کا: (فلما توبخہ بحدیث مثلاً^۱) (فاتوا بورة مثلاً^۲) (فاتوا بعشر سور مثلاً مفتریت^۳) (لایاتون بشئہ ولو کان بعضهم لبعض ظہیراً^۴)۔

قرآن مجید کی تعلیمات

قرآن مجید ۲۳ سال کے عرصہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے دوران تدریجاً نازل ہوا اور انسانی معاشرہ کی ضرورتوں کا حل پیش کیا۔ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے کہ خود اس کے بیانات کے مطابق لوگوں کی سعادت کی طرف رہنمائی کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ صحیح اعتقاد پسندیدہ اخلاق اور شائستہ عمل، جو انسان کے انفرادی و اجتماعی سعادت کی بنیادیں ہیں، یہی فصیح زبان میں تعلیم دیتا ہے: (ونزلنا علیک الکتب تبیاناً لکل شیء^۵) اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کیا ہے جس میں ہر شے کی وضاحت موجود ہے، قرآن مجید نے اسلامی معارف کو خلاصہ کے طور پر بیان کیا ہے۔

ان معارف کی تفصیلات خاص کر فقہی مسائل کی وضاحت کے لئے، لوگوں کو خانہ نبوت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی طرف ہدایت کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے: (وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم^۶) اور آپ کی طرف بھی ذکر کو (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ ان کے لئے ان احکام کو واضح کر دیں جو ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں۔

^۱ طور، ۳۴

^۲ یونس، ۳۸

^۳ ہود، ۱۳

^۴ اسراء، ۸۸

^۵ نحل، ۸۹

^۶ نحل، ۴۴

(وما نزلنا عليك الكتاب الا لتبين لهم الذي اختلفوا فيه^۱) ”اور ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ آپ ان مسائل کی وضاحت کر دیں جن میں یہ اختلاف کئے ہوئے ہیں“، جان لیجئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتاب خدا کی تفسیر اور دین کے معارف کی وضاحت کے لئے اپنے اہل بیت علیم السلام کے کلام کو اپنے کلام کے مانند قرار دیتے ہوئے فرمایا ”:قرآن مجید اور میرے اہل بیت قیامت کے دن تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے اور جو بھی شخص قرآن مجید سے استفادہ کرنا چاہتا ہے، اسے میرے اہل بیت کے دامن کو پکڑنا چاہئے۔“^۲

قرآن مجید کی نظر میں علم و جہل

قرآن مجید میں علم و دانش کی جو تعریف اور غور و حوض کی جو توثیق کی گئی ہے، وہ کسی اور آسمانی کتاب میں پائی نہیں جاتی۔ اسی طرح جہل و نادانی کی جو سرزنش کی گئی ہے وہ بھی قرآن مجید کے خصوصیات میں سے ہے۔ قرآن مجید نے علم و دانش کو زندگی اور جہل و نادانی کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسلام سے قبل فساد سے بھرے ماحول کو (جاہلیت) کا ماحول کہا ہے چنانچہ فرماتا ہے:

ہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون^۳) ”کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان کے برابر ہو جائیں گے جو نہیں جانتے؟“ (اومن کان میتا فاحیئہ وجعلناہ نوراً یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منها^۴) ”جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں ہو اور ان سے نکل بھی نہ سکتا ہو۔“

(فانہا لا تعمی الابصار ولكن تعمی القلوب التي فی الصدور^۵)۔ ”در حقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں“ (لہم قلوب لا یفتقون بہا و لہم اعین لا یبصرون بہا و لہم آذان لا یسمعون!...) ”ان کے پاس دل

^۱ نحلہ ۶۴

^۲ حقائق الحق، ج ۹، ص ۳۰۹-۳۷۵۔

^۳ زمرہ ۹

^۴ انعام ۱۲۲

^۵ حجہ ۴۶

میں مگر سمجھتے نہیں میں اور آنکھیں میں دیکھتے نہیں میں اور کان میں سنتے نہیں میں۔ یہ چوہایوں جیسے میں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ میں (وما یتوٰی الاعمیٰ والبعیر* ولا الظلمات ولا النور* ولا الظل ولا النور* وما یتوٰی الاحیاء ولا الاموات۔^۱) ”اور اندھے اور بینا برابر نہیں ہو سکتے اور تاریکیاں اور نور دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور سایہ اور دھوپ دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے“۔ خدا نے تعالٰیٰ اپنے کلام پاک کی بہت سی آیتوں میں انسان کو غور و فکر، اور تدبیر کی ترغیب اور تشویق فرماتا ہے اور اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ آسمانوں، زمین اور ان میں موجود گوناگون مخلوق کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کریں، بالخصوص انسان کی خلقت کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں گزشتہ ملتوں اور امتوں کی تاریخ، آثار، رسومات، عادات اور طور طریقوں، جو حقیقت میں مختلف علوم و فنون انسانی میں، مطالعہ کی تاکید کرتا ہے اور ان مطالعات کے ذریعہ اپنی حقیقی سعادت حاصل کریں۔ اور جان لینا چاہئے کہ فنی نظریات اور علمی مسائل کی چھان بین کرنا اس دنیا کی چند روزہ محدود زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے نہیں ہے بلکہ علمی مطالعات کی بنیاد پر جاودانی حیات کی سعادت و آسائش حاصل کرنے ہونا چاہئے۔ خالق کائنات کے بارے میں قرآن مجید کی تعلیم (یا فی اللہ شک فاطر السموات والارض^۲) ”کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے...؟“

وضاحت

دن کے اجالے میں تمام چیزیں آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتی ہیں، ہم اپنے آپ کو، گھر، شہر، بیابان، پہاڑ، جنگل اور دریا کو دیکھتے ہیں۔ لیکن جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے تو تمام وہ چیزیں جو روشن و نمایاں تھیں، اپنی روشنی کو کھودیتی ہیں، ہم اس وقت سمجھتے ہیں کہ ان کی وہ روشنی اپنی نہیں تھی بلکہ سورج سے مربوط تھی کہ وہ ایک قسم کے رابطہ کی وجہ سے انہیں روشن کئے ہوئے تھا۔ سورج بذات خود روشن ہے اور اپنے نور سے زمین اور اس میں موجود تمام چیزوں کو روشن اور نمایاں کرتا ہے۔ اگر ان اشیاء کی روشنی اپنی ہوتی تو ہرگز اسے کھو نہیں دیتیں۔

^۱ اعرافہ ۱۷۹

^۲ فاطرہ ۱۹، ۲۲

^۳ ابراہیم ۱۰

انسان اور دیگر تمام زندہ حیوانات اپنی آنکھوں، کانوں اور دیگر حواس سے اشیاء کو درک کرتے ہیں اور ہاتھ، پاؤں اور تمام اندرونی و بیرونی اعضاء سے سرگرمی انجام دیتے ہیں، لیکن وہ بھی ایک مدت کے بعد حس و حرکت کو کھو کر کسی قسم کی سرگرمی انجام نہیں دے پاتے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ وہ مر جاتے ہیں۔ ہم اس چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد فیصلہ کرتے ہیں کہ ان جانداروں سے ظاہر ہونے والا شعور، ارادہ اور تحریک، ان کے جسم و بدن سے نہیں ہے، بلکہ ان کی روح و جان سے ہے کہ جس کے نکل جانے کے بعد اپنی زندگی اور تحریک کو کھودیتے ہیں۔ اگر دیکھنے اور سننے کا تعلق مثلاً صرف آنکھ اور کان سے ہوتا، تو جب تک یہ دونوں عضو موجود ہوتے دیکھنا اور سننا بھی جاری رہنا چاہئے تھا، جبکہ ایسا نہیں ہے۔

اسی طرح یہ عظیم کائنات کہ، جس کے اجزاء میں سے ہم بھی ایک جزو اور ایک وجود میں ہرگز شک و شبہ نہیں کر سکتے، کہ یہ کائنات اور ناقابل انکار خلقت، اگر خود سے ہوتی، تو ہرگز اسے کھونہ دیتی، جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اس کے اجزاء یکے بعد دیگرے اپنے وجود کو کھودیتے ہیں اور ہمیشہ تغیر و تبدل کی حالت میں ہوتے ہیں، یعنی ایک حالت کو کھو کر دوسری صورت اختیار کرتے ہیں۔ لہذا ہمیں قطعی فیصلہ کرنا چاہئے کہ تمام مخلوقات کی خلقت اور وجود کا سرچشمہ کوئی دوسری چیز ہے جو ان کا خالق اور پروردگار ہے اور جو ہی خلقت کا رابطہ اس ذات سے ٹوٹ جاتا ہے تو وہ نیتی و نابودی کے دریا میں غرق ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کا احترام

معارف و احکام کا خزانہ اسلام کی آسمانی کتاب ”قرآن مجید“ ہے، جسے خدائے متعال نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر پر نازل فرمایا ہے۔ قرآن مجید دنیا کے مسلمانوں کی مادی و معنوی زندگی کا نہایت گرانقدر پشپناہ ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بار بار اس کتاب کی اسی عنوان سے تاکید کیا اور مکرر طور پر (خاص کر اپنی زندگی کے آخری ایام میں) لوگوں سے فرمایا ہے: ”میں اپنے بعد دو گراں ہا چیزیں تم لوگوں میں چھوڑ رہا ہوں جو قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی، جب تک تم

ان دونوں سے متمک رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، ان میں سے ایک قرآن مجید ہے اور دوسری میری عمرت (اہل بیت) میں، جو قرآن مجید کو بیان کرنے والے میں۔“

قرآن مجید کے تقدس اور احترام کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ: ۱۔ کلام خدا ہے۔

۲۔ پیغمبر کی قطعی اور زندہ سند ہے۔

۳۔ اسلام کے بنیادی قانون کا حامل ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”قرآن مجید سے جدا نہ ہونا، کیونکہ اس میں آپ کے اسلاف مستقبل میں آپ کے آنے والوں کے حالات موجود ہیں اور آپ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے حکومت کرتا ہے۔“

راہ خدا میں جہاد اور فداکاری کے متعلق قرآن کا دستور

اجتماعی طریقہ، ایک پھل دار درخت کے مانند ہیں، جسے شکوفہ دینے، پھلنے اور پھولنے کے لئے ایک مناسب زمیں میں لگانا چاہئے، پھر اس کی آبیاری کرنی چاہئے تاکہ زمین میں اسکی جڑیں مضبوط و مستحکم ہو جائیں، اور اس کے بعد وہ نشو و نما پائے اور اس میں مناسب موسم میں، شکوفے نکلیں اور پھل آئیں۔ اسلام کا یہ درخت سو فیصدی اجتماعی دین ہے، اس کے مکمل موثر ہونے کے لئے مندرجہ ذیل مراحل کا طے کرنا ضروری ہے: ۱۔ لوگ اسے قبول کریں۔

۲۔ تربیت کے ذریعہ، اس کی حفاظت کی جائے تاکہ اپنی زندگی کو جاری رکھ سکے۔

۳۔ اس کے قوانین کی عملی مخالفت کی روک تھام کی جائے، اور حوادث کے گزند سے ان کی حفاظت کی جائے تاکہ اپنے آثار و فوائد کو انسانی معاشرہ میں پھیلا سکیں۔

بحث کا خاتمہ

بحث کے اختتام پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف فصاحت و بلاغت کی دلکشی سے ہی دوسروں کو عاجز نہیں کیا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی عاجز کیا ہے کہ اس میں انسان کی تمام ضرورتوں کا حقیقی حل موجود ہے اور غیبی خبروں کے اعتبار سے بھی کہ جن کی اس نے پیشگوئی کی ہے اور کچھ حقائق بیان بھی کئے ہیں اور دیگر جہات سے بھی جو اس آسمانی کتاب میں پائے جاتے ہیں، قرآن مجید چلیج کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتے ہو۔

۳۔ معاد یا قیامت ”معاد“، دین مقدس اسلام کے تین اصولوں میں سے ایک اصول ہے اور اس مقدس دین کی ضروریات میں سے ہے۔ قرآن مجید کی سیکڑوں آیات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ہزاروں روایتیں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ خدائے متعال اپنے تمام بندوں کو موت کے بعد ایک معین دن کو پھر سے زندہ کرے گا اور ان کا اعمال کا حساب لے گا۔ پھر نیک کام انجام دینے والوں کو ابدی نعمت و لذت سے نوازے گا اور بدکرداروں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچا کر ابدی عذاب میں مبتلا کرے گا۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ تمام گزشتہ پیغمبروں نے، معاد اور روز قیامت کے بارے میں لوگوں کو یاد دہانی کرائی ہے۔

دوسرے آسمانی ادیان بھی دین اسلام کے مانند، معاد کو ثابت کرتے ہیں، اس کے علاوہ آثار قدیمہ کے توسط سے ہزاروں سال پرانی قبروں کی کھدائی سے ایسے آثار و علائم ہاتھ آ رہے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا اور ماقبل تاریخ کے بشر بھی انسان کے لئے موت کے بعد ایک قسم کی زندگی کا قائل تھا، اور یہاں سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے انسان اپنی سادہ سوچ سے بھی نیک انسانوں کے لئے جزا اور بدکاروں کے لئے سزا کا قائل ہے اور اس کے لئے ایک معین دن کو جانتے ہیں، چونکہ ایسا دن اس دنیا میں موجود نہیں ہے، اس لئے اس کا دوسری دنیا میں ہونا ضروری ہے۔

ادیان و مل کی نظر میں معاد

تمام وہ مذاہب جو خدا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور انسان کو نیک کام انجام دینے کا حکم اور بدکاری سے روکتے ہیں، وہ موت کے بعد معاد اور دوسری زندگی کے قائل ہیں، کیونکہ وہ ہرگز معین نہیں کرتے ہیں کہ نیک کام کی اس وقت قدر و قیمت ہوگی جب نیکی کی جزا ہوگی اور چونکہ یہ جزا اس دنیا میں دیکھی نہیں جاسکتی ہے، اس لئے مرنے کے بعد دوسری دنیا اور ایک دوسری زندگی میں اس کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس دن کو کہ جسے قیامت کا دن کہا ہے، پوری وضاحت سے ثابت کیا ہے اور اس کی ناقابل انکار حالت میں تعارف کراتا ہے۔ اس پر اعتقاد کو دین کے تین اصولوں میں سے ایک شمار کرتا ہے اور قرآن مجید میں اسی مطلب کو سابقہ پیغمبروں کی دعوت سے نقل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ، آثار قدیمہ کے کشف ہوئے بہت سے مقبروں سے کچھ ایسے آثار و علامتیں پائی گئی ہیں، جو اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ قدیم انسان موت کے بعد دوسری زندگی پر ایمان رکھتا تھا اور اپنے عقائد کے مطابق کچھ فرائض انجام دیتا تھا تاکہ لوگ اس دنیا میں آرام و آسائش حاصل کریں۔

قرآن مجید کی نظر میں معاد

قرآن مجید نے سیکڑوں آیات میں معاد سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے، اور اس کے بارے میں ہر قسم کے شک و شبہ کی نفی کی ہے بصیرت کی افزائش اور عدم امکان کو دور کرنے کے لئے اور اشیاء کی اولین خلقت اور خدا کی قدرت مطلقہ کے بارے میں بہت سے مواقع پر لوگوں کو یاد دہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے: (اولم یر الانسان انا خلقناه من نطفۃ فاذا ہو خصیم میں*) و ضرب لنا مثلا ونسی خلقه قال من یحیی العظام وہی رمیم*) قل یتحییہا الذی انشاہا اول مرۃ وہو بکل خلق علیم*) ”تو کیا انسان نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے اور وہ یکبارگی ہمارا کھلا ہوا دشمن ہو گیا ہے اور ہمارے لئے مثل بیان کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول گیا ہے، کہتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ

ہر مخلوق کا بہتر جاننے والا ہے،“ اور کبھی جاڑے میں مردہ ہو جانے والی زمین کو بہار میں زندہ کر کے لوگوں کے انکار کو خدا کی قدرت کی طرف متوجہ کیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے: (ومن آياته انك ترمي الارض نخعة فاذا انزلنا عليها الماء اهتزت وربت ان الذي احياها لمحي الموتى انه على كل شيء قدير^۱) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم زمین کو صاف اور مردہ دیکھ رہے ہو اور پھر جب ہم نے پانی برسا دیا تو زمین لہلہا نے لگی اور اس میں نشوونما پیدا ہو گئی، بیشک جس نے زمین کو زندہ کیا ہے وہی مردوں کا زندہ کرنے والا بھی ہے اور یقیناً وہ ہر شے پر قادر ہے،“ اور کبھی عقلی استدلال سے سامنے آکر انسان کی خدا داد فطرت کو اس حقیقت کے اعتراف پر ابھارا ہے، چنانچہ فرماتا ہے: (وما خلقنا السماء والارض وما بينهما باطلا ذلك ظن الذين كفروا من النار* ام نجعل الذين آمنوا وعملوا الصالحات كالمفسدين في الارض ام نجعل المتقين كالفجار^۲) اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کو بیکار نہیں پیدا کیا ہے (کیونکہ اگر مقصد یہی ہوتا کہ مثلاً انسان پیدا ہوتا اور چند دن گھومنے کے بعد سوتا اور مرجاتا اور اس طرح دوسرا انسان آتا اور اس سلسلہ کی تکرار ہوتی تو کائنات کی خلقت بیہودہ اور ایک کھلونے سے زیادہ نہ ہوتی، جبکہ بیہودہ کام خدا سے کبھی انجام نہیں پاتا ہے) یہ تو صرف کافروں کا خیال ہے اور کافروں کے لئے جہنم میں ویل کی منزل ہے کیا ہم ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دیدیں یا صاحبان تقویٰ کو فاسق و فاجر افراد جیسا قرار دیدیں۔ (کیونکہ اس دنیا میں اچھا اور برا کام انجام دینے والے اپنے اعمال کی مکمل جزا نہیں پاسکتے، اگر دوسری دنیا نہ ہوتی، کہ جہاں ان دونوں گروہوں کو ان کی رفتار و کردار کے مطابق واقعی سزا ملتی تو وہ دونوں گروہ خدا کے نزدیک یکساں ہوتے اور یہ عدل الہی کے خلاف ہے)۔

موت سے قیامت تک

بدن مرتا ہے نہ کہ روح

اسلام کی نظر میں، انسان، روح و بدن سے تشکیل پائی ہوئی ایک مخلوق ہے۔ انسان کا جسم بھی بذات خود مادہ اور مادہ سے مربوط قوانین کی ترکیبات میں سے ایک ہے یعنی اس کے لئے حجم اور وزن ہے۔ اس کی زندگی ایک زمان و مکان میں ہے، سردی، گرمی وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے اور تدریجاً بوڑھا اور کمزور ہوتا ہے اور ایک دن خدائے متعال کے حکم سے پیدا ہوا تھا، آخر کار ایک دن تجزیہ ہو کر نابود ہو جاتا ہے۔ لیکن روح مادی نہیں ہے اور مادہ کی مذکورہ خاصیتوں میں سے کوئی ایک اس میں نہیں پائی جاتی ہے بلکہ علم، احساس، فکر اور ارادہ کی صفت کے علاوہ دوسری معنوی صفات جیسے: محبت، کینہ، خوشی، غم، اور امید وغیرہ اس سے مخصوص ہیں۔ اور چونکہ روح میں مادہ کی مذکورہ خصوصیتیں نہیں پائی جاتیں۔

لہذا معنوی خاصیتیں بھی مادی خاصیتوں سے الگ ہیں بلکہ دل و دماغ اور بدن کے دوسرے تمام اجزاء اپنی بے شمار سرگرمیوں میں روح اور معنوی صفات کے تابع ہوتے ہیں، اور بدن کے اجزاء میں سے کسی ایک کو فرمانروا کا مرکز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ * ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نَظْفَةً فِي قرارٍ مَكِينٍ * ثُمَّ خَلَقْنَا النَّفْثَةَ عِلْقَةً فَخَلَقْنَا الْعِلْقَةَ مَضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمَضْغَةَ عِظًا فَكُنَّا الْعِظَ كَآثِمٍ * ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخِرًا) ”اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے پھر اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا کر رکھا ہے۔ پھر نطفہ کو علقہ بنایا ہے اور پھر علقہ سے مضغہ پیدا کیا ہے اور پھر مضغہ سے ہڈیاں پیدا کی ہیں اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا ہے۔ پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا ہے۔“

اسلام کی نظر میں موت کے معنی

مذکورہ اصل کے مطابق اسلام کی نظر میں موت کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان نابود ہوتا ہے بلکہ یہ ہے کہ انسان کی روح لافانی ہے بدن سے اسکا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے، نتیجہ میں بدن نابود ہو جاتا ہے اور روح بدن کے بغیر اپنی زندگی کو جاری رکھتی ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (وَقَالُوا إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَهِيَ الْأَرْضُ الَّتِي خَلَقَ جَدِيدًا بَلْ هُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ) * قُلْ يَتُوكَلِّمُ الْمَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي ذُكِّلَ بِكُمْ (۱) (۲) اور کہتے ہیں کہ اگر ہم زمین میں گم ہو گئے (مر گئے) تو کیا نئی خلقت میں پھر ظاہر کئے جائیں گے۔ بات یہ ہے کہ یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔ آپ کہد بیجئے کہ تم کو وہ ملک الموت زندگی کی آخری منزل تک پہنچائے گا جو تم پر تعینات کیا گیا ہے۔“

برزخ

اسلام کا نظریہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ایک خاص طریقے سے زندہ رہتا ہے۔ اگر اس نے نیکی کی ہو تو اسے نعمت و سعادت ملتی ہے اور اگر براتھا تو عذاب میں ہوگا، اور جب قیامت برپا ہوگی تو اسے عام حساب و کتاب کے لئے حاضر کیا جائے گا۔ جہاں پر انسان مرنے کے بعد قیامت تک زندگی کرتا ہے اسے ”عالم برزخ“ کہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں خدائے متعال فرماتا ہے: (۱) وَمَنْ وَرَّأَيْكُمْ يَوْمَ بَرَزَخَ الِیْ یَوْمِ یَبْشُرُونَ (۲) ”اور ان کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے“ (ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احياء عند ربهم یرزقون) (۳) اور خبردار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پا رہے ہیں۔“ قیامت یقینی ہے ہر انسان (بلا استثنا) اپنی خداداد فطرت سے اچھائی اور برائی کام میں فرق کو محسوس کرتا ہے اور نیک کام کو (اگرچہ اس پر عمل نہ کرتا ہو) اچھا اور لازم العمل جانتا ہے اور برے کام کو (اگرچہ اس میں پھنسا بھی ہو) برا اور لازم الایعتاب جانتا ہے۔ اس میں کسی

۱ سجده ۱۰، ۱۱

۲ مؤمنون ۱۰۰

۳ آل عمران ۱۶۹

قسم کا شک و شبہ نہیں ہے کہ اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی ان دونوں صفتوں میں موجود سزا اور جزا کی بہت سے ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسا دن نہیں ہے جس میں اچھے اور برے انسانوں کو ان کی اچھائی اور برائی کی سزا اور جزا دی جائے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سے نیک انسان اپنی زندگی انتہائی تنہی اور سختی میں گزارتے ہیں اور بہت سے برے انسان جو گناہ اور ظلم و ستم میں آلودہ ہیں لیکن پھر بھی خوشی اور آرام و آسائش میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس بنا پر کہ اگر انسان کے لئے اپنے مستقبل میں اور اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیا میں ایک ایسا دن نہ ہو کہ جس میں اس کے نیک اور برے اعمال کا حساب کر کے اسے مناسب سزا و جزا دی جائے یہ نظریہ (نیک کام اچھا اور واجب الاطاعت ہے اور برا کام برا اور واجب الاجتناب ہے) انسان کی فطرت میں قرار پایا ہے۔

یہ تصور نہیں کیا جانا چاہئے کہ نیک کام کرنے والوں کی جزا جسے انسان اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ معاشرہ کے انتظامات برقرار ہوتے ہیں اور نیک لوگ زندگی کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور نتیجہ میں اس منافع کا ایک حصہ خود نیکی کرنے والے کو ملتا ہے اور اسی طرح بدکار اپنے نامناسب کردار سے معاشرہ کو درہم برہم کر دیتا ہے اور اس کا نامناسب کام آخر کار خود اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، کیونکہ یہ تصور اگرچہ سماج کے پسماندہ اور مفلس طبقہ کے لوگوں میں کسی حد تک پایا جاتا ہے، لیکن جو لوگ اپنی قدرت کے عروج پر پہنچے ہیں اور معاشرہ کا انتظام و خلل ان کی خوشنہی اور کامیابی میں موثر نہیں ہے بلکہ معاشرہ میں جس قدر افراد فاسق اور فساد ہو اور لوگوں کے حالات بدتر ہوں وہ زیادہ خوشحال اور کامیاب ہوتے ہیں اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ ان افراد کی فطرت نیک کام کو نیک اور برے کام کو برا جانے یہ بھی تصور نہیں کرنا چاہئے کہ یہ لوگ اگرچہ اپنی چند روزہ زندگی میں کامیاب رہے ہوں، لیکن کسی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ کے لئے عام طور پر آنے والی نسلوں کی نظروں میں ننگ و عار سمجھا جائے گا، کیونکہ ان کے نام کا ننگ و عار کی صورت میں ظاہر ہونا اور لوگوں کا ان کے بارے میں خیال رکھنا اس وقت ہوگا، جب وہ مر چکے ہوں گے اور اس ننگ و عار کا ان کی اس دنیا میں گئے خوشحال اور لذت اندوز زندگی پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا۔ اس صورت میں کوئی

دلیل نہیں ہوگی کہ انسان نیک کام کو اچھا جان کر اسے انجام دے اور برے کام کو برا جان کر اس سے پرہیز کرے، اور اس طرح مذکورہ نظریہ کا قائل ہو۔ اگر معاد کا وجود نہ ہو تو یہ اعتقاد قطعاً ایک خرافائی اعتقاد ہوگا۔ لہذا ہمیں خالق کائنات کی طرف سے ہماری فطرت میں ودیعت کئے گئے اس مقدس اور مستحکم اعتقاد سے یہ سمجھنا چاہئے کہ معاد کا ہونا ضروری ہے اور انسان کے لئے ضرور ایک دن ایسا آئے گا، جس دن اسے خالق کائنات کے حضور اس کی رفتار و کردار کے حساب و کتاب کے لئے پیش کیا جائے گا جہاں پر اسے نیک کاموں کی جزا اور برے کاموں کی سزا دی جائے گی۔

عدل: خدائے متعال عادل اور دادرس ہے، کیونکہ ”عدل“ صفات کمالیہ میں سے ایک ہے، اور خدائے متعال تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں عدل کی بار بار تعریف اور ظلم و ستم کی مذمت کرتا ہے، اور لوگوں کو عدل کا حکم دیتا ہے اور ظلم سے روکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جس چیز کو برا سمجھتا ہو وہ خود اس میں پائی جاتی ہو اور جس چیز کو نیک اور خوبصورت سمجھتا ہو وہ اس میں موجود نہ ہو! سورۃ نساء میں فرماتا ہے: (ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ) ”خدا کے لئے متعال ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا“، نیز سورۃ کف میں فرماتا ہے: (ولا یظلم بہک احد) ”تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے“ اسی طرح سورۃ نساء میں فرماتا ہے: (ما اصابک من حۃ فمن اللہ وما اصابک من سۃ فمن نفسک) ”تم تک جو بھی اچھائی اور کامیابی پہنچی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو بھی برائی پہنچی ہے وہ خود تمہاری طرف سے ہے۔“

سورۃ سجدہ میں فرماتا ہے: (الذی احسن کل شیء خلقہ) ”اس نے ہر چیز کو حسن کے ساتھ بنایا ہے۔“ اس بنا پر، ہر مخلوق اپنی جگہ پر انتہائی حسن کے ساتھ خلق کی گئی ہے۔ بعض مخلوقات میں جو بد صورتی یا مناسب یا عیب و نقص پایا جاتا ہے، وہ موازنہ اور نسبت کی وجہ سے پیش آتا ہے۔ مثلاً سانپ اور بچھو کا وجود ہماری نسبت بد اور نامناسب ہے اور کانٹے کو جب پھول سے موازنہ کیا جاتا ہے

۱ نساء، ۴۰

۲ کہف، ۴۹

۳ نساء، ۷۹

۴ سجدہ، ۱

تو کتنا زبا نہیں ہوتا، لیکن یہ سب اپنی جگہ پر حیرت انگیز مخلوق اور سراپا خوبصورت ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ تمام اشیاء اپنے وجود اور وجود کی بقا میں جس جس چیز کی محتاج ہیں اور ان میں سے جو عیب پایا جاتا ہے، وہ انہیں خود رفع نہیں کر سکتیں اور وہ اتفاقی طور پر اور خود بخود بھی رفع نہیں ہو سکتا۔

بلکہ یہ سب عالم مشہود سے مافوق ایک مقام کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ وہی ہے جو ہر حاجت اور عیب کو دور کرتا ہے، البتہ خود ہر حاجت و عیب سے پاک و منزہ ہے ورنہ دوسرے مبداء کی ضرورت پڑے گی جو اس کے عیب و نقص کو دور کرے اور اس صورت میں وہ خود بھی عالم کے ضرورت مندوں میں سے ایک قرار پائے گا۔ وہی ہے جو اپنی لامتناہی قدرت اور علم سے کائنات کی ہر مخلوق کو وجود بخشتا ہے کائنات اور کائنات میں موجود ہر شے کو بحال کی شاہراہ پر ناقابل استثناء قوانین کے ذریعہ مقصد اور کمال کی منزل کی طرف راہنمائی کرتا ہے اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتے ہیں: ۱۔ خدائے متعال کائنات میں، مطلق سلطنت کا مالک ہے اور ہر مخلوق جو وجود میں آتی ہے اور ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے، ان کا سرچشمہ اس کا حکم و فرمان ہے۔

چنانچہ فرماتا ہے: (..لہ الملک ولہ الحمد!.. مطلق سلطنت اور بادشاہی اسی سے مخصوص ہے اور حقیقت میں ہر ستائش کا وہی سزاوار ہے کیونکہ نیکی اور اچھائی اس کی خلقت سے پیدا ہوئی ہے، “(..انِ الحکمِ اللہ“.. حقیقت میں ہر حکم خدائے متعال کی طرف سے ہے۔“

۲۔ خدائے متعال عادل ہے، کیونکہ عدالت حکم میں یا اس کے جاری ہونے کی صورت میں یہ ہے کہ اس میں استثنا اور امتیاز نہیں ہے۔ یعنی جو موقع حکم سے مربوط ہیں وہ یکساں ثابت ہوں اور جو موقع قابل نفاذ ہیں وہ یکساں نافذ کئے جائیں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ کائنات اور اس میں موجود چیزوں کا نظم و نسق کچھ ناقابل استثناء قوانین کے سایہ میں ہیں۔ جن کا مجموعہ قانون علیت و معلولیت ہے۔

^۱ تغابن ۱

^۲ یوسف ۴۰

چل رہا ہے۔ مثلاً آگ کچھ خاص شرائط کے ساتھ ایک جلنے والی چیز کو جلائے گی، خواہ یہ کالا کوئلہ ہو یا ہیرا، ہشک لکڑی ہو یا ایک ضرورت مند مفلس کا لباس۔ اس کے علاوہ جس نے عدالت کو نظر انداز کیا وہ اپنی کچھ ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ظلم و ستم کو انجام دیتا ہے۔ خواہ یہ ضرورت مادی ہو جیسے کوئی شخص دوسرے کے مال کو لوٹ لیتا ہے اور اپنے انبار میں اضافہ کرتا ہے یا معنوی ضرورت ہو جیسے کوئی شخص دوسروں کے حقوق پر تجاوز کر کے یا قدرت اثر و رسوخ اور تسلط کا اظہار کر کے لذت محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ یہ معلوم ہوا کہ خالق کائنات کی ذات اقدس کے بارے میں کسی قسم کی حاجت قابل تصور نہیں ہے اور جو بھی حکم اس کے منع جلال سے جاری ہوتا ہے اگر ایک تکوینی حکم ہے تو وہ عام مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے ہے کہ خلقت کے لئے جس کی مراعات ضروری ہے اور اگر ایک تشریعی حکم ہے تو وہ اس کے بندوں کی سعادت اور خوشنہی کے لئے ہے اور اس کا نفع انہی کو ملتا ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ)۔

خدائے متعال ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے، (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا عَلِمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ یُظْلَمُونَ) (غافر، ۳۱) ”خدائے متعال اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا ہے۔“

امامت اور امت کی رہبری: اسلامی معاشرہ کے دینی اور دنیوی امور کی سرپرستی کو ”امامت“ کہتے ہیں۔ امامت دین اسلام کے مقدس اصولوں میں سے ایک مسلم اصول ہے۔ جن آیات میں خدائے متعال نے اپنے دین کی تشکیل کو بیان کیا ہے، ان میں اس مطلب کی بھی وضاحت کی ہے ”امامت“ کا مقصد لوگوں کی دنیا میں دین کی رہبری کرنا ہے اور پیشوا شخص کو ”امام“ کہتے ہیں۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خدائے متعال کی طرف سے ایک امام معین ہونا چاہئے تاکہ وہ معارف اور دینی احکام کا محافظ و نگہبان ہو اور حق کی طرف لوگوں کی راہنمائی کرے۔ جب ایک ملک میں ایک حکومت تشکیل پاتی ہے اور وہ لوگوں کے عمومی کام کا نظم و نسق ہے، تو وہ کام خود بخود انجام نہیں پاتا بلکہ اگر کچھ شائستہ افراد اور

ماہر لوگ اس کی حفاظت کی کوشش نہ کریں تو نظام باقی ہی نہ رہے اور لوگوں کو اپنے فوائد سے بہرہ مند بھی نہ کر سکے۔ انسانی معاشرہ میں جو بھی ادارہ وجود میں آتا ہے، جیسے ثقافتی اور مختلف اقتصادی ادارے، وہ بھی یہی حکم رکھتے ہیں اور ہرگز قابل وراثتہ مدیروں سے بے نیاز نہیں ہیں ورنہ بہت ہی کم مدت میں نابود ہو جائیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جسے سادہ لوح انسان بھی سمجھتا ہے اور بہت سے تجربوں اور آزمائشوں سے بھی اس کے صحیح ہونے کی گواہی ملتی ہے۔ بیشک دین اسلام کا نظام بھی یہی حکم رکھتا ہے کہ جس کے بارے میں جرأت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا نظام ہے اور وہ اپنی بقا اور حفاظت میں بھی مدیروں کا محتاج ہے اور ہمیشہ وراثتہ افراد کو چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے قوانین اور معارف کو لوگوں تک پہنچائیں اور اس کے دقیق ضوابط اور قوانین کو اسلامی معاشرہ میں نافذ کریں اور ان کی رعایت اور حفاظت میں کسی قسم کی غفلت و لاپرواہی نہ کریں۔

دوسرے اعتبار سے، یہ کہ ہم نے نبوت کی دلیل میں ذکر کیا ہے، کہ خلقت کے مقاصد میں سے ایک مقصد لوگوں کی سیدھے راستہ پر ہدایت کرنا ہے۔ جس طرح خدائے متعال نے اپنی تمام مخلوقات کی ضرورتوں کو پورا کیا ہے اور ان کی ترقی کے وسائل کو ان کے اختیار میں دیدیا ہے، اس طرح اس کے اے ضروری ہے کہ انسان کے صحیح عقائد پرندہ اخلاق اور نیک کاموں کی ضرورتوں کو پور کرنے کے لئے انبیاء کو بھیجے تاکہ وہ اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔

اسی دلیل کی بنا پر، خدائے مہربان کو چاہئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد دین کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت کے لئے امام اور پیشوا معین کرے اور لوگوں کو ان کی مرضی پر نہ چھوڑے، جو اکثر اوقات ہوا و ہوس سے مغلوب ہوتی ہے۔ جس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی ضرورتوں اور انسان کی انفرادی و اجتماعی بیماریوں کے علاج سے آگاہ کیا اور ان کو ہر طرح کے سہ و نمان سے محفوظ رکھا، اسی طرح ضروری ہے کہ امام اور ایک دینی پیشوا کو بھی علم و عصمت عطا کرے۔ اس عقلی دلیل سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں کی ہدایت، دین کے تحفظ اور اسلام کے قوانین کو نافذ کرنے کیلئے خدا کی طرف سے امام معین ہو۔

امام کی ضرورت پر ایک نقلی دلیل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے کہ امت اسلامیہ کے لئے آپ کی رحلت کے بعد بعض پیشوا اور امام میں جو آپ کے جانشین ہوں گے۔ ایک معروف روایت جسے شیعہ و سنی راویوں نے نقل کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”امام بارہ افراد ہوں گے اور سب کے سب قریش سے ہوں گے“^۱۔ ایک اور مشہور روایت میں آنحضرتؐ نے جابر انصاری سے فرمایا: ”امام بارہ افراد میں“^۲ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک کر کے ان کے نام بتائے اور جابر سے فرمایا: ”تم اماموں میں سے پانچویں امام کو درک کرو گے، ان کو میرا سلام کہنا“^۳۔

اس کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کو (خصوصاً) اپنے جانشین کے طور پر تعین فرمایا ہے، آپ نے بھی اپنے بعد والے امام کا تعارف کرایا، اسی طرح ہر امام نے اپنے بعد والے امام کا تعارف کرایا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب سے تاریخ بشریت کا آغاز ہوا اور انسانیت کے خاندان میں اجتماعی زندگی بڑھتی گئی، تو دنیا کے اطراف و اکناف میں، چھوٹے یا بڑے، ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ معاشرے وجود میں آتے گئے، لیکن حاکم اور سرپرست کے بغیر کوئی معاشرہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا۔ جہاں پر بھی کوئی معاشرہ تشکیل پایا اس میں ایک حاکم اور سرپرست ضرور غلبہ یا انتخاب کے ذریعہ ہوا کرتا تھا، یہاں تک کہ چھوٹے اور چند افراد پر مشتمل خاندانوں میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ بیشک یہاں پر انسان اپنی خداداد فطرت سے سمجھتا ہے کہ ہر معاشرہ کے لئے ایک سرپرست کی ضرورت ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (فاقم وجہک للذین حنیفاً فطرت اللہ اتی فطر الناس علیہا لا تبدیل خلق اللہ ذلک الدین القیم)^۴۔ آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الہی میں کوئی تبدیلی نہیں

^۱ احمد بن حنبل، مسند، ج ۵، ص ۹۲۔

^۲ ینابیع المودہ، باب ۷۷، ص ۵۰۳۔

^۳ ینابیع المودہ، باب ۹۴، ص ۵۵۳ و ۵۵۴۔

^۴ روم، ۳۰۔

ہو سکتی ہے۔ یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے، پروردگار عالم، اس آیہ شریفہ میں اپنے دین کو دین فطرت سے تعبیر کرتا ہے اور بیان فرماتا ہے کہ اس مقدس دین کے احکام ان چیزوں کے مطابق ہیں کہ جن کو انسان اپنی خالص فطرت سے سمجھتا ہے۔ خدائے متعال، اس آیہ شریفہ میں، انسان کے تمام فطری ادراکات اور اس کی خالص فطرت کے فیصلوں کو معتبر قرار دیتا ہے اور ان کی تائید کرتا ہے ان فطری فیصلوں میں سے ایک معاشرہ کی سرپرستی اور اسکی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔

ولایت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان خدائے متعال اپنے پیغمبر اکرم کی توصیف میں فرماتا ہے: (لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریض علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم) ”یقیناً تمہارے پاس وہ پیغمبر آیا ہے جو تمہیں میں سے ہے اور اس پر تمہاری ہر مصیبت شاق ہوتی ہے وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حرص رکھتا ہے اور مؤمنین کے حال پر شفیق اور مہربان ہے“، اس بات پر ہرگز یقین نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ پیغمبر جو قرآن مجید کی نص کے مطابق اپنی امت پر تمام لوگوں سے زیادہ ہمدرد و مہربان تھا، وہ احکام الہی میں سے ایک حکم کے بارے میں اپنی پوری عمر خاموش رہے، اور اس کے بیان سے چشم پوشی کرے جو اسلامی معاشرہ میں بلا شک و شبہ پہلے درجہ کی اہمیت کا حاصل ہو اور عقل سلیم اور فطرت کے مطابق ہو۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام لوگوں سے بہتر جانتے تھے کہ اسلام کا تشکیل پایا ہوا یہ وسیع نظام (جو دنیا کے وسیع ترین نظاموں میں سے ہے) صرف دس بیس سال تک کے لئے نہیں ہے کہ اس کی سرپرستی کو آپ خود کریں بلکہ یہ نظام عالم بشریت کو ہمیشہ چلانے والا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد ہزاروں سال تک کے حالات کے بارے میں دور اندیشی فرماتے تھے، اور اس سلسلہ میں ضروری احکام جاری فرماتے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ دین، ایک اجتماعی نظام ہے اور کوئی بھی اجتماعی نظام حاکم اور سرپرست کے بغیر ایک گھنٹہ کے لئے بھی زندہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس بنا پر، سرپرستی ضروری ہے تاکہ دین کے معارف اور قوانین کی حفاظت کی جائے اور معاشرہ کے نظام کو چلایا جاسکے اور لوگوں کی دنیا و آخرت کی سعادت کی طرف

رہنمائی و رہبری کی جائے۔ لہذا کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رحلت کے بعد آنے والے کل کو بھول جائیں یا اس کے بارے میں کوئی دچکپی نہ رکھیں؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی جنگ یاجج کے لئے صرف کچھ دنوں کے لئے مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے تو لوگوں کے امور کو چلانے کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا جانشین مقرر فرماتے تھے اور اسی طرح مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئے شہروں کے لئے گورنر مقرر فرماتے تھے اور جنگ پر روانہ ہونے والے فوجی لشکر یا گروہ کے لئے کمانڈر اور امیر مقرر فرماتے تھے اور کبھی اس حد تک فرماتے تھے کہ: ”تم لوگوں کا امیر فلاں شخص ہے اگر وہ مارا گیا تو فلاں شخص ہوگا“۔ پیغمبر اکرمؐ کی اس روش کے باوجود کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ آئنے اپنے سفر آخرت کے موقع پر اپنی جگہ پر کسی کو معین نہیں کیا ہوگا؟

مختصر یہ کہ جو بھی شخص گہری نگاہ سے اسلام کے بلند مقاصد اور ان کو لانے والے عظیم الشان پیغمبر کے مقصد پر نظر ڈالے تو کسی شک و شبہ کے بغیر تصدیق کرے گا کہ مسلمانوں کے لئے ولایت و امامت کا مسئلہ حل شدہ اور واضح ہو چکا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جانشین کا تقرر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد مسلمانوں کے امور کی سرپرستی اور مسئلہ ولایت کے سلسلہ میں صرف سربستہ بیانات پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ پہلے ہی دن سے توحید و نبوت کی دعوت کے ساتھ ساتھ مسئلہ ولایت کو بھی واضح طور پر بیان فرمایا اور دین و دنیا کے تمام امور میں حضرت علی علیہ السلام کی سرپرستی اور جانشینی کو تمام مسلمانوں میں اعلان فرمایا۔ جیسا کہ بیان ہوا، اس روایت کے مطابق جسے شیعہ و سنی راویوں نے نقل کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب پہلے دن اعلانیہ دعوت دینے پر مامور ہوئے۔ تو آئنے اپنے رشتہ داروں کو دعوت دی اور انھیں ایک جگہ پر جمع کیا اور اس محفل میں حضرت علی علیہ السلام کے وزیر، وصی اور خلیفہ ہونے کو آشکار طور پر ثابت اور مستحکم فرمایا اور اسی طرح اپنی زندگی کے آخری ایام میں غدیر خم کے مقام پر ایک لاکھ بیس ہزار کے ایک عظیم مجمع میں حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو پکڑ کر بلند کر کے فرمایا: ”من کنت مولاه فذا علی مولاه“ جس جس کا میں مولا ہوں، اس کے یہ علی بھی مولا ہیں، امامت کی ضرورت پر

ایک دلیل چنانچہ نبوت کی بحث میں واضح ہوا کہ خالق کائنات کا اپنی مخلوق پر عنایت و توجہ کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی مخلوقات میں سے ہر مخلوق کی معین مقصد (جو کمال کے درجہ تک پہنچنا ہے) کی طرف رہنمائی کرے مثال کے طور پر پھل دار درخت کی رشد، نمو، کوپلیں کھلنے اور پھل دینے کی طرف راہنمائی کی جائے اور اسکی زندگی کا طریقہ ایک پرندہ کی زندگی کے طریقہ سے جدا ہے۔ اس طرح ایک پرندہ بھی اپنی زندگی خاص راستہ کو طے کرتا ہے اور اپنے خاص مقصد کے پیچھے جاتا ہے نہ کہ درخت کے راستہ اور مقصد کے پیچھے، اسی طرح ہر مخلوق کی اپنی منزل مقصود تک پہنچنے اور مناسب راستہ کو طے کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف راہنمائی نہیں کی جاتی اور معلوم ہے

کہ انسان بھی خدا کی ایک مخلوق ہونے کے ناطے ہدایت کے اس مکی قانون میں شامل ہے۔ واضح ہوا کہ انسان کی زندگی کی سعادت چونکہ خود اس کے اختیار اور ارادہ سے حاصل ہوتی ہے، لہذا ہدایت الہی اور دعوت و تبلیغ بھی انبیاء اور دین کو بھیجنے کے ذریعہ ہونی چاہئے تاکہ خدائے تعالیٰ پر انسان کی کوئی حجت باقی نہ رہے۔

ذیل کی آیت اسی معنی پر دلالت کرتی ہے: (رسلًا بَشَرِینَ وَمُزَرِّیْنَ لِّلْکَلِیْمِیْنَ لِّلنَّاسِ عَلٰی اللّٰہِ حِجَّۃًۢ بَعْدَ الرِّیْلِ) ”یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خدا پر قائم نہ ہونے پائے، جو دلیل پیغمبروں کے بھیجنے اور دین کی دعوت کی برقراری کا تقاضا کرتی ہے وہی دلیل اس چیز کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ اپنی عصمت سے دین کی حفاظت اور لوگوں کی رہبری کرنے والے پیغمبر کی رحلت کے بعد، خدائے تعالیٰ کو چاہئے کہ اوصاف کمالی میں (وحی و نبوت کے علاوہ) آپ کے مانند ایک شخص کو آپ کا جانشین مقرر فرمائے تاکہ وہ دین کے معارف اور احکام کی کسی انحراف کے بغیر حفاظت کرے اور لوگوں کی رہنمائی کرے، ورنہ عام ہدایت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور خدائے تعالیٰ پر لوگوں کی حجت تمام ہو جائے گی۔

امام کی ضرورت

عقل میں چوں کہ خطا و لغزش پائی جاتی ہے لہذا وہ لوگوں کو خدا کے پیغمبروں سے بے نیاز نہیں کر سکتی، اسی طرح امت میں علمائے دین کی موجودگی اور انکی دینی تبلیغات، لوگوں کو امام کے وجود سے مستغنی نہیں کر سکتے، کیونکہ جیسا کہ واضح ہوا کہ بحث اس میں نہیں ہے کہ لوگ دین کی پیروی کرتے ہیں یا نہیں بلکہ بحث اس چیز میں ہے کہ خدا کا دین کسی قسم کی تحریف و تبدیلی یا نابودی کے بغیر لوگوں تک پہنچ سکے۔ معلوم ہے کہ علمائے امت کتنے بھی صالح اور متقی ہوں، لیکن خطا و گناہ سے محفوظ و معصوم نہیں ہیں اور بعض معارف اور دینی قوانین کا ان سے پائمال ہونا یا تبدیل ہونا، اگرچہ عدا نہ ہو، محال نہیں ہے۔ اس کی بہترین دلیل اسلام میں گونا گون مذاہب اور اختلافات کا وجود میں آنا ہے۔ لہذا، ہر حالت میں امام کا وجود لازم اور ضروری ہے تاکہ دین خدا کے معارف اور اس کے حقیقی قوانین اس کے پاس محفوظ رہیں اور جب بھی لوگوں میں استعداد پیدا ہو جائے وہ ان کی رہنمائی سے استفادہ کر سکیں۔

امام کی عصمت

مذکورہ بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ امام کو بھی پیغمبر کے مانند خطا و معصیت سے محفوظ ہونا چاہئے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دین کی دعوت ناقص رہے گی اور الہی ہدایت اپنا اثر کھودے گی۔

امام کے اخلاقی فضائل

امام میں شجاعت، شہامت، عفت، سخاوت اور عدالت جیسی اخلاقی فضیلتیں موجود ہونی چاہئیں، کیونکہ جو معصیت سے محفوظ ہے وہی تمام دینی قوانین پر عمل کرتا ہے اور پسندیدہ اخلاق دین کی ضروریات میں سے ہیں اس لئے اس کو اخلاقی فضائل میں تمام لوگوں سے افضل ہونا چاہئے، کیونکہ کسی کا اپنے سے برتر و بالاتر کی رہبری کرنا بے معنی اور عدل الہی کے منافی ہے۔

امام کا علم

چونکہ امام دین کا حامل اور تمام لوگوں کا پیشوا ہوتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی دنیا و آخرت اور انسان کی سعادت سے متعلق تمام مسائل کا علم رکھتا ہو، کیونکہ عقل کے مطابق جاہل کا پیشوا بننا جائز نہیں ہے اور عام الہی ہدایت کی رو سے بھی یہ بے معنی ہے۔

ائمہ حدیٰ علیم السلام

ائمہ حدیٰ علیم السلام، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین اور دین و دنیا کے پیشوا ہیں بارہ ہیں۔ اس سلسلہ میں شیعہ و سنی دونوں نے پیغمبر اکرم سے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں اور ان ائمہ میں سے ہر ایک نے اپنے بعد آنے والے امام کو معین فرمایا ہے۔ ائمہ علیم السلام کے اسمائے گرامی

۱۔ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

۲۔ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

۳۔ حضرت امام حسین سید الشہداء علیہ السلام

۴۔ حضرت امام مجاہدین العابدین علیہ السلام

۵۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

۶۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

۷۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

۸۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام

۹۔ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

۱۰۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام

۱۱۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

۱۲۔ حضرت امام عصر، جتہ بن الحسن، عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف

ائمہ اطہار علیہم السلام کی عام سیرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بارہ امام ۲۵۰ سال تک لوگوں کے درمیان تھے۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے دن سے ہی ان کے مخالفین پیدا ہوئے اور ہر ممکن وسیلہ سے خلافت کے عہدے کو غصب کر کے دین کے فطری راستہ کو منحرف کر دیا اس کے علاوہ مذکورہ مخالفین کا گروہ ہر احتمالی خطرے کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے اور اپنی حکومت کی حفاظت میں، اہل بیت پیغمبر اسلام کے نور کو ہر وسیلہ سے بجھانے کے درپے تھے، ہر بہانہ سے ان پر دباؤ ڈالتے، جسمانی اذیتیں پہنچاتے، حتیٰ یہاں تک کہ قتل کرنے کی کوششیں بھی کرتے تھے۔

اسی سبب سے ائمہ ہدی، علیہم السلام عام اصلاحات کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے، یا اسلامی معاشرہ میں اسلام کے معارف و قوانین اور سیرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیع پیمانے پر پھیلانے سے قاصر تھے۔ یہاں تک کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام بھی اپنی ظاہری خلافت کے پانچ سال کے دوران، باند و رونی اختلافات اور طلحہ، زہیر، عائنہ اور معاویہ جیسے دعویداروں اور دیگر بانفوذ صحابیوں کی رخنہ اندازیوں کی وجہ سے ان سے خونین جنگیں لڑتے رہے اور اپنے عالی مقاصد اور اصلاحات تک دہخوہ صورت میں نہ پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ ہدی، خدا کی طرف سے اپنی مؤلیت اور ذمہ داری کے مطابق معاشرہ میں عمومی تعلیم

وتریت، خاص افراد کی تعلیم و تربیت اور معاشرہ کی عمومی اصلاحات جیسے (حتی الامکان) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے پر اکتفا کی۔ یعنی دین کے معارف و قوانین کو کھلم کھلا طور پر معاشرہ میں بیان کرنے اور زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیکر معاشرہ کو دین کی اعلیٰ مصلحتوں کے مطابق چلانے کے بجائے با استعداد اور خاص افراد کی تربیت پر اکتفا کرتے تھے کیونکہ اس کے علاوہ ان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ لوگوں کی خاطر وقت کی حکومتوں کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے قیام کیا کرتے تھے تاکہ اس طرح دین کو نابود ہونے سے بچالیں اور خدا کا نورانی دین، تدریجی طور پر خاموشی کے ساتھ نور افشانی کرتا رہے اور آگے بڑھتا رہے اور ایک دن پھر سے پہلی حالت پیدا کر کے دنیا کو اپنے نور سے منور کر دے۔

ائمہ ہدیٰ علیم السلام میں سے ہر ایک کی زندگی کے حالات اور امامت کے زمانے میں ان کی روش کی تحقیقات سے یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیم السلام

عرف اور لغت میں ”اہل بیت“ اور مرد کا خاندان، مرد کے گھر کے چھوٹے معاشرے کے افراد کو کہا جاتا ہے جن میں بیوی، بیٹے، بیٹیاں اور نوکر شامل ہوتے ہیں جو مجموعی طور پر صاحب خانہ کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ بعض اوقات ”اہل بیت“ کے معنی کو عمومیت دے کر اس لفظ کو اپنے قریبی رشتہ داروں جیسے باپ، ماں، بھائی، بہن، چچا، بھوپھی، ماموں، خالہ اور ان کی اولاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید اور احادیث میں لفظ کلمہ ”اہل بیت“ سے مذکورہ دو عرفی و لغوی معنی میں سے کوئی بھی معنی مراد نہیں ہے۔ کیونکہ شیعہ و سنی سے منقول متواتر احادیث کے مطابق ”اہل بیت“ ایک ایسا عطیہ ہے جو حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیم السلام سے مخصوص ہے۔ اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل خانہ اور دوسرے رشتہ دار، اگرچہ عرف و لغت کے لحاظ سے اہل بیت شمار ہوتے ہیں، لیکن اس اصطلاح کے اعتبار سے اہل بیت نہیں ہیں، یہاں تک کہ حضرت خدیجہ کبریٰ سلام اللہ علیہا جو پیغمبر اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے زیادہ مغز و محترم بیوی اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی والدہ گرامی تھیں اہل بیت میں شمار نہیں ہوتیں اور اسی طرح آنحضرت کے صلبی بیٹے حضرت ابراہیمؑ بھی ”اہل بیت“ کے اس زمرے میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن ان روایتوں اور دیگر احادیث کی رو سے بارہ اماموں میں سے دوسرے نو امام، جو فرزند امام حسین علیہ السلام کی اولاد اور آپ کی نسل میں ہیں، اہل بیت میں ہیں۔ اس بناء پر اہل بیت چودہ معصومین علیہم السلام میں اور معمولاً ”اہل بیت پیغمبر“، وہ تیرہ افراد ہیں جو پیغمبر کے بعد آپ کی عزت کے طور پر مشہور ہیں۔

پیغمبر کے اہل بیت علیہم السلام، اسلام میں بہت سے فضائل و مناقب اور ناقابل موازنہ مقامات کے مالک ہیں، کہ ان میں سے درج ذیل دو مقام سب سے اہم ہیں: ۱۔ آیہ شریفہ (یا ایہا الذین آمنوا لیذہب عنکم الرجز اہل الیت ویطہرکم تطہیراً) کی رو سے مقام عصمت و طہارت پر فائز تھے، اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر گز گناہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

۲۔ حدیث ثقلین، جو متواتر حدیث ہے اور اس سے پہلے اسکی طرف اشارہ کیا گیا، کی رو سے، عزت ہمیشہ قرآن مجید کے ہمراہ میں اور ان میں کبھی جدائی پیدا نہیں ہو سکتی یعنی وہ قرآن مجید کے معنی اور دین مبین اسلام کے مقاصد کو سمجھنے میں کبھی غلط و لغزش سے دوچار نہیں ہو سکتے۔ ان دو مقامات کا لازمی یہ ہے کہ اسلام میں اہل بیت علیہم السلام کا قول و فعل حجت ہے (جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے)

اہل بیت علیہم السلام کی عام سیرت

اہل بیت علیہم السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے مکمل نمونہ ہیں اور ان کی سیرت بالکل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے۔ البتہ ۲۵۰ سال کا عرصہ (یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے ۶۰ سال بعد) حضرت حجت عجل کی غیبت تک) ائمہ ہدی علیہم السلام نے لوگوں کے ساتھ گزارا، اس مدت میں ان کی زندگی مختلف حالات اور

مرآل سے گزری کہ جن میں ائمہ اطہار کی زندگی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی، لیکن وہ اصلی مقصد یعنی اصول دین و فروع دین کو انحرافات اور تبدیلی ہونے سے بچایا اور حتی الامکان لوگوں کی تعلیم و تربیت سے دست بردار نہیں ہوئے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ۲۳ سال کی تبلیغ کے دوران، زندگی کے تین مراحل طے کئے۔ ابتدائی تین سال کے دوران مخفیانہ تبلیغ انجام دیتے تھے، اس کے بعد دس سال تک کھلم کھلا تبلیغ میں مشغول رہے، لیکن اس مدت کے دوران خود آپ اور آپ کے پیرو انتہائی دباؤ اور نہایت جہانی اذیتوں میں زندگی گزارتے تھے اور ہر قسم کی علی آزادی سے محروم تھے جو معاشرہ کی اصلاح میں اثر انداز ہوتی ہے، اور اسکے بعد والے دس سال (جو ہجرت کے بعد میں ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسے ماحول میں تھے کہ جس کا مقصد حق و حقیقت کو زندہ کرنا تھا، اور اسلام دن بہ دن فاتحانہ طور پر آگے بڑھ رہا تھا اور ہر لمحہ لوگوں کے لئے علم و کمال کا ایک نیا باب کھل رہا تھا۔ البتہ واضح ہے کہ ان تین مختلف مراحل کے مختلف تقاضے تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو۔ جس کا مقصد حق و حقیقت کو زندہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گوناگوں صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔

ائمہ ہدیٰ کے زمانہ میں جو مختلف اور گوناگوں حالات رونما ہوئے، وہ تقریباً پیغمبر اسلام کی ہجرت سے پہلے تبلیغی زمانہ سے شبہت رکھتے ہیں۔ کبھی ائمہ اطہار کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہشت کے پہلے تین سال کی طرح کسی بھی صورت میں انہار حق ممکن نہیں تھا اور (وقت کے) امام بڑی احتیاط سے اپنا فریضہ انجام دیتے تھے چنانچہ چوتھے امام کے زمانہ میں اور چھٹے امام کی آخری عمر میں یہی حالت تھی۔ کبھی ہجرت سے پہلے دس سال کے مانند، کہ جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں اعلانیہ طور پر دعوت دیتے تھے اور آپ ہر طرف سے اپنے پیروؤں پر کفار کی اذیتوں کی وجہ سے پریشان تھے، امام بھی معارف دین کی تعلیم اور احکام کی اشاعت میں مشغول ہو جاتے تھے، لیکن وقت کے حکام انہیں جہانی اذیت و تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے اور ان کے لئے ہر دن کوئی نہ کوئی مشکل ایجاد کرتے تھے۔ البتہ پیغمبر اکرم کی ہجرت کے بعد والے ماحول کے مانند جو زمانہ کسی حد تک ہے وہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت ظاہری کے پانچ سال کا زمانہ، حضرت فاطمہ زہرا سلام

علیہا اور امام حسن علیہ السلام کی زندگی کا تھوڑا سا زمانہ اور امام حسین علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کا مختصر اور چند روزہ زمانہ تھا کہ جس میں حق و حقیقت اور کھلم کھلا طور پر ظاہر ہو رہی تھی اور صاف و شفاف آئینہ کی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے جیسے حالات پیش کئے جا رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ ائمہ اطہار علیہم السلام، مذکورہ مواقع کے علاوہ وقت کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی آٹھارا طور پر بنیادی مخالفت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے اپنی رفتار و رفتار میں تقیہ کا طریقہ اپنانے پر مجبور تھے تاکہ وقت کے حکام کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آ سکے، اسکے باوجود ان کے دشمن گونا گوں بہانے بنا کر ان کے نور کو خاموش کرنے اور ان کے آثار کو مٹانے میں کوئی دقیقہ فرو گزار نہیں کرتے تھے۔

وقت کے حکام کے ساتھ ائمہ اطہار کے اختلافات کا اصلی سبب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بعد اسلامی معاشرہ میں تشکیل پانے والی مختلف حکومتیں کہ جو اسلامی حکومت کا لیل لگائے ہوئے تھیں، وہ سب کی سب اہل بیت علیہم السلام سے بنیادی مخالفت رکھتی تھیں اور اس ختم نہ ہونے والی دشمنی کی ایک ایسی جڑ تھی جو کبھی خشک نہیں ہوتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے فضائل اور مناقب بیان فرمائے تھے کہ ان میں سے اہم ترین فضیلت معارف قرآن اور ان کا حلال و حرام کا جاننا تھا، جس کی وجہ سے ان کے مقام کا احترام اور تعظیم کرنا تمام امت پر واجب تھا، لیکن امت نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نصیحت اور تاکید کا حق ادا نہ کیا۔

بیشک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب پہلے دن دعوت دی تو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دی اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی غدیر خم میں اور دوسرے مقامات پر آپ کی جانشینی کا اعلان کیا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین منتخب کیا اور اہل بیت علیہم السلام کو ان کے مسلم حق سے محروم کر دیا، لہذا وقت کے حکام اہل بیت کو ہمیشہ اپنا خطرناک رقیب سمجھتے رہے اور ان سے خائف رہتے تھے، اور ان کا خاتمہ کرنے کے لئے گونا گوں امکانات اور وسائل سے استفادہ

کرتے تھے۔ لیکن اہل بیت علیہم السلام اور اسلامی حکومتوں کے درمیان اختلافات کا سب سے بڑا سبب کچھ اور تھا اگرچہ حکومت اسلامی مسئلہ خلافت کے فروعیات میں سے تھی۔ اہل بیت اطہار علیہم السلام امت اسلامیہ کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی اطاعت کو ضروری سمجھتے تھے اور اسلامی حکومت کو اسلام کے آسمانی احکام کی رعایت، تحفظ اور نفاذ کے لئے ذمہ دار سمجھتے تھے، لیکن جو اسلامی حکومتیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تشکیل پائیں جیسا کہ ان کی کارکردگی سے ظاہر ہے، وہ اسلامی احکام کو مکمل طور پر نافذ کرنے کی رعایت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی اطاعت کرنے کی پابند نہیں تھیں۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں کئی جگہوں پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح امت کو آسمانی احکام میں تبدیلی ایجاد کرنے سے منع فرماتا ہے یہاں تک کہ دینی احکام اور قوانین میں چھوٹی سے چھوٹی خلاف ورزی کی تنبیہ فرماتا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انہی ناقابل تغیر احکام و قوانین کی روشنی میں لوگوں کے درمیان ایک ایسی سیرت اختیار ہوئے تھے کہ دینی قوانین کو نافذ کرنے میں زمان و مکان اور اشخاص کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق نہیں کرتے تھے۔ آسمانی احکام کی رعایت کرنا ہر ایک کے لئے یہاں تک کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے واجب تھا اور یہ احکام ہر ایک کے حق میں لازم الاجرا تھے اور شریعت ہر حال میں اور ہر جگہ پر زندہ اور نافذ تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی مساوات و عدالت کے نتیجے میں لوگوں سے ہر قسم کے امتیاز و فرق کو ہٹایا تھا۔ خود آنحضرت جو خدا کے حکم سے واجب الطاعت حاکم و فرمانروا تھے، اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کی نسبت اپنے لئے کسی قسم کے امتیاز کے قائل نہیں تھے، عیش و عشرت سے پرہیز فرماتے تھے، اپنی حکومتی حیثیت میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتے تھے، اپنی حیثیت کی عظمت کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں فرماتے تھے اور جاہ و شہم کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے اور آخر کار دوسروں سے ایک معمولی اور ظاہری امتیاز سے بھی بچانے نہیں جاتے تھے۔ لوگوں کے مختلف طبقات میں سے کوئی

طبقہ امتیاز کے بل بوتے پر دوسروں پر فضیلت نہیں جتلاتا تھا، عورت و مرد، اونچے اور نیچے طبقہ کے لوگ، غنی و فقیر، قوی و کمزور، شہری و دیہاتی اور غلام و آزاد سب ایک صف میں تھے اور کوئی بھی اپنے دینی فرائض سے زیادہ کا پابند نہ تھا اور معاشرہ کے قوی لوگوں کے سامنے جھکنے اور ظالموں کے سامنے حقیر ہونے سے معاشرہ کا ہر فرد محفوظ تھا۔

تھوڑا غور و فکر کرنے سے ہمارے لئے واضح ہو جاتا ہے (مخصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے آج تک جو ہم نے اندازہ کیا ہے) کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی سیرت سے صرف یہ مقصد تھا کہ اسلام کے آسمانی احکام لوگوں میں عادلانہ اور مساوی طور پر نافذ ہو جائیں اور اسلام کے قوانین انحراف اور تبدیل ہونے سے محفوظ رہیں، لیکن اسلامی حکومتوں نے اپنی سیرت کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے مطابق و ہم آہنگ نہیں کیا اور روش کو بدل دیا جس کے نتیجے میں: ۱۔ اسلامی معاشرہ میں نہایت کم وقت کے اندر شدید ترین صورت میں طبقاتی اختلافات رونما ہوئے اور مسلمان طاقتور اور کمزور دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور اس طرح ایک گروہ کی جان و مال اور عزت دوسرے گروہ کے ہوا و ہوس کا کھلونا بن گئی۔

۲۔ اسلامی حکومتیں اسلامی قوانین میں تدریجی طور پر تبدیلیاں پیدا کرنے لگیں اور کبھی اسلامی معاشرہ کی رعایت کے نام پر اور کبھی حکومت اور حکومت کی سیاسی حیثیت کے تحفظ کے عنوان سے دینی احکام پر عمل کرنے اور اسلامی قوانین کے نفاذ سے پہلو تہی کی گئی۔ یہ طریقہ دن بدن وسیع تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اسلامی حکومت کے نام پر چلنے والے ادارے اسلامی قوانین کی رعایت اور انہیں نافذ کرنے میں کسی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے تھے۔ معلوم ہے جب عام قوانین و ضوابط کو نافذ کرنے والے افراد ہی مخلص نہ ہوں گے تو ان قوانین کا کیا حشر ہوگا!

خلاصہ اور نتیجہ

مذکورہ گفتگو سے معلوم ہوا کہ اہل بیت علیہم السلام کی معاصر اسلامی حکومتیں وقت کی مصلحتوں کے پیش نظر اسلامی قوانین میں تصرف کرتی تھیں اور ان ہی تصرفات کی وجہ سے ان کی سیرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے بالکل مختلف ہوتی تھی۔ لیکن اہل بیت علیہم السلام قرآن مجید کے حکم کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے احکام کو ہمیشہ کے لئے ضروری جانتے تھے۔ انہی اختلافات اور تضاد کے سبب وقت کی طاقتور حکومتوں نے اہل بیت علیہم السلام کا خاتمہ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ان کے نور کو بجھانے کے لئے ہر ممکن وسیلہ سے استفادہ کرتے تھے۔ اہل بیت اطہار علیہم السلام بھی اپنی الہی ذمہ داری کے مطابق، اپنے سخت اور منحوس دشمنوں کی طرف سے فراوان مشکلات سے دوچار ہونے کے باوجود، دین کے حقائق کی تبلیغ کر رہے تھے اور صالح افراد کو تعلیم دینے اور ان کی تربیت کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔

اس مطلب کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ہم تاریخ کی طرف رجوع کریں اور حضرت علی علیہ السلام کی پانچ سالہ حکومت میں شیعوں کی اکثریت کو ملاحظہ کریں، کیونکہ تھوڑا غور کرنے سے ہم سمجھ لیں گے کہ یہ اکثریت حضرت کی اسی ۵۲ سالہ گوشہ نشینی کے دوران وجود میں آئی۔ اسی طرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے گھر پر گروہ درگروہ آنے والے شیعہ تھے جو خاموشی کے ساتھ حضرت امام سجاد علیہ السلام کے تربیت یافتہ تھے یہ حقائق کے ایسے خوشہ چین تھے کہ حضرت امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام حتیٰ زندان کے ایک تاریک گوشہ میں بھی ان کی اشاعت فرماتے تھے۔

آخر کار اہل بیت علیہم السلام کی مسلسل تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں، شیعہ جو پیغمبر اکرم کی رحلت کے وقت ایک معمولی تعداد میں تھے، ائمہ اطہار علیہم السلام کے آخری زمانے میں ایک بڑی تعداد میں تبدیل ہوئے۔ اہل بیت علیہم السلام کے کردار میں ایک استثنائی نکتہ جیسا کہ بیان کیا گیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام نے اپنی زندگی کا زمانہ مظلومیت اور محکومیت میں گزارا اور اپنی ذمہ داریوں کو تقیہ کے ماحول اور انتہائی سخت حالات میں انجام دیا۔ ان میں سے چار معصومین کی زندگی بہت کم مدت

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لارہے ہیں کہ آپ کی آغوش میں حسین علیہ السلام میں اور حسن علیہ السلام ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں، آپ کے پیچھے آپ کی بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا اور ان کے پیچھے علی علیہ السلام میں اور آپ ان سے فرما رہے ہیں کہ جب میں دعا کروں تو تم لوگ آمین کہنا۔ اس نورانی وفد، جن کے وجود سے حق و حقیقت نمایاں تھی، جو خدا کی پناہ گاہ کے سوا کسی پناہ گاہ پر بھروسہ کئے ہوئے نہیں تھے، نے نجران کے وفد کو لرزہ بر اندام کر دیا، ان کے سردار نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

”خدا کی قسم! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ بارگاہ الہی میں دعا کریں گے تو روئے زمین پر تمام نصاریٰ نابود ہو جائیں گے“ اس کے بعد وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مباہلہ سے دست بردار ہونے کی عذر خواہی کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لہذا اسلام لاؤ۔

انہوں نے کہا: اسلام لانے سے بھی معذور ہیں۔

آئیے فرمایا: تو پھر ہم تم لوگوں سے جنگ کریں گے۔

انہوں نے کہا: مسلمانوں سے لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے، لیکن سالانہ جزیہ دیں گے اور اسلام کی پناہ میں زندگی کریں گے اس طرح اختلاف ختم ہوا۔ مباہلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ زہراؑ اور حسنینؑ کے آنے سے واضح ہوا کہ آیہ شریفہ (ابنائنا و نساائنا و انفسنا) پیغمبرؐ، علیؑ، فاطمہؑ، اور حسنؑ و حسینؑ علیہم السلام کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ جو پیغمبر نے ”اپنے نفس“ فرمایا اس سے مقصود خود آپ اور علیؑ تھے، اور یہ جو فرمایا ”اپنی عورتیں“ اس سے مقصود فاطمہؑ تھیں اور یہ جو فرمایا ”اپنے فرزند“ اس سے مقصود ”حسینؑ“ تھے۔ یہاں پر اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ علی علیہ السلام بمنزلہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام چار افراد تھے کیونکہ شخص کے ہر اہل بیت وہ لوگ ہیں کہ جن کا تعارف وہ خود کلمہ ”انفس، نساائنا و ابنائنا“ (ہمارے نفس، ہماری

عورتیں، اور ہمارے بچوں) سے کرائے میں۔ اگر اہل بیت میں ان کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو بھی مباہلہ کے لئے ہمراہ ضرور لے آتے۔ اس سے ان چار ہستیوں کی عصمت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ خدائے متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام کی عصمت و طہارت کی گواہی دے رہا ہے: (....انما یرید اللہ لیزہب عنکم الرجز اہل الیت ویطہرکم تطہیرا) ”بس اللہ کا ارادہ ہے اے اہل بیت! تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور تم کو اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔“

۲۔ جیسا کہ عامہ و خاصہ (سنی و شیعہ) نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ”مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِي كَمَثَلِ سَيْفَةِ نُوحٍ مَنْ رَكَبَهَا نَجَّى وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ“ ”میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کے مانند ہے، جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے اس سے روگردانی کی وہ غرق ہو گیا۔“

۳۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک اور متواتر روایت میں جسے عامہ و خاصہ نے نقل کیا ہے فرمایا ہے: ”انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اہل بیتی لن یفترقا حتی یرد علیّ الحوض ما ان تمکلتما بہما لن تضرلوا بعدی“ ”میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، جو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی یہ دو چیزیں خدا کی کتاب اور میرے اہل بیت میں جب تک ان دونوں سے متمسک رہو گے، گمراہ نہیں ہو گے۔“

ائمہ علیہم السلام کی تقرری

حضرت علی علیہ السلام کی امامت (جیسا کہ معلوم ہوا) خدا کی طرف سے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص سے تھی، اور اسی طرح دوسرے ائمہ علیہم السلام جو حضرت علی کے بعد تھے، ہر امام نے اپنے بعد والے امام کا خدا کے حکم سے لوگوں میں تعارف کیا ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام پہلے امام اور مسلمانوں کے پہلے پیشوا تھے، آئے اپنی شہادت کے وقت اپنے بیٹے

امام حسن علیہ السلام کا تعارف کرایا اور امام حسن علیہ السلام نے بھی اپنی شہادت کے موقع پر اپنے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام کا تعارف کرایا اور اسی طرح بارہویں امام تک سلسلہ رہا۔ ہر امام سے اپنے بعد والے امام کے بارے میں نص کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی (عامہ و خاصہ سے نقل کی گئی بہت سی حدیثوں کے مطابق) اماموں کے بارہ ہونے کے بارے میں یہاں تک کہ بعض حدیثوں میں ان کے ناموں کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔



ترجمہ تحریک
Translation Movement

ائمہ معصومین علیہ السلام کی زندگی کا ایک مختصر جائزہ

حضرت امام علی علیہ السلام (مسلمانوں کے پہلے امام)

حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے پہلے کامل نمونہ تھے۔ علی علیہ السلام نے بچپن سے ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن میں پرورش پائی تھی، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری لمحہ تک ایک سایہ کے مانند ساتھ ساتھ رہے اور آپ کی شمع وجود کے گرد پروانہ کی طرح پرواز کرتے رہے۔ جب آخری بار آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہوئے یہ وہ لمحہ تھا جب آپ نے آنحضرت کے جدِ مطہر کو آغوش میں لے کر سپردِ خاک کیا۔ حضرت علی علیہ السلام ایک عالمی شخصیت ہیں۔ دعویٰ کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جتنی گفتگو اس عظیم شخصیت کے بارے میں ہوئی ہے، اتنی کسی بڑے سے بڑے عالمی شخصیت کے بارے میں نہیں ہوئی ہے۔

شیعہ و سنی اور مسلم و غیر مسلم دانشوروں اور مصنفوں نے حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں ایک ہزار سے زائد کتابوں میں تالیف کی ہیں۔ آپ کے بارے میں دوست و دشمن بے شمار تحقیق اور کھوج کے باوجود آپ کے ایمان میں کسی قسم کا کمزور نقطہ پیدا نہیں کر سکے یا آپ کی شجاعت، عفت، معرفت، عدالت اور دوسرے تمام پسندیدہ اخلاق کے بارے میں شائبہ برابر نقص نہیں نکال سکے، کیونکہ آپ ایک ایسے شخص تھے جو فضیلت و کمال کے علاوہ کسی چیز کو نہیں پہچانتے تھے اور اسی طرح آپ میں فضیلت و کمال کے علاوہ کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے آج تک جتنے حکام نے اسلامی معاشرہ میں حکومت کی ان میں صرف حضرت علی علیہ السلام ایسے ہیں کہ جنہوں نے اسلامی معاشرہ پر اپنی حکومت کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر پوری طرح عمل کیا اور آنحضرت کی روش سے ذرہ برابر منحرف نہیں ہوئے اور اسلامی قوانین اور شریعت کو کسی قسم کے دخل و تصرف کے بغیر اسی طرح نافذ کیا، جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی حیات میں نافذ ہوئے تھے۔ دوسرے خلیفہ کی وفات کے بعد نئے خلیفہ کو معین کرنے کے لئے خلیفہ دوم کی وصیت کے مطابق جو چھ رکنی کمیٹی بنائی گئی تھی، اس میں کافی گفتگو کے بعد خلافت کا مسئلہ علیؑ اور عثمان کے درمیان تذبذب میں پڑا علیؑ کو خلافت کی پیشکش کی گئی، لیکن اس شرط پر کہ ”لوگوں میں خلیفہ اول اور دوم کی سیرت پر عمل کریں“، حضرت علیؑ نے ان شرائط کو ٹھکراتے ہوئے فرمایا: ”میں اپنے علم سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھوں گا۔“ اس کے بعد وہی شرائط عثمان کے سامنے رکھی گئیں، انہوں نے قبول کیا اور خلافت حاصل کی، اگرچہ خلافت ہاتھ میں آنے کے بعد دوسری سیرت پر عمل کیا۔

علی علیہ السلام نے راہ حق میں جن جاں نثاریوں، فداکاریوں اور غنیمت و بخشش کا مظاہرہ کیا ہے ان میں آپؐ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں بے نظیر تھے۔ اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر اسلام کا یہ جاں نثار اور سورمانہ ہوتا، تو کفار و مشرکین ہجرت کی رات کو، اس کے بعد بدرواح، خندق و خیبر و حنین کی جنگوں میں نبوت کی شمع کو آسانی کے ساتھ بجھا کر حق کے پرچم کو سرنگوں کر دیتے۔ علی علیہ السلام نے جس دن سماجی زندگی میں قدم رکھا، اسی لمحہ سے اتھائی سادہ زندگی گزارتے تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں، آپؐ کی رحلت کے بعد، یہاں تک کہ اپنی با عظمت خلافت کے دنوں میں فقیروں اور پسماندہ ترین افراد جیسی زندگی بسر کرتے تھے، خوراک، لباس اور مکان کے لحاظ سے معاشرہ کے غریب ترین افراد میں اور آپؐ میں کوئی فرق نہیں تھا اور آپؐ فرماتے تھے۔ ”

ایک معاشرے کے حاکم کو اس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے کہ ضرورت مندوں اور پریشان حال افراد کے لئے تسلی کا سبب بنے نہ ان کے لئے حسرت اور حوصلہ شکنی کا باعث ہوا۔“ علی علیہ السلام اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محنت و مزدوری کرتے تھے، خاص کر کھیتی باڑی سے دلچسپی رکھتے تھے، درخت لگاتے تھے اور نہر کھودتے تھے، لیکن جو کچھ اس سے کماتے تھے یا جنگوں میں جواں غنیمت حاصل کرتے تھے، اسے فقرا اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ جن زمینوں کو آباد کرتے

تھے انھیں یا وقف کرتے تھے یا ان کو بیچ کر پیسے حاجتمندوں کو دیتے تھے۔ اپنی خلافت کے دوران ایک سال حکم دیا کہ آپ کے اوقاف کی آمدنی کو پہلے آپ کے پاس لایا جائے پھر خرچ کیا جائے۔ جب مذکورہ آمدنی جمع کی گئی تو یہ سونے کے ۲۴ ہزار دینار تھے۔ علی علیہ السلام نے اتنی جنگوں میں شرکت کی لیکن کبھی کسی ایسے دشمن سے مقابلہ نہ کیا جسے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا ہو۔ آپ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہ دکھائی اور فرماتے تھے: ”اگر تمام عرب میرے مقابلہ میں آجائیں اور مجھ سے لڑیں تو بھی میں شکست نہیں کھاؤں گا اور مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔“

علی علیہ السلام ایسی شجاعت و بہادری کے مالک تھے کہ دنیا کے بہادروں کی تاریخ آپ کی مثال پیش نہ کر سکی، اس کے باوجود آپ انتہائی مہربان، ہمدرد، جوانمرد اور فیاض تھے۔ جنگوں میں عورتوں، بچوں اور کمزوروں کو قتل نہیں کرتے تھے اور ان کو اسیر نہیں بناتے تھے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔ جنگ صفین میں معاویہ کے لشکر نے سبقت حاصل کر کے نہر فرات پر قبضہ کر لیا اور آپ کے لشکر پر پانی بند کر دیا، حضرت علی علیہ السلام نے ایک خونین جنگ کے بعد نہر سے دشمن کا قبضہ ہٹا دیا، اس کے بعد حکم دیا کہ دشمن کے لئے پانی کا راستہ کھلا رکھیں۔

خلافت کے دوران کسی رکاوٹ اور دربان کے بغیر ہر ایک سے ملاقات کرتے تھے اور تنہا اور پیدل راستہ چلتے تھے۔ گلی کو چوں میں گشت زنی کرتے تھے اور لوگوں کو تقویٰ کی رعایت کرنے کی نصیحت فرماتے تھے اور لوگوں کو ایک دوسروں پر ظلم کرنے سے منع کرتے تھے، بے چاروں اور یتیموں کی مرہبانی اور فروتنی سے مدد فرماتے تھے۔ یتیموں اور لاوارثوں کو اپنے گھر میں پالتے تھے، ان کی زندگی کی ضرورتوں کو ذاتی طور پر پورا کرتے تھے اور ان کی تربیت بھی کرتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام علم کو بے حد اہمیت دیتے تھے اور معارف کی اشاعت کے میں خاص توجہ دیتے تھے، اور فرماتے تھے: ”بنادانی کے مانند کوئی درد نہیں ہے“، جل کی خونین جنگ میں آپ اپنے لشکر کی صف آرائی میں مشغول تھے، ایک عرب نے

سامنے آکر ”توحید“ کے معنی پوچھے۔ لوگ ہر طرف سے عرب پر ٹوٹ پڑے اور اس سے کہا گیا ایسے سوالات کا یہی وقت ہے؟ حضرت نے لوگوں کو اعرابی سے ہٹا کر فرمایا ”ہم لوگوں سے ان ہی حقائق کو زندہ کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں“ اس کے بعد اعرابی کو اپنے پاس بلایا، اپنے لشکر کی صف آرائی کرتے ہوئے اعرابی کو ایک دلکش بیان سے مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔ اس قسم کے واقعات حضرت علی علیہ السلام کے ”دینی نظم و ضبط اور ایک حیرت انگیز خدائی طاقت کی حکایت کرتے ہیں۔ جنگ صفین کے بارے میں مزید نقل کیا گیا ہے کہ جب دو لشکر دو تلامطم دریاؤں کے مانند آپس میں لڑ رہے تھے اور ہر طرف خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ تو حضرت اپنے ایک سپاہی کے پاس پہنچے، اس سے پینے کے لئے پانی مانگا۔

سپاہی نے لکڑی کا ایک پیالہ نکالا اور اس میں پانی بھر کے پیش کیا، حضرت نے اس پیالہ میں ایک ٹگاف مشاہدہ کیا اور فرمایا: ”ایسے برتن میں پانی پینا اسلام میں مکروہ ہے۔“ سپاہی نے عرض کی: اس حالت میں کہ جب ہم ہزاروں تیروں اور تلواروں کے حملہ کی زد میں ہیں اس قسم کی دقت کرنے کا موقعہ نہیں ہے! اس سپاہی کو آپ نے جو جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے: ”ہم ان ہی دینی احکام و قوانین کو نافذ کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں اور احکام چھوٹے بڑے نہیں ہوتے ہیں“ اس کے بعد حضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر سامنے کیا اور سپاہی نے پیالہ میں بھرا پانی آپ کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔

حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام کے بعد ایسے پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے علمی حقائق کو فلسفی طرز تفکر یعنی آزاد استدلال میں بیان فرمایا اور بہت علمی اصطلاحیں وضع کیں اور قرآن مجید کی غلط قرأت اور تحریف سے حفاظت کے لئے عربی زبان کے قواعد ”علم نحو“ وضع کئے اور ان کو مرتب کیا۔ آپ کی تقریروں، خطوط اور دیگر فصیح بیانات میں، معارف الہی، علمی، اخلاقی، سیاسی یہاں تک کہ ریاضی کے مسائل میں جو باریک بنیے پائی جاتی ہے، یقیناً وہ حیرت انگیز ہیں۔

امام علی علیہ السلام کے فضائل کا خلاصہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو چھ سال کی عمر میں حضرت ابوطالب کے یہاں سے اپنے گھر لے آئے اور ان کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ حضرت علی علیہ السلام اسی دن سے ایک سایہ کے مانند پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے اور آنحضرتؐ سے آخری بار اس وقت جدا ہوئے جب آپؐ نے آنحضرتؐ کے جد مطہر کو سپرد خاک کیا۔ حضرت علی علیہ السلام پہلے کامل نمونہ میں جو پیغمبر اسلامؐ کی تعلیم و تربیت کے مکتب میں پروان پڑھے۔ آپؐ پہلے شخص میں جو آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور آپؐ ہی سب سے آخر میں حضرتؐ سے جدا ہوئے۔ بعثت کے پورے زمانہ میں جو خدمات حضرت علی علیہ السلام نے خدا کے دین کے لئے انجام دیئے، دوست و دشمن گواہ ہیں کہ وہ خدمات کوئی اور انجام نہیں دے سکا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اسلام کی سب سے اہم جنگوں میں شرکت فرمائی اور جنگ کے تمام خونین میدانوں میں مسلمانوں کے اندر بے مثال بہادری اور کامیابی کا راز آپؐ ہی تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے صحابی جنگوں میں بارہا بھاگ جاتے تھے، لیکن آپؐ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی اور کوئی حریف آپؐ کی تلوار کی وار سے بچ نہ سکا۔

اس بے نظیر شجاعت، جو ضرب المثل بن چکی تھی، کے باوجود آپؐ ہمدرد اور مہربان تھے، کبھی اپنے زخمی دشمن کو قتل نہیں کرتے تھے اور جنگ سے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام، اپنی تقریروں، کلمات قصار اور اپنے گویاں بیان، جو یادگار کے طور پر مسلمانوں کے پاس موجود ہیں، کے اعتبار سے مسلمانوں میں قرآن مجید کے بلند مقاصد کے بارے میں معروف ترین شخص ہیں۔ آپؐ نے اسلام کے اعتقادی و علمی معارف کو کما حقہ حاصل کر کے حدیث شریفؐ: ”انا مدینۃ العلم و علی بابہا“ کو ثابت کر دیا اور اس علم کو علمی جامہ پہنایا۔ حضرت علی علیہ السلام کا دینداری، عفت نفس اور زحد و تقویٰ میں کوئی نظیر نہیں

تھا۔ آپ اپنے معاش کے لئے روزانہ محنت و مشقت کرتے تھے، بالخصوص زراعت کو بہت پسند کرتے تھے۔ بنجر زمینوں کو آباد کرتے تھے، نہریں کھودتے تھے، درخت لگاتے تھے، جس جگہ کو آباد کرتے اسے مسلمانوں کے لئے وقف کر دیتے تھے یا اس کو بیچ کر پیسے فقراء میں تقسیم کر دیتے تھے اور خود نہایت زحمت و قناعت کے ساتھ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ جس دن شہید ہوئے۔

باوجود اس کے کہ تمام اسلامی ممالک کے فرمانروا تھے۔ آپ کی پونجی صرف سات سو درہم تھی جنہیں آپ اپنے گھر کے لئے ایک خدمت گار پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی عدالت ایسی تھی کہ خدا کے احکام کے نفاذ اور لوگوں کے حقوق کو زندہ کرنے میں ہرگز کسی طرح کے استثناء کے قائل نہیں تھے۔ آپ ذاتی طور پر گلی کوچوں میں گشت لگاتے تھے اور لوگوں کو اسلامی قوانین کی رعایت کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت امیر المؤمنین کا طریقہ

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے مسائل میں ولی ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص کے مطابق خدائے متعال کی طرف سے حضرت علی علیہ السلام کے لئے مخصوص تھا، لیکن اسے انتخابی خلافت میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح خلافت کی کرسی پر دوسرے لوگوں نے قبضہ جمایا۔ حضرت علی علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند خاص صحابیوں جیسے سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور مقداد اسدی نے لوگوں سے ایک اعتراض کیا لیکن انہیں مثبت جواب نہیں ملا۔

حضرت علی علیہ السلام لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک مدت تک اپنے گھر میں قرآن مجید جمع کرنے میں مصروف رہے اس کے بعد کچھ خاص صحابیوں اور چند دیگر افراد کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہوئے۔ حضرت علی علیہ السلام کا ماضی درخشاں اور بے مثال تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں آپ آنحضرت کے وزیر اور اسلامی فتوحات کی کلید تھے، علم و دانش میں،

فیصلہ دینے میں، سخن وری اور دیگر تمام معنوی فضائل میں آپ تمام مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے۔ اس کے باوجود خلیفہ اول کے زمانے میں اجتماعی مسائل اور عمومی کام میں آپ سے کسی قسم کا استفادہ نہیں کیا گیا، اس لئے آپ صرف خدا کی عبادت اور چند اصحاب کی علمی و عملی تربیت میں مشغول رہتے تھے اور ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

خلیفہ دوم کے زمانے میں بھی کسی کام کو آپ کے حوالہ نہیں کیا جاتا تھا، لیکن کسی حد تک آپ سے رجوع کرتے تھے اور اہم مسائل میں آپ کے نظریات سے استفادہ کیا جاتا اور آپ سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ خلیفہ دوم نے بارہا کہا ہے: (اگر علی کی رہنمائی نہ ہوتی تو عمر مملکت ہو جاتا)۔ خلیفہ سوم کے زمانہ میں لوگوں کی توجہ آپ کی طرف زیادہ ہوئی اور اس پوری ۵۵ سالہ مدت میں آپ کی تعلیم و تربیت کا دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا گیا یہاں تک کہ مکتب ولایت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ تربیت پانے والوں کی ایک بڑی جماعت نے خلیفہ سوم کے قتل کے فوراً بعد آپ کے پاس ہجوم کیا اور آپ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا۔

حضرت امیر المومنین نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی پیغمبر اسلام کی سیرت کو۔ جیسے مدتوں سے فراموش کیا گیا تھا۔ پھر سے زندہ کیا۔ آپ نے مساوات اور اجتماعی عدالت نافذ کر کے تمام بجا امتیازات کو ختم کر دیا۔ تمام لالہ بالی گورنروں اور فرمانرواؤں کو معزول کر دیا اور انکے بیت المال سے لوٹے گئے مال و دولت اور خلیفہ کی طرف سے مختلف لوگوں کو بے حساب دی گئی جاگیروں و املاک کو ضبط کیا، اور دینی ضوابط اور قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مناسب سزائیں سنائیں۔

اثر و رسوخ رکھنے والے لیڈروں اور ناجائز منافع حاصل کرنے والوں نے جب دیکھا کہ ان کے ذاتی منافع خطرے میں پڑ رہے ہیں، تو انہوں نے مخالفت کا پرچم بلند کر کے عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے داخلی خونین جنگوں کی آگ بھڑکادی جو حضرت کی مشکلات کا سبب اور اصلاحات رکھنے میں رکاوٹ بن گئیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے پانچ سالہ دور میں کمر توڑ مشکلات کے باوجود بے شمار افراد کی تربیت کی اور اپنی تقریروں اور فصیح بیانات کے ذریعہ علمی میدان کے مختلف

ہمزوفون کے گراں بہا خزانے یادگار کے طور پر چھوڑ دئے، ان میں سے ایک علم نحو کے اصولوں کا وضع کرنا ہے جو حقیقت میں عربی زبان کے قواعد و ضوابط میں۔ آپ کی برجستہ شخصیت کے اوصاف ناقابل بیان میں، آپ کے فضائل بے انتہا اور بے شمار ہیں۔ تاریخ ہرگز کسی ایسے شخص کو پیش نہیں کر سکتی جس نے آپ کے برابر دنیا کے دانشوروں، مصنفوں اور مفکروں کے انکار کو اپنی طرف جذب کیا ہو۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام (دوسرے امام)

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے والد گرامی کی شہادت کے بعد خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔ آپ معاویہ کے بلوے کو دبانے کے لئے ایک لشکر کو مسلح اور منظم کرنے میں لگ گئے۔ آپ نے لوگوں میں اپنے نانا اور والد گرامی کی سیرت کو جاری رکھا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد معلوم ہوا کہ معاویہ کی مخفیانہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے آپ کی کوششیں ناکام ہو رہی ہیں، آپ کے لشکر کے سردار معاویہ سے ساز باز کر چکے ہیں، اور یہاں تک آمادہ تھے کہ آپ کو گرفتار کر کے معاویہ کے حوالہ کر دیں یا قتل کر دیں۔ بدیہی ہے کہ ایسے حالات میں معاویہ سے جنگ کرنے میں امام حسن مجتبیٰ کے لئے شکست و ناکامی یقینی تھی، یہاں تک کہ اگر امام تھا یا اپنے نزدیک ترین افراد کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے قتل ہوتے، تو معاویہ کی سلطنت میں کسی قسم کی ہلچل نہ مچتی اور لوگوں کے دلوں پر بھی کوئی اثر نہ ہوتا، کیونکہ معاویہ اپنی مخصوص شاطرانہ چال سے آسانی کے ساتھ آپ کو مختلف ذرائع حتیٰ اپنے ہی افراد کے ذریعہ قتل کر سکتا تھا، اس کے بعد لباس عزا پہن کر آپ کی انتقام کا دعویٰ کر کے فرزند پیغمبر کے خون سے اپنے دامن کو دھو سکتا تھا۔ ان ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کی طرف سے صلح کی تجویز کو کچھ شرائط کے ساتھ قبول کیا اور خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ لیکن معاویہ نے تمام شرائط کو پامال کر کے ان میں سے کسی ایک پر عمل نہیں کیا۔ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اس طرح اپنی، اپنے بھائی حضرت امام حسین اور اپنے چند اصحاب کی جان کو یقینی خطرہ سے بچالیا اور اپنے خاص اصحاب کا ایک مختصر و محدود لیکن حقیقت پر مبنی معاشرہ تشکیل دیا اور اصلی اسلام کو بالکل نابود ہونے سے بچالیا۔ البتہ معاویہ

ایسا شخص نہیں تھا جو امام حسن مجتبیٰ کے مقصد اور آپ کے منصوبہ سے بے خبر رہتا، اس لئے صلح برقرار ہونے اور پورے طور پر تسلط جانے کے بعد معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں اور حامیوں کو جہاں کہیں پایا ان کو مختلف ذرائع سے نابود کر دیا، اگرچہ صلح کے شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ خاندان رسالت کے حامی اور دوست امان میں رہیں گے۔ بہر حال معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے مقدمات کو مستحکم کرنے کے لئے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو آپ کی بیوی کے ہاتھوں زہر دلا کر شہید کرایا، کیونکہ صلح نامہ کے دوسرے شرائط میں یہ بھی تھا کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر سے حضرت امام حسن مجتبیٰ کو ملے گی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام (تیسرے امام)

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے برادر بزرگوار کے بعد حکم خدا اور اپنے بھائی کی وصیت سے امامت کے عہدہ پر فائز ہوئے اور معاویہ کی خلافت کے دوران تقریباً دس سال زندگی گزاری اور اس مدت میں اپنے بھائی حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی سیرت پر عمل کرتے رہے اور جب تک معاویہ زندہ تھا امام کوئی موثر کام انجام نہ دے سکے۔ تقریباً ساڑھے نو سال کے بعد معاویہ مر گیا، اور خلافت جو سلطنت میں تبدیل ہو چکی تھی اس کے بیٹے یزید کو ملی۔

یزید، اپنے ریاکار باپ کے برعکس، ایک مست، مغرور، عیاش، فحاشی میں ڈوبا ہوا اور لالہ بالی جوان تھا۔ یزید نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی مدینہ کے گورنر کو حکم دیا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے اس کے لئے بیعت لے ورنہ ان کا سر قلم کر کے اس کے پاس بھیج دے۔ اس کے بعد مدینہ کے گورنر نے حکم کے مطابق امام حسین علیہ السلام سے یزید کی بیعت کا تقاضا کیا، آپ نے مہلت چاہی اور رات کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ راہی مکہ ہوئے۔ اور حرم خدا میں، جو اسلام میں ایک سرکاری پناہ گاہ ہے پناہ لی، لیکن وہاں پر کچھ مہینے گزارنے کے بعد، سمجھ گئے کہ یزید کسی قیمت پر آپ سے دست بردار ہونے والا نہیں ہے، اور بیعت نہ کرنے کی صورت میں آپ کا قتل ہونا قطعی ہے۔ اور دوسری جانب سے اس مدت کے دوران عراق سے کئی ہزار خطوط حضرت کی خدمت میں پہنچے تھے کی جن میں آپ کی مدد کا وعدہ دے کر ظالم بنی امیہ کے خلاف تحریک چلانے کی دعوت دی تھی۔ امام حسین علیہ

السلام عمومی حالات کے مشاہدہ سے اور شواہد و قرائن سے سمجھ چکے تھے کہ آپ کی تحریک ظاہری طور پر آگے نہیں بڑھ سکتی ہے، اس کے باوجود یزید کی بیعت سے انکار کر کے قتل ہونے پر آمادہ ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تحریک کا آغاز کر کے مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں سرزمین کربلا (کوفہ سے تقریباً ستر کلومیٹر پہلے) دشمن کے ایک بڑے لشکر سے آپ کی ٹڈ بھڑ ہوئی۔

امام حسین علیہ السلام راستہ میں لوگوں کو اپنی مدد کے لئے دعوت دے رہے تھے اور اپنے ساتھیوں سے تذکرہ کرتے تھے کہ اس سفر میں قطعی طور پر قتل ہونا ہے اور اپنا ساتھ چھوڑنے پر اختیار دیتے تھے، اسی لئے جس دن آپ کا دشمن سے مقابلہ ہوا تو آپ کے گنے پنے جان نثار ساتھی باقی بچے تھے جنہوں نے آپ پر قربان ہونے کا فیصلہ کیا تھا، لہذا وہ بڑی آسانی کے ساتھ دشمن کی ایک عظیم فوج کے ذریعہ انتہائی تنگ محاصرہ میں قرار پائے اور یہاں تک کہ ان پر پانی بھی بند کیا گیا، اور ایسی حالت میں امام حسین علیہ السلام کو بیعت کرنے یا قتل ہونے کے درمیان اختیار دیا گیا۔

امام حسین علیہ السلام نے بیعت کرنے سے انکار کیا اور شہادت کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ایک دن میں صبح سے عصر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ دشمن سے لڑتے رہے۔ اس جنگ میں خود امام آپ کے بیٹے، بھائی، بھتیجے، چچے بھائی اور آپ کے اصحاب کہ جن کی کل تعداد تقریباً ستر افراد کی تھی، شہید ہوئے۔ صرف آپ کے بیٹے امام حجاج علیہ السلام بچے جو شدید بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ دشمن کے لشکر نے، حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد مال کو لوٹ لیا اور آپ کے خاندان کو اسیر بنا لیا اور شہداء کے کٹے ہوئے سروں کے ہمراہ اسروں کو کوفہ اور کوفہ سے شام لے جایا گیا۔ اس اسیری میں امام حجاج علیہ السلام نے شام میں اپنے خطبہ سے اسی طرح حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے کوفہ کے مجمع عام میں اور کوفہ کے گورنر ابن زیاد کے دربار میں اور شام میں یزید کے دربار میں اپنے خطبوں سے حق سے پردہ اٹھایا اور بنی امیہ کے ظلم و ستم کو دنیا والوں کے سامنے اٹھکار اور واضح کر دیا۔ بہر حال امام حسین علیہ السلام کی تحریک، ظلم، و زیادتی اور لالہ بالی کے مقابلہ میں خود آپ

اور آپ کے فرزندوں، عزیزوں اور اصحاب کے پاک خون کے بہنے اور مال کی غارت اور خاندان کی اسیری پر ختم ہوئی۔ یہ تحریک اپنی خصوصیات و امتیازات کے پیش نظر اپنی نوعیت کا ایک ایسا واقعہ ہے انقلاب کی تاریخ کے صفحات پر رقم ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اس واقعہ سے زندہ ہے اور اگر یہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو بنی امیہ اسلام کا نام و نشان باقی نہ رکھتے۔ اس جانکاہ واقعہ نے نمایاں طور پر پیغمبرؐ کے اہل بیت علیہم السلام کے مقاصد کو بنی امیہ اور ان کے طرفداروں کے مقاصد سے جدا کر کے حق و باطل کو واضح و روشن کر دیا۔ یہ واقعہ نہایت کم وقت میں اسلامی معاشرہ کے کونے کونے میں منتشر ہوا اور شدید انقلابوں اور بہت زیادہ خونریزوں کا سبب بنا جو بارہ سال تک جاری رہے و آخر کار بنی امیہ کے زوال کا ایک بنیادی سبب بنا۔

اس واقعہ کا واضح ترین اثر لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی معنوی پرورش کے نتیجے میں رونما ہوا جن کے دلوں میں علی بن ابیطالب کی ولایت نے جڑ پکڑ لی اور ان لوگوں نے خاندان رسالت کی دوستی کو اپنا لائحہ عمل بنالیا اور دن بدن ان کی تعداد اور طاقت بڑھتی گئی۔ اور آج کی دنیا میں تقریباً دس کروڑ مسلمان شیعہ کے نام سے موجود ہیں۔

کیا امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی روش مختلف تھی؟ اگرچہ ان دو محترم پیشواؤں کی روش۔ جو نص پیغمبرؐ کے مطابق برحق امام ہیں۔ ظاہراً مختلف نظر آتی ہیں، بعض لوگوں نے اس حد تک کہا ہے کہ: ان دو بھائیوں کے درمیان اس حد تک نظریاتی اختلاف پایا جاتا تھا کہ ایک نے چالیس ہزار سپاہی ہونے کے باوجود صلح کی اور دوسرے نے رشتہ داروں کے علاوہ چالیس دوست و احباب کے ساتھ جنگ کی حتیٰ کہ شش ماہہ طفل شیرخوار کو بھی اس راہ میں قربان کیا۔

لیکن عمیق اور دقیق تحقیقات سے اس نظریہ کے خلاف ثابت ہوتا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام تقریباً ساڑھے نو سال معاویہ کی سلطنت میں رہے اور کھلم کھلا مخالفت نہیں کی۔ امام حسین علیہ السلام نے بھی اپنے بھائی کی شہادت کے بعد تقریباً ساڑھے نو سال معاویہ کی سلطنت میں زندگی گزاری اور تحریک کا نام تک نہیں لیا اور مخالفت نہیں کی۔ پس دونوں کی روش میں اس ظاہری

اختلاف کی اصلی بنیاد کو معاویہ اور یزید کی متضاد روشوں میں ڈھونڈنا چاہئے نہ کہ ان دو محترم پیشواؤں کے نظریاتی اختلاف میں۔ معاویہ کی روش بظاہر ایک ایسی روش نہیں تھی جو بے دینی پر استوار ہو اور اپنی اعلانیہ مخالفت سے احکام دین کا مذاق اڑائے۔ معاویہ اپنے آپ کو ایک صحابی اور کاتب وحی کے طور پر پہنچواتا تھا اور اپنی بہن کے ذریعہ (جو زوجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ام المومنین تھیں) اپنے آپ کو ”خال المومنین“ کہلاتا تھا اور خلیفہ دوم کا مورد اعتماد تھا اور عام لوگ خلیفہ پرہورا اعتماد اور خاص احترام رکھتے تھے۔

اسکے علاوہ اس نے لوگوں کی نظر میں پیغمبر کے قابل احترام اکثر اصحاب (جیسے ابو ہریرہ، عمر وعاص، سمرہ، بسر اور مغیرہ بن شعبہ وغیرہ) کو گورنری اور دیگر حساس حکومتی عہدوں پر فائز کیا تھا جو لوگوں کے حسن ظن کو اس کی طرف مبذول کرتے تھے اور لوگوں میں اس کے فضائل اور دین کے سلسلہ میں صحابہ کے محفوظ ہونے کے بارے میں۔ یعنی جو کام بھی انجام دیں معذور ہیں۔ بہت سی روایتیں نقل کرتے تھے، لہذا معاویہ جو بھی کام انجام دیتا تھا وہ قابل توجہ ہوتا تھا اور جب اس سے کام نہیں بنتا تھا تو معاویہ بھاری انعام و اکرام اور لالچ دے کر اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کرتا تھا۔

جہاں پر یہ حربہ کارگر ثابت نہیں ہوتا تھا، تو اپنے انہی حامیوں اور طرفداروں کے ذریعہ مخالفت کرنے والوں کو نابود کراتا تھا۔ چنانچہ اس کے ان ہی حامی صحابیوں کے ہاتھوں ہزار بے گناہ شیعان علیؑ اور دیگر مسلمانوں حتیٰ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں کی ایک جماعت کو بھی قتل کیا گیا۔ معاویہ تمام کاموں میں ایک حق بجانب روپ اختیار کرتا تھا اور ایک خاص صبر و تحمل سے قدم بڑھاتا تھا اور ایک خاص مہربانی سے لوگوں کو اپنا محب اور مطیع بنا لیتا تھا یہاں تک کہ کبھی اپنے خلاف گالیاں سنتا تھا اور جھگڑوں سے رو برو ہوتا تھا، لیکن خداں پیشانی اور عضو بخشش کے ساتھ جواب دیتا تھا، وہ اس طرح اپنی سیاست کو نافذ کرتا تھا۔

حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کا بظاہر احترام کرتا تھا اور دوسری طرف سے اعلان کرتا تھا جو بھی شخص اہل بیت علیہم السلام کے فضائل میں کوئی حدیث بیان کرے گا اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کسی صورت میں محفوظ نہیں ہے اور جو شخص

اصحاب کی مقببت میں کوئی حدیث بیان کرے گا تو اسے انعام و اکرام سے نوازا جائیگا۔ اسی طرح یہ بھی حکم دیتا تھا کہ خطباء مسلمانوں کے منبروں سے علی کو (لازمی طور پر) گالیاں دیں اور اس کے حکم سے حضرت علی کے حامیوں کو جہاں بھی پاتے تھے موقع پر ہی قتل کر ڈالتے تھے اور اس کام میں اس قدر زیادتی کی کہ حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی آپ کی دوستی کے الزام میں قتل کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے انقلاب سے اسلام کو نقصان پہنچتا۔ اور آپ اور آپ کے ساتھیوں کا خون رایگان ہوتا۔

ان حالات میں بعید نہیں تھا معاویہ امام حسین کو اپنی ہی افراد میں سے کسی کے ذریعہ قتل کرواتا اور اس کے بعد عام لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور انکار کو بدلنے کے لئے آپ کے ماتم میں اپنا گریبان چاک کرتا اور آپ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے آپ کے شیعوں کا قتل عام کرتا، کیونکہ اس نے ہی رویہ عثمان کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ لیکن یزید کی سیاسی روش کسی صورت میں اس کے باپ کی روش سے مشابہ نہیں تھی۔ وہ ایک خود خواہ اور لالہ بالی و بے دین جوان تھا، زور و زبردستی کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا، لوگوں کے انکار و نظریات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

یزید نے اسلام کو پس پردہ پہنچائے جانے والے نقصانات کو اپنے مختصر دور حکومت میں اچانک آشکار کیا اور اس سے پردہ ہٹا دیا۔ اپنی حکومت کے پہلے سال میں، خاندان پیغمبر کا قتل عام کیا۔ دوسرے سال مدینہ منورہ کو منہدم کیا اور تین دن تک لوگوں کی عزت ناموس اور جان و مال کو اپنے سپاہیوں کے لئے مباح قرار دیا۔ تیسرے سال کعبہ کو منہدم کر دیا۔ اسی وجہ سے، امام حسین علیہ السلام کے انقلاب نے لوگوں کے ذہنوں اور انکار میں جگہ پائی اور روز بروز یہ اثر گہرا اور نمایاں ہوتا گیا اور ابتدائی مرحلہ میں خونین انقلابوں کی صورت میں ظاہر ہوا اور آخر کار مسلمانوں کی ایک عظیم تعداد کو حق و حقیقت کے حامیوں اور محبان اہل بیت علیہم السلام کے عنوان سے وجود میں لایا۔ یہی وجہ تھی کہ معاویہ نے یزید کو اپنی وصیتوں کے ضمن میں تاکید و نصیحت کی تھی کہ امام حسین علیہ السلام

^۱ تاریخ گواہ ہے کہ عثمان نے معاویہ سے مسلسل مدد کی درخواست کی لیکن معاویہ نے اسکا مثبت جواب نہیں دیا، لیکن جب عثمان قتل کئے گئے تو ان کے خون کا بدلہ لینے کے بہانہ سے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کی۔

سے کوئی سروکار نہ رکھے اور ان پر اعتراض نہ کرے۔ لیکن کیا یزید کی مستی اور خود خواہی اسے اس بات کی اجازت دیتی کہ وہ اپنے فائدے اور نقصان میں تمیز دے سکے؟!

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام (چوتھے امام)

امام سجاد علیہ السلام نے اپنی امامت کی مدت میں جس روش کو اختیار کیا اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ جو مجموعی طور پر ائمہ اطہار علیہم السلام کی عام روش کے مطابق ہے۔ حضرت امام سجاد علیہ السلام کربلا کے جانکاہ واقعہ میں اپنے والد گرامی کے ہمراہ تھے اور حسینی انقلاب میں شریک تھے اور آپ کے والد گرامی کی شہادت کے بعد آپ اسیر کئے گئے اور کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے جائے گئے۔ امام سجاد علیہ السلام نے اپنی اسیری میں تقیہ سے کام نہیں لیا اور بلا جھجک حق و حقیقت کا اظہار کرتے تھے، اور موقع و محل کے مطابق اپنی تقریروں اور بیانات کے ذریعہ خاندان رسالت کی حقانیت اور ان کے فخر و مباہات کو عام و خاص تک پہنچاتے تھے اور اپنے والد بزرگوار کی مظلومیت اور بنی امیہ کے دردناک ظلم و ستم اور بے رحمی کو ثبت ازبام کر کے لوگوں کے جذبات اور احساسات کو ایک پرتلاطم طوفان میں تبدیل کرتے تھے۔

لیکن قید اور اسیری سے رہائی پانے کے بعد، امام سجاد علیہ السلام مدینہ لوٹے اور جاں نثاری کا ماحول آرام و سکون کے ماحول میں تبدیل ہوا، گھر میں گوشہ نشینی اختیار کی اور غیروں کے لئے دروازہ بند کر دیا اور خدائے متعال کی عبادت میں مشغول ہوئے۔ اور خاموشی سے حق و حقیقت کے حامیوں کی تربیت کرتے رہے۔ حضرت امام سجاد علیہ السلام نے اپنی امامت کے ۳۵ سال کے دوران بالواسطہ یا براہ راست لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی پرورش و تربیت کی اور ان کو اسلامی معارف کی تعلیم دی۔ جو دعائیں حضرت امام سجاد علیہ السلام محراب عبادت میں آسمانی لہجہ میں پڑھتے اور ان کے ذریعہ اپنے پروردگار سے راز و نیاز فرماتے تھے، وہ عظیم اسلامی معارف کے ایک مکمل دورہ پر مشتمل ہیں۔ دعاؤں کے مجموعہ کو ”صحیفہ سجادیه“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (پانچویں امام)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی امامت کے زمانہ میں دینی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے کسی حد تک ماحول سازگار ہوا۔ بنی امیہ کے دباؤ کے نتیجہ میں اہل بیت علیہم السلام کی احادیث نابود ہو چکی تھیں۔ جبکہ احکام کے لئے ہزاروں احادیث کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اصحاب کے ذریعہ پینمبر اسلام کی نقل کی گئی احادیث کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہ تھی۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں کربلا کے جانکاہ واقعہ اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی ۵۳ سالہ کوششوں کے نتیجہ میں شیعوں کی ایک بڑی تعداد وجود میں آگئی تھی۔ لیکن وہ فقہ اسلامی سے خالی ہاتھ تھے۔ چونکہ بنی امیہ کی سلطنت اندرونی اختلافات، راحت طلبی اور حکام کی بے لیاقتی کے نتیجہ میں کمزور ہو رہی تھی اور اس کے پیکر میں روز بروز سستی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے، لہذا امام محمد باقر علیہ السلام نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علوم اہل بیت علیہم السلام اور فقہ اسلامی کے نشر و اشاعت کا کام شروع کیا اور تعلیم و تربیت کے بعد اپنے مکتب سے بہت سے دانشوروں کو معاشرے کے حوالے کیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام (چھٹے امام)

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے زمین زیادہ ہموار اور حالات زیادہ مناسب تھے، کیونکہ حضرت امام محمد باقر کے ذریعہ احادیث کی نشر و اشاعت اور آپ کے مکتب کے شاگردوں کی تبلیغ سے لوگوں میں اسلامی معارف اور علوم اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں شوق پیدا ہو چکا تھا اور حدیث سننے کے نشہ تھے۔ اس کے علاوہ اموی سلطنت نیست و نابود ہو چکی تھی اور عباسی سلطنت ابھی پوری طرح سے مستحکم نہیں ہو سکی تھی اور بنی عباس نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے اور بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت اور شہدائے کربلا کے خون کو دستاویز قرار دیا تھا، لہذا وہ اہل بیت علیہم السلام سے خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ اس فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف علوم کی تعلیم و تربیت کا کام شروع کیا۔ تمام اطراف و اکناف سے علماء و دانشور گروہ در گروہ

آپ کے گھر پر آتے تھے اور آپ کی شاگردی کا شرف حاصل کر کے معارف اسلامی کے مختلف ہنر، اخلاق، تاریخ انبیاء و ائم اور حکمت و موعظہ کے بارے میں سوالات کرتے تھے اور جواب حاصل کرتے تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف طبقات کے لوگوں سے بحثیں کیں اور گونا گوں مل و نخل سے مناظرے کئے اور علوم کے مختلف شعبوں میں کافی شاگردوں کی تربیت کی، آپ کی احادیث اور علمی بیانات سے سیکڑوں کتابیں تالیف ہوئی ہیں، جو ”اصول“ کے نام سے مشہور ہیں۔

شیعوں نے جو اسلام میں اہل بیت علیہم السلام کی روش پر چلتے ہیں، اپنے دینی مقاصد اور مسائل سے آپ کی برکتوں سے مکمل طور پر ابہام کو دور کیا ہے اور اپنے مذہبی مہجولات کو آپ کے واضح اور روشن بیانات سے حل کر دیا۔ اسی لئے شیعہ مذہب (کہ وہی مذہب اہل بیت ہے) لوگوں میں ”مذہب جعفری“ کے نام سے معروف ہو گیا۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کی تحریک

اگرچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد اہل بیت علیہم السلام کے پیروؤں میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا، لیکن بنی امیہ کے حکام کی طرف سے اہل بیت علیہم السلام کے پیروؤں پر زبردست دباؤ کی وجہ سے امام سجاد علیہ السلام کے لئے ممکن نہیں تھا کہ معارف اسلامی کی تعلیم کا کام علی اور اعلانیہ طور پر انجام دیں یہاں تک کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں اموی سلطنت اندرونی اختلافات اور بنی عباس سے کشمکش کے نتیجہ میں کمزور ہونے کے بعد ختم ہوئی گئی۔ اس لئے شیعہ اور اہل بیت علیہم السلام کے پیرو اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی ۳۵ سالہ امامت کے دوران تربیت یافتہ شاگردوں کو موقع ملا اور وہ دور دراز علاقوں سے سیلاب کی طرح امام محمد باقر علیہ السلام کے گھر پر آکر دینی علوم اور اسلامی معارف کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اسلامی معارف کی نشر و اشاعت کا کام شروع کیا، دنیا کے کونے کونے سے آنے والے دانشوروں کو قبول کر کے آپ ان کی تعلیم و تربیت فرماتے تھے اور آپ کی کوششوں کے نتیجہ میں ہزاروں دانشور مختلف علوم و فنون کو آپ سے سیکھ کر دنیا بھر میں ان علوم کی نشر و اشاعت میں مشغول ہوئے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

کے شاگردوں کی تالیف کی ہوئی کتابوں کی تعداد چار سو ہے جو ”اصول اربعۃ“ کے نام سے شیعوں میں معروف ہیں۔ ان کے بعد آنے والے باقی ائمہ علیہم السلام نے بھی ان دو اماموں کی روش پر عمل کرتے ہوئے معارف اسلامی کی نشر و اشاعت کی بنی عباس کے سخت اور شدید دباؤ کے باوجود، انہوں نے بھی بہت سے دانشوروں کی پرورش و تربیت کی اور اسلام کے علمی خزانوں کو ان کے حوالے کیا۔ ان ہی ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی کوششوں کے نتیجے میں آج دنیا کے کونے کونے میں کروڑوں اہل حق موجود ہیں۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (ساتویں امام)

بنی عباس نے بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد خلافت پر قبضہ جایا۔ پھر اس کے بعد بنی فاطمہ کی طرف رخ کیا اور پوری طاقت کے ساتھ خاندان نبوت کو نابود کرنے پر اتر آئے، کچھ لوگوں کے سر قلم کئے، کچھ کو زندہ دفن دیا اور کچھ کو عمارتوں کی بنیادوں میں یادواروں میں چن دیا۔ چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے گھر کو جلادیا اور خود حضرت کو چند بار عراق بلایا۔ اس طرح چھٹے امام کی زندگی کے آخری دنوں میں تقیہ اور سخت ہو گیا تھا اور چونکہ حضرت پر شدید پابندی تھی، لہذا خاص شیعوں کے علاوہ آپ کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے اور آخر کار عباسی خلیفہ منصور کے ذریعہ زہر سے شہید کئے گئے۔ اس طرح ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کی امامت کے زمانہ میں دشمنوں کا دباؤ بہت سخت تھا اور روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے شدید تقیہ کے باوجود علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کو جاری رکھا اور بہت سی احادیث کو شیعوں کے حوالہ کر دیا۔ چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ سے منقول فقہی احادیث پانچویں اور چھٹے امام کے بعد دوسرے ائمہ کی نسبت سب سے زیادہ ہیں۔ تقیہ کی شدت کی وجہ سے آپ سے منقول احادیث میں ”عالم و عبد صالح“ جیسی تعییریں استعمال کی گئی ہیں اور حضرت کا نام صریحاً ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام عباسی خلفاء کے چار افراد؛ منصور، ہادی، ہمدی اور ہارون کے معاصر تھے۔ آخر کار ہارون کے حکم سے آپ کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور برسوں تک ایک زندان سے دوسرے زندان میں منتقل ہوتے رہے اور سرانجام زندان میں ہی زہر دے کر آپ کو شہید کیا گیا۔

حضرت امام رضا علیہ السلام (آٹھویں امام)

حالات پر غور و فکر کرنے سے ہر صاحب نظر کے لئے واضح تھا کہ خلفائے وقت اور دشمنان اہل بیت علیہم السلام جتنا ائمہ حدیٰ کو جہانی اذیتیں پہنچا کر نابود کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کے شیعوں سے سختی سے پیش آتے تھے، اتنا ہی ان کے پیروؤں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور ان کا ایمان مزید مستحکم ہوتا جا رہا تھا اور دربار خلافت ان کی نظروں میں ایک نجس اور ناپاک دربار سمجھا جاتا تھا۔ یہ مطلب ایک باطنی عقیدہ تھا جو ائمہ اطہار علیہم السلام کے معاصر خلفاء کو ہمیشہ رنج و عذاب میں مبتلا کر رہا تھا اور حقیقت میں انہیں بے بس اور بچارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ مامون بنی عباس کا ساتواں خلیفہ تھا اور حضرت امام رضا علیہ السلام کا معاصر تھا۔ اس نے اپنے بھائی امین کو قتل کرنے کے بعد خلافت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اس فکر میں پڑا کہ اپنے آپ کو باطنی رنج و پریشانی سے ہمیشہ کے لئے نجات دے اور زور و زبردستی اور دباؤ کے علاوہ کسی اور راستہ سے شیعوں کو اپنے راستہ سے ہٹا دے۔ اس منصوبہ کو علمی جامہ پہنانے کے لئے جس سیاست کو مامون نے اختیار کیا، وہ یہ تھی کہ اپنا ولی عہد، حضرت امام رضا علیہ السلام کو بنایا تاکہ حضرت کو ناجائز خلافت کے نظام میں داخل کر کے، شیعوں کی نظروں میں آپ کو مشکوک کر کے ان کے ذہنوں سے امام کی عصمت و طہارت کو نکال دے۔

اس صورت میں مقام امامت کے لئے کوئی امتیاز باقی نہ رہتا، جو شیعوں کے مذہب کا اصول ہے، اس طرح ان کے مذہب کی بنیاد خود بخود نابود ہو جاتی۔ اس سیاست کو علمی جامہ پہنانے میں ایک اور کامیابی بھی تھی وہ یہ کہ بنی فاطمہ کی طرف سے خلافت بنی عباس کو سرنگوں کرنے کے لئے جو پے درپے تحریکیں سراٹھار رہی تھیں، ان کو کچل دیا جاتا، کیونکہ جب بنی فاطمی مشاہدہ کرتے کہ خلافت ان میں منتقل ہو چکی ہے، تو فطری طور پر اپنے خونین انقلابوں سے اجتناب کرتے۔ البتہ اس منصوبہ کو علمی جامہ پہنانے کے بعد امام رضا علیہ السلام کو راستے سے ہٹانے میں مامون کے لئے کوئی حرج نہیں تھا۔ مامون نے حضرت امام رضا علیہ السلام کو پہلے خلافت قبول کرنے اور اس کے بعد ولی عہد کا عہدہ قبول کرنے کی پیش کش کی۔ امام نے مامون کی طرف سے تاکید، اصرار اور دھمکی کے نتیجے میں

آخر کار اس شرط پر ولی عہدی کو قبول کیا کہ حکومت کے کاموں میں جیسے عزل و نصب میں مداخلت نہیں کریں گے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے اسے ماحول میں لوگوں کے انکار کی ہدایت کرنے کا کام سنبھالا اور جہاں تک آپ کے لئے ممکن تھا مختلف مذاہب و ادیان کے علماء سے بحثیں کیں اور اسلامی معارف اور دینی حقائق کے بارے میں گراں بہا بیانات فرمائے (مامون بھی مذہبی بحثوں کے بارے میں کافی دلچسپی رکھتا تھا) اسلامی معارف کے اصولوں کے بارے میں جس طرح امیر المومنین کے بیانات بہت میں اور دیگر ائمہ کی نسبت پیش تر ہیں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کی برکتوں میں سے ایک برکت یہ تھی کہ آپ کے آباء و اجداد کی بہت سی احادیث جو شیعوں کے پاس تھیں ان سب کو آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور آپ کے اشارہ اور تشخیص سے ان میں سے دشمنوں کے ناپاک باتوں کی جعل اور وضع کی گئی احادیث کو شخص کر کے مسترد کیا گیا۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے ولی عہدی کے طور پر جو سفر مدینہ منورہ سے ”مرو“ تک کیا اس کے دوران خاص کر ایران میں عجیب جوش و خروش پیدا ہوا اور لوگ ہر جگہ سے جوق در جوق زیارت کے لئے آپ کی خدمت میں آتے تھے اور شب و روز آپ کے شمع وجود کے گرد پروانہ وار رہتے تھے اور آپ سے دینی معارف و احکام سیکھتے تھے۔ مامون نے جب دیکھا کہ لوگ بے مثال اور حیرت انگیز طور پر حضرت امام رضا علیہ السلام کی طرف متوجہ ہیں تو اس کو اپنی سیاست کے غلط ہونے کا احساس ہوا، اس لئے اس نے اپنی غلط سیاست میں اصلاح کرنے کی غرض سے امام کو زہر دیکر شہید کیا اور اس کے بعد اہل بیت علیہم السلام اور ان کے شیعوں کے بارے میں خلفاء کی اسی پرانی سیاست پر گامزن رہا۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام (نویں امام)

حضرت امام علی نقی علیہ السلام (دسویں امام)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام (گیارہویں امام)

ان تین ہستیوں کی زندگی کے حالات مشابہ تھے۔ امام رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد مامون نے آپ کے اکلوتے بیٹے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کو بغداد بلایا اور پیار و محبت سے پیش آیا، اپنی بیٹی سے آپ کی شادی کی اور پورے احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔ یہ طرز عمل اگرچہ دوستانہ دکھائی دیتا تھا، لیکن مامون نے حقیقت میں اس سیاست کے ذریعہ امام علیہ السلام پر ہر لحاظ سے شدید پابندی لگائی تھی۔ حضرت امام علی نقی و حضرت امام حسن عسکری علیہما السلام کا اپنی امامت کے دوران سامرا میں۔ جوان دنوں دار الخلافہ تھا۔ سکونت کرنا بذات خود ایک قسم کی نظر بندی تھی۔

ان تین اماموں کی امامت کی مدت مجموعی طور پر ۵۵ سال ہے، ان دنوں ایران، عراق اور شام میں رہنے والے شیعوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور ان میں ہزاروں رجال حدیث بھی موجود تھے۔ اسکے باوجود ان تین ائمہ علیہم السلام سے منقول احادیث بہت کم ہیں اور ان کی عمریں بھی کم تھیں۔ نویں امام ۵۵ سال کی عمر میں دسویں امام ۶۰ سال کی عمر میں اور گیارہویں امام ۷۰ سال کی عمر میں شہید کئے گئے۔ یہ سب نکات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان کے زمانے میں دشمنوں کی طرف سے ان پر شدید پابندی تھی اور ان کے کام میں روٹے اٹکائے جاتے تھے، لہذا یہ ائمہ اپنی ذمہ داریوں کو آزادانہ طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے پھر بھی دین کے اصول اور فروع کے بارے میں ان تین ائمہ سے بعض گراں بہا احادیث نقل ہوئی ہیں۔

حضرت امام مہدی موعود عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف (بارہویں امام)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانہ میں خلافت کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ ہر ممکن وسیلہ اور ذریعہ سے حضرت کے جانشین کو نابود کریں تاکہ اس کے ذریعہ مسئلہ امامت اور اس کے نتیجے میں مذہب تشیع کو ختم کر دیں۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام پر

دوسری پابندیوں کے علاوہ یہ بھی ایک پابندی تھی۔ اس لحاظ سے امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی پیدائش مٹھی رکھی گئی اور آپ (عج) کی چھ سال کی عمر تک آپ (عج) کے پدر بزرگوار زندہ تھے۔ آپ (عج) کو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جاتا تھا اور شیعوں کے چند خاص افراد کے علاوہ آپ (عج) کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ والد گرامی کی شہادت کے بعد حضرت (عج) نے خدا کے حکم سے غیت صغریٰ اختیار کی اور اپنے چار خاص نائبوں کے ذریعہ جو یکے بعد دیگرے آپ (عج) کے نائب مقرر ہوئے تھے، شیعوں کے سوالات کا جواب دیتے تھے اور ان کی مشکلات کو حل فرماتے تھے۔

اس کے بعد سے حضرت (عج) آج تک غیت کبریٰ میں ہیں، جب آپ (عج) کو خدا کا حکم ہوگا تو اس وقت ظہور فرما کر زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جو ظلم و ستم سے پھر چلی ہوگی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت مہدی موعود (عج) اور آپ (عج) کی غیت و ظہور کے بارے میں شیعہ و سنی راویوں نے بے شمار احادیث نقل کی ہیں اور اسی طرح شیعوں کی بزرگ شخصیتوں کی ایک بڑی تعداد آپ (عج) کے والد گرامی کی زندگی میں آپ (عج) کی خدمت میں پہنچ کر آپ (عج) کے نورانی جمال کا دیدار کر چکی ہے اور آپ (عج) کے والد گرامی سے امامت کی خوش خبری سن چکی ہے۔ اسکے علاوہ نبوت اور امامت کی بحث میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا ہرگز خدا اور اس دین کی حفاظت کرنے والے امام سے خالی نہیں رہے گی۔

ائمہ دین کی روش کا اخلاقی نتیجہ

خدا کے انبیاء اور ائمہ دین کے بارے میں جو کچھ تاریخ سے خلاصہ کے طور پر حاصل ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ حقیقت پسند اور حق کے پیرو تھے اور عالم بشریت کو حقیقت پسندی اور حق کی پیروی کرنے کی دعوت دیتے تھے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی جاں نثاری اور قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ وہ کوشش کرتے تھے کہ انسان اور انسانی معاشرہ کی کما حقہ تربیت کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں پر جاہلانہ یا خرافاتی افکار کی حکمرانی کے بجائے صحیح افکار و عقائد حکم فرما ہوں، اور انسانیت کے پاک دامن کو حیوانی خصلتوں سے داغدار اور آلودہ نہ ہونے دیں درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑنے اور اپنا ایٹ بھرنے

کے بجائے انسانی عادات کو اپنا کر زندگی کے بازار میں انسانیت کا سرمایہ لگا کر انسانیت کے نقد فائدے سے سعادت حاصل کریں۔ یعنی وہ ایسے تھے جو اپنی سعادت نہیں چاہتے تھے مگر معاشرے کی سعادت اور عالم انسانیت کے لئے اس کے علاوہ کسی فریضہ کو تنقیض نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی بھلائی اور سعادت (کہ انسان اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتا ہے) اس میں دیکھی تھی کہ سب کے خیر خواہ ہوں اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ایسے ہی ہوں یعنی جو شخص جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے اسے دوسرے کیلئے پسند کرے اور جس چیز کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا ہے اسے دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

اسی حقیقت بینی اور حق کی پیروی کے نتیجے میں ان حضرات نے اس عام انسانی فریضہ کی اہمیت ”خیر خواہی“ اور دیگر جزئی فرائض جو اس کے فروع میں ہکا پتہ چلایا ہے اور جاں نثاری و فداکاری جیسے صفات کے مالک بن گئے ہیں اور انہوں نے راہ حق میں جان و مال کی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا اور بدخواہی پر مشتمل ہر صفت کو بڑے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ اپنے مال و جان کے بارے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ خود پرستی اور کنجوسی سے متنفر تھے، جھوٹ نہیں بولتے تھے، کسی پر تہمت نہیں لگاتے تھے، دوسروں کی عزت اور جان و مال پر تجاوز نہیں کرتے تھے۔ ان صفات کی تفصیلی وضاحت اور آثار کو اخلاق کے حصہ میں ہونا چاہئے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے اجمالی حالات

پہلے امام نام: امیر المومنین حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ۲۳ سال قبل ہجرت

خلافت: ۵۴ ہجری

شہادت: ۴۰ ہجری

مدت خلافت: تقریباً پانچ سال

مدت عمر: ۶۳ سال

دوسرے امام

نام: حسن علیہ السلام

مشہور لقب: مجتبیٰ

کنیت: ابو محمد

والد گرامی: حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ۵ جہری

شہادت: ۵۰ جہری، معاویہ کے ایما پر اپنی زوجہ کے ذریعہ

زہرے شہید کئے گئے۔

مدت عمر: ۴۸ سال

مدت امامت: دس سال

تیسرے امام

نام: حسین علیہ السلام

لقب: سید الشہداء

کنیت: ابو عبد اللہ

والد گرامی: حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ۱۲ ہجری

شہادت: ۶۱ ہجری یزید بن معاویہ کے حکم سے شہید کئے گئے۔

مدت عمر: ۵۰ سال

مدت امامت: دس سال

چوتھے امام نام: علی علیہ السلام

لقب: سجاد اور زین العابدین

کنیت: ابو محمد

والد گرامی: حضرت امام حسین علیہ السلام

پیدائش: ۳۸ ہجری

شہادت: ۶۰ ہجری میں ہشام بن عبد الملک کے حکم سے زہر دیا گیا۔

مدت عمر: ۲۶ سال



مدت امامت: ۳۵ سال

پانچویں امام نام: محمد علیہ السلام لقب: باقر

کنیت: ابو جعفر والد گرامی: حضرت امام سجاد علیہ السلام

پیدائش: ۵۸ ہجری

شہادت: ۸۰ ہجری میں ابراہیم بن ولید کے حکم سے زہر دیا گیا۔

مدت عمر: ۵۹ سال

مدت امامت: ۲۳ سال

چھٹے امام نام: جعفر علیہ السلام

لقب: صادق

کنیت: ابو عبد اللہ والد گرامی:

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

پیدائش: ۸۰ ہجری

شہادت: ۱۲۸ ہجری میں منصور عباسی کے حکم سے زہر دیا گیا

مدت عمر: ۶۸ سال

مدت امامت: ۳۱ سال

ساتویں امام نام: موسیٰ علیہ السلام

لقب: کاظم

کنیت: ابوالحسن والد گرامی:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

پیدائش: ۸۰ھ ہجری

شہادت: ۸۲ھ ہجری

مدت عمر: ۵۴ سال

مدت امامت: ۳۵ سال

آٹھویں امام نام: علی علیہ السلام

لقب: رضا

کنیت: ابوالحسن والد گرامی:

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

پیدائش: ۸۴ھ ہجری



شہادت: ۳۰ ہجری میں مامون عباسی کے ہاتھوں زہرے شہید کئے گئے

مدت عمر: ۵۵ سال

مدت امامت: ۲۱ سال

نویں امام نام: محمد علیہ السلام

لقب: تقی اور جواد

کنیت: ابو جعفر والد گرامی: حضرت امام رضا علیہ السلام

پیدائش: ۱۹۵ ہجری

شہادت: ۲۰ ہجری میں معتمد عباسی کے ایا پر اپنی زوجہ کے ہاتھوں زہرے شہید کئے گئے

مدت عمر: ۲۵ سال

مدت امامت: ۷ سال

دسویں امام نام: علی علیہ السلام

لقب: ہادی و تقی

کنیت: ابو الحسن والد گرامی: حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

پیدائش: ۲۴ ہجری

شہادت: ۵۴ھ ہجری

مدت عمر: ۴۰ سال

مدت امامت: ۳۴ سال

گیارہویں امام نام: حسن علیہ السلام

لقب: عسکری

کنیت: ابو محمد والد گرامی: حضرت امام علی نقی علیہ السلام

پیدائش: ۳۲ھ ہجری

شہادت: ۶۰ھ ہجری

مدت عمر: ۲۸ سال

مدت امامت: ۷ سال

بارہویں امام نام: محمد ح م د علیہ السلام

لقب: ہادی اور مہدی

کنیت: ابو القاسم والد گرامی: حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

پیدائش: ۵۶ھ ہجری



آپ خدا کے حکم سے نظروں سے غائب ہیں، جس دن خدا چاہے گا ظہور فرما کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔



ترجمہ تحریک
Translation Movement

اخلاق و احکام کے چند سبق

اخلاق کے چند سبق

جیسا کہ معلوم ہوا، دین مقدس اسلام ایک ایسا عام اور لافانی نظام ہے جسے خدائے متعال نے انسان کی دنیوی و اخروی زندگی کے لئے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا ہے تاکہ انسانی معاشرے میں نافذ ہو جائے اور انسانیت کی کشتی کو جہالت و بد بختی کے بھنور سے نکال کر نجات کے ساحل پر لگا دے۔ چونکہ دین، زندگی کا نظام ہے، لہذا ضروری ہے کہ زندگی سے مربوط چیزوں کے بارے میں انسان کے لئے ایک فریضہ کو معین کرے اور اس کے انجام کو انسان سے طلب کرے۔ مکی طور پر ہماری زندگی تین امور سے مربوط ہے: ۱۔ خدائے متعال سے کہ ہم اسکی مخلوق ہیں، اسکی نعمت کا حق ہر حق سے زیادہ ہے اور اس کی ذات اقدس کے بارے میں فرض شناسی ہر واجب سے زیادہ واجب ہے۔

۲۔ زندگی کا رابطہ خود ہمارے ساتھ۔

۳۔ اپنے ہم جنسوں سے رابطہ، ہم اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں تاکہ اپنے کار و کوشش کو ان کے تعاون اور مدد سے انجام دیں۔ اس بنا پر، ہم قاعدے کے مطابق مکی طور پر تین فرائض رکھتے ہیں: الف: خدا کے بارے میں فریضہ۔

ب: اپنے بارے میں فریضہ۔

ج: دوسروں کے بارے میں فریضہ۔

خدا کے بارے میں انسان کا فریضہ

خدا کے بارے میں ہمارا فریضہ، اہم ترین فریضہ ہے۔ اس کو انجام دینے میں ہمیں پاک دل اور خالص نیت سے کوشش کرنی

چاہئے۔ سب سے پہلے انسانی فریضہ یہ ہے کہ اپنے پروردگار کو پہچانے، کیونکہ خدائے متعال کا وجود، ہر مخلوق کے وجود کا سرچشمہ ہے اور ہر وجود و حقیقت کا خالق ہے۔ اس کے مقدس وجود کی معرفت اور اس کا علم ہر حقیقت میں نگاہ کے لئے روشنی ہے۔ اس حقیقت سے بے اعتنائی اور دوری، ہر قسم کی جہالت، بے بصیرتی اور فریضہ کے نہ جاننے کا سرچشمہ ہے۔ جو شخص حق کی معرفت سے بے اعتنائی کرے اور نتیجہ میں اپنے ضمیر کے روشن چراغ کو بجھا دے، تو اس کے لئے حقیقی انسانی سعادت کو حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں، جو لوگ خدا شناسی سے روگردانی کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں اس حقیقت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، وہ انسانی معنویات سے کھلی طور پر دور ہیں اور ان کی منطق چوپایوں اور درندوں کی منطق ہے خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (فَاعْرِضْ عَنْ مَن تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا * ذٰلِكَ مَبْلَغُمْ مِّنَ الْعِلْمِ!) ”لہذا جو شخص بھی ہمارے ذکر سے منہ پھیرے اور زندگانی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے، آپ بھی اس سے کنارہ کش ہو جائیں یہی ان کے علم کی اتہا ہے۔“ البتہ یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ خدا شناسی، انسان کے لئے۔ جو ایک حقیقت بین اور استدلالی فطرت والی مخلوق ہے۔

اضطرابی اور قہری ہے، کیونکہ وہ اپنے خداداد شعور سے خلقت کے جس شے پر بھی نگاہ کرتا ہے، خالق کائنات کے وجود اور اس کے علم و قدرت کے آثار کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس بنا پر خدا شناسی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان نے خدا شناسی کو اپنے لئے ایجاد کیا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسان اس واضح حقیقت کو کہ جس پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا، بے اعتنائی کی نگاہ سے نہ دیکھے اور اپنے ضمیر کو جو اسے ہر وقت خدا کی طرف دعوت دیتا ہے، مثبت جواب دے اور اس معرفت کی تحقیق کر کے ہر قسم کے شک و شبہ کو اپنے دل سے نکال دے۔

خدا پرستی

خدا شناسی کے بعد ہمارا دوسرا فریضہ خدا پرستی ہے، کیونکہ حق کی معرفت کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سعادت و خوشنہی۔ جو ہمارا تہما مقصد ہے۔ ایک ایسے پروگرام پر عمل کرنے اور اسے نافذ کرنے میں پوشیدہ ہے جسے خدائے متعال نے ہماری زندگی کے لئے معین فرمایا ہے اور اسے اپنے انبیاء کے ذریعہ ہم تک پہنچایا ہے پس خدائے متعال کے حکم کی اطاعت اور اسکی بندگی ایسا فریضہ ہے کہ جس کے مقابلہ میں ہر فریضہ ناچیز اور حقیر ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (وقضی ربک الّا تعبدوا الّا یناہ۔۔۔) ”اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا“۔ (الم اعدا لکم یا بنی آدم ان لا تعبدوا الشیطن انہ لکم عدو مبین* وان اعبدونی ہذا صراط مستقیم^۱) ”اولاد آدم! کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ خبردار شیطان کی عبادت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور میری عبادت کرنا کہ یہی صراط مستقیم اور سیدھا راستہ ہے“۔

اس بنا پر، ہمارا فریضہ ہے کہ مقام بندگی اور اپنی ضرورت کو پہچانیں اور خدائے متعال کی لامحدود عظمت و کبریائی کو مد نظر رکھیں اور اس کو ہر جہت سے اپنے اوپر مسلط جان کر اس کے فرمان کی اطاعت کریں۔ ہم پر واجب ہے کہ خدائے متعال کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں اور پیغمبر گرامیؐ و ائمہ ہدیؑ۔ کہ خدائے متعال نے ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ کے علاوہ کسی اور کی اطاعت نہ کریں۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (یا طیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم^۲۔۔۔) ”اللہ کی اطاعت کرو، رسول اور صاحبان امر (ائمہ) کی اطاعت کرو“، البتہ خدائے متعال اور اولیائے دین کی اطاعت کے اثر میں، علاؤ خدا سے منسوب ہر چیز کا مکمل احترام کرنا چاہئے۔ خدا اور اولیائے دین کے نام کو ادب کے ساتھ لینا چاہئے۔ خدا کی کتاب (قرآن مجید)، کعبہ شریف، مساجد

^۱ اسراء، ۲۳

^۲ نساء، ۵۹

^۳ نساء، ۵۹

اور اولیائے دین کی قبور کا احترام کرنا چاہئے چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (وَمَنْ يَعْظَمْ شَعْرَ اللَّهِ فَانْهَ مِنْ تَقْوَىٰ) ”جو بھی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا یہ تعظیم اس کے دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہوگی“۔

اپنے بارے میں انسان کا فریضہ

انسان اپنی زندگی میں جو بھی روش اختیار کرے اور جس راستہ پر چلے، حقیقت میں وہ اپنے لئے سعادت و کامیابی کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتا۔ چونکہ سعادت کو پہچاننا، کسی اور چیز کی پہچاننے کے ضمن میں ہے یعنی جب تک ہم خود کو نہ پہچانیں گے اس وقت تک اپنی حقیقی ضرورتوں کے ان کو پورا کرنے میں ہماری سعادت ہے۔ کو بھی نہیں پہچان سکیں گے۔ اس بنا پر انسان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ خود کو پہچان لے تاکہ اس کے سبب اپنی سعادت و خوشنہی کو سمجھے اور اپنے پاس موجود وسائل کے ذریعہ اپنی ضرورتوں کو دور کرنے کی کوشش کرے اور اپنی گراں بہا عمر جو اس کا تہا سرمایہ ہے، کو مفت میں ضائع نہ ہونے دے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ”: جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا ہے“^۱، امیر المؤمنین حضرت علیؓ فرماتے ہیں ”: جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، وہ معرفت کے بلند ترین مقام پر پہنچ گیا“^۲، انسان اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد متوجہ ہوتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ گویا انسانیت کی قدر کرے۔

اس گویا تباہ کن کو ہوا و ہوس کے ذریعہ پامال نہ کرے، اپنی ظاہری و باطنی صفائی کے لئے کوشش کرے تاکہ ایک شیریں، لذت بخش اور ابدی زندگی کو حاصل کر سکے۔ امیر المؤمنین حضرت علیؓ فرماتے ہیں ”: جو شخص اپنا احترام کرے گا، اسکے سامنے نفسانی خواہشات حقیر اور ناچیز ہوں گی۔“^۳، انسانی وجود دو چیزوں کا مرکب ہے: ”روح اور بدن“ انسان کا فریضہ ہے کہ ان دونوں

^۱ حج، ۳۲

^۲ بحار الانوار، ج ۶۱، ص ۹۹۔

^۳ غرر الحکم، ج ۲ ص ۱۲۸۷ ص ۶۹۸۔

^۴ غرر الحکم، ج ۲، ص ۶۸۱، ح ۱۱۰۹۔

ارکان کی صحت و استحکام کے لئے کوشش کرے اور اسلام کے مقدس دین میں دونوں حصوں کے بارے میں بیان کئے گئے مفصل اور کافی احکام کے مطابق بدن اور روح کی صفائی کی کوشش کرے۔

بدن کی صفائی

دین مقدس اسلام نے کچھ قوانین و ضوابط کے ضمن میں، جسمانی صفائی کی کافی تاکید کی ہے، جیسے: خون، مردار، بعض حیوانوں کا گوشت اور زہریلی غذاؤں کو کھانے سے منع کیا ہے۔ شراب نوشی، نجس پانی پینے، پرخوری، اور بدن کو ضرر پہنچانے کی نہی کی ہے اس کے علاوہ دوسرے احکامات میں کہ اس فصل میں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے، خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے انسان کو تمام نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے۔

صفائی کا خیال

صفائی، حفظان صحت کے اہم اصولوں میں سے ایک اصول ہے، اسی لئے دین اسلام میں اس اصول کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ جو اہمیت اسلام میں صفائی کو دی گئی ہے، کسی اور دین میں نہیں پائی جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ”الثَّائِفَةُ مِنَ الْإِيمَانِ“^۱

”صفائی ایمان کا حصہ ہے“

اسکے علاوہ اسلام عام طور پر صفائی اور پاکیزگی کا حکم دیتا ہے، بالخصوص ہر ایک کے لئے صفائی کی نصیحت کرتا ہے، جیسے: ہاتھ پاؤں کے ناخن کاٹنا، سر اور بدن کے زائد بالوں کو صاف کرنا، کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو دھونا، بالوں کو لگنی کرنا، مٹی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا، دن میں کئی بار مواک کرنا، گھر کو جھاڑو کرنا، راستوں، گھر کے دروازوں اور درختوں وغیرہ کے نیچے کو صاف

^۱ نہج الفصاحہ، ج ۱، ۳۱۶، ص ۶۳۶۔

ستھرا رکھنا۔ اسکے علاوہ اسلام نے بعض عبادتوں کا حکم دیا ہے کہ جن کا تعلق صفائی و پاکیزگی وغیرہ سے ہے، جیسے: لباس اور بدن کو نجاستوں سے پاک کرنا، دن میں کئی مرتبہ نماز کے لئے وضو کرنا اور نماز و روزہ کے لئے مختلف غسل کرنا۔

کھلی اور مٹاؤ

انسان منہ سے کھانا کھاتا ہے اور کھانا کھانے کی وجہ سے منہ آلودہ ہوتا ہے، دانتوں کے درمیان زبان پر اور منہ کی دوسری جگہوں پر کھانے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رہ جاتے ہیں، اس لئے منہ کے اندر بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات کھانے کے ٹکڑوں میں کیمیائی عمل وارد عمل اور خمیر ہونے کی وجہ سے زہریلے مواد وجود میں آتے ہیں اور کھانے کے ساتھ مل کر معدے میں جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ ایسا شخص لوگوں کے مجمع میں سانس لیکر بدبو پھیلاتا ہے اور دوسروں کو اذیت پہنچاتا ہے۔

اس لئے شرع مقدس اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ہر دن (خاص کر ہر وضو سے پہلے) اپنے دانتوں کو مٹاؤ کریں اور صاف پانی سے کھلی کریں اور اپنے منہ کو آلودگی سے پاک کریں۔ استنشق (ناک میں پانی ڈالنا) سانس لینا، انسان کی ضروریات زندگی میں سے ہے اور غالباً جو انسان کے رہنے کی جگہ پر ہوتی ہے، گرد و غبار اور کثافت سے خالی نہیں ہوتی، البتہ ایسی ہوا میں سانس لینا نظام تنفس کے لئے مضر ہے۔

اس ضرر کو روکنے کے لئے خدائے مہربان نے ناک کے اندر کچھ ایسے بال اگائے ہیں جو گرد و غبار کو پھپھڑوں تک پہنچنے نہیں دیتے، اس کے باوجود کبھی گرد و غبار ناک کے اندر جمع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ناک کے بال اپنی ذمہ داری نبھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس لئے دین اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان دن میں کئی بار وضو سے پہلے ناک میں پانی ڈالیں اور اپنی ناک میں صاف پانی ڈال کر اپنے تنفس سے مربوط حفظان صحت کی رعایت کریں۔

تہذیب اخلاق

انسان اپنے خداداد ضمیر سے پسندیدہ اخلاق کی قدروقیمت کو سمجھتا ہے اور اسکی انفرادی واجتماعی اہمیت کو جان لیتا ہے۔ لہذا انسانی معاشرے میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جو پسندیدہ اخلاق کی تعریف اور پسندیدہ اخلاق رکھنے والے شخص کا احترام نہ کرے۔ جو اہمیت انسان پسندیدہ اخلاق کو دیتا ہے وہ محتاج تعارف و بیان نہیں ہے اور اسلام میں اخلاق کے بارے میں جو وسیع احکام بیان ہوئے ہیں وہ سب واضح ہیں۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: (ونفس واسبوا* فآلمہا فجورہا وتقوہا* قد افلح من زکنا* وقد خاب من شقا^۱)

”اور نفس کی قسم اور اس خدا کی قسم جس نے اسے درست کیا ہے، پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے، بیشک وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا، اور وہ نامراد ہو گیا جس نے اسے آلودہ کر دیا ہے“، حصول علم پسندیدہ معنوی صفات میں سے ایک علم ہے اور عالم کی جاہل پر فضیلت و برتری انظر من الشمس ہے۔

جو چیز انسان کو دوسرے حیوانات سے جدا کرتی ہے بیشک وہ عقل کی طاقت اور علم کا زیور ہے۔ دوسرے حیوانات میں سے ہر ایک اپنی خاص بناوٹ کے مطابق ناقابل تغیر فطرت رکھتا ہے اور یکساں صورت میں اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور اس کی زندگی میں ہرگز کسی قسم کی ترقی اور بلندی کی کوئی امید نہیں پائی جاتی، وہ اپنے اور دوسروں کے لئے کوئی نیا باب نہیں کھول سکتے ہیں یہ صرف انسان ہے جو عقل کی طاقت سے ہر روز اپنے گزشتہ معلومات میں جدید معلومات کا اضافہ کرتا ہے اور طبیعت اور مادی طبیعت کے قوانین کو کشف کر کے ہر زمانہ میں اپنی مادی اور معنوی زندگی کو تازگی اور رونق بخشتا ہے، اپنے ماضی کے ادوار پر نظر ڈال کر اپنے اور دوسروں کے مستقبل کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اسلام نے علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں اس قدر تاکید کی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے“، ”علم حاصل کرو، اگرچہ چین میں بھی

^۱ الشمس، ۷-۱۰

^۲ اصول کافی، ج ۱، ص ۳۰۔

ہوا، ”گہوارہ سے قبر تک علم حاصل کر نیکی کو شش کرو“، اسلام، خلقت کے اسرار کو جاننے اور آسمانوں، زمین، انسان کی فطرت، تاریخ و مل اور اپنے اسلاف کے آثار (فلسفہ، علوم ریاضی و طبیعی وغیرہ) کے بارے میں غور و خوض کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے اور اسی طرح اخلاقی اور شرعی مسائل (اسلامی اخلاق و قوانین) اور صنائع کے اقام۔ جو انسان کی زندگی کو منظم کرتے ہیں۔ کو دیکھنے کی اسلام بہت ترغیب دیتا اور تاکید کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں علم کی اہمیت اس قدر ہے کہ جنگ بدر میں جب کفار کی ایک جماعت مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اسیروں میں سے ہر فرد زیادہ رقومات ادا کر کے آزاد ہو سکتا ہے، لیکن اسیروں میں جو افراد تعلیم یافتہ تھے وہ یہ رقومات ادا کرنے سے اس شرط پر مستثنیٰ قرار دیئے گئے کہ ان میں سے ہر ایک دس جوان مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔

اسلام کی نظر میں طالب علم کی اہمیت

ہر مقصد تک پہنچنے کے لئے سعی و کوشش کی اہمیت خود اس مقصد کی اہمیت کے برابر ہوتی ہے اور چونکہ ہر انسان اپنی خداداد فطرت سے عالم بشریت میں علم و دانش کو ہر چیز سے بالاتر جانتا ہے، لہذا طالب علم کی قدر و قیمت بالاترین قدر و قیمت ہوگی اس چیز کے پیش نظر کہ اسلام ایسا دین ہے کہ جو فطرت کی بنیادوں پر مستحکم و استوار ہے لہذا ابلا شہم طالب علم کی سب سے زیادہ قدر و قیمت کا قائل ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ”جو علم حاصل کرنے کی راہ میں ہو، وہ خدا کا محبوب ہے“^۱ اس کے باوجود کہ جہاد دین کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے اور اگر پیغمبر یا امام حکم جہاد دیدیں تو عام مسلمانوں کا جنگ میں شریک ہونا ضروری ہو جاتا ہے، لیکن جو لوگ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ اس حکم سے مستثنیٰ اور معاف ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہمیشہ علمی مراکز میں تعلیم حاصل کرنے میں مشغول رہنا چاہئے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (وما کان المؤمنون لینفروا کافّةً فلولاً نفر من

^۱ نہج الفصاحہ، ج ۳۲۴، ص ۶۳۔

^۲ نہج الفصاحہ، ج ۳۲۷، ص ۶۴۔

^۳ بحار الانوار، (ج ۱ ص ۱۷۸، ح ۶۰)۔

کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون^۱ ”صاحبان ایمان کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ سب کے سب جہاد کے لئے نکل پڑیں تو ہر گروہ میں سے ایک جماعت اس کام کے لئے کیوں نہیں نکلتی ہے کہ دین کا علم حاصل کرے اور پھر جب اپنی قوم کی طرف پلٹ کر آئے تو اسے عذاب الہی سے ڈرائے کہ شاید وہ اس طرح ڈرنے لگیں۔“

معلم اور مربی کی اہمیت

علم اور طالب علم کے بارے میں مذکورہ بیان سے اسلام میں معلم کی بھی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”من تعلت منہ حرفا صرت له عبدا“^۲ ”جو مجھے ایک کلمہ تعلیم دیدے میں خود کو اس کا بندہ قرار دوں گا“ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ”لوگوں کے تین گروہ ہیں: پہلا: عالم ربانی، دوسرا: جوانی اور دوسروں کی نجات کے لئے علم حاصل کرتا ہے۔ تیسرا: وہ لوگ جو عقل و دانش سے عاری ہوتے ہیں ان لوگوں کی مثال اس مکھی کی سی ہے جو جانوروں کے سرو و صورت پر بیٹھتی ہے اور ہوا کے چلنے پر ادھر ادھر اڑتی ہے یا جہاں سے بھی بدبو آتی ہے اسکی طرف دوڑتی ہے۔“

معلم اور شاگرد کا فریضہ

قرآن مجید، علم و دانش کو انسان کی حقیقی زندگی جانتا ہے، کیونکہ اگر علم نہ ہوتا تو انسان اور مردوں میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ اس بنا پر طالب علم کو چاہئے کہ اپنے معلم کو زندگی کا مرکز تصور کرے تاکہ تدریجاً اپنی حقیقی زندگی کو اس سے حاصل کر سکے، اس لحاظ سے اسے یہ تصور کرنا چاہئے کہ اس کے توسط سے اسے زندگی ملی ہے اس لئے اس کی عزت و تعظیم میں کوتاہی نہ کرے اور اگر تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں اس کی طرف سے اگر سختی بھی دکھائی دے تو اس کی زندگی اور موت کے بعد اس کے احترام میں کوتاہی نہ کرے۔ اسی طرح معلم کو بھی اپنے آپ کو اپنے شاگرد کی زندگی کا ذمہ دار سمجھنا چاہئے اور جب تک اسے ایک زندہ انسان اور فخر و مباہات کے درجہ تک نہ پہنچا دے اس وقت تک محسوس نہ کرے اور آرام سے نہ بیٹھے۔ اگر کبھی اس کا شاگرد تعلیم و تربیت

^۱ توبہ ۱۲۲

^۲ عوالی اللئانی، ج ۱، ص ۲۹۲، ح ۱۹۳۔

حاصل کرنے میں کوتاہی کرے تو استاد کا حوصلہ پست نہیں ہونا چاہئے، اگر وہ تعلیم و تربیت میں ترقی کا مظاہرہ کرے تو اس کی ہمت افزائی کرنی چاہئے، اگر لاپرواہی کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کر کے اس میں شوق پیدا کرنا چاہئے اور شاگرد کے جذبات کو ہرگز اپنے طرز عمل سے مجروح نہ کرے۔

ماں باپ کے بارے میں انسان کا فریضہ

ماں باپ اپنے فرزند کی پیدائش کا ذریعہ اور اس کے ابتدائی مربی ہیں اس سبب سے دین مقدس اسلام میں سب سے اہم نصیحت و تاکید ماں باپ کی اطاعت اور احترام کے بارے میں کی گئی ہے، یہاں تک کہ خدائے متعال توحید کے ذکر کے بعد والدین کے ساتھ نیکی کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً) اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، جن روایتوں میں گناہان کبیرہ کو گنوا گیا ہے ان میں شرک کے بعد والدین کے ساتھ برے برتاؤ کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے خدائے متعال مذکورہ آیہ شریفہ کے ضمن میں بھی فرماتا ہے: (إنا ببلغن عندك أكبر احداها أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريماً* واخفض لهما جناح الذل من الرحمة... ۲۳) اور اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو خبردار ان سے اف بھی نہ کہنا اور جھڑکنا بھی نہیں اور ان سے ہمیشہ شریفانہ گفتگو کرتے رہنا، اور ان کے لئے خاکساری کے ساتھ اپنے کندھوں کو جھکا دینا۔“

چہ خوش گفت زالی بہ فرزند خویش چو دیدش پلنگ افکن و میل تن

گر از حمد خردیت یاد آمدی کہ بچارہ بودی در آغوش من

نہ کردی در این روز بر من جفا کہ تو شیر مردی و من پیر زن

”کیا خوب کہا ہے ایک بوڑھیا نے اپنے بیٹے سے جب اس کو ایک طاقتور شیر اور ہاتھی کے مانند دیکھا اگر تجھے وہ اپنا بچپن یاد آتا جب کہ تم میری آغوش میں ایک بچہ تھے تو آج تم مجھ پر یہ ظلم نہ کرتے کہ تم ایک شیر مرد بن چکے ہو اور میں ایک بوڑھی عورت ہوں۔“ دین مقدس اسلام میں ماں باپ کی اطاعت واجب کے ترک ہونے یا حرام میں مرتکب ہونے کے علاوہ، واجب ہے اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے ماں باپ کو رنج و تکلیف پہنچائی ہے وہ اپنی زندگی میں خوشبخت اور کامیاب و کامران نہیں ہوئے ہیں۔

بزرگوں کا احترام

بوڑھوں کا احترام بھی لازم ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ”: بوڑھوں کا احترام اور تعظیم کرنا خدا کی تعظیم اور احترام کرنا ہے“

اپنے رشتہ داروں کے بارے میں انسان کا فریضہ

انسان کے ماں باپ کے ذریعہ جو رشتہ دار نبی رابطہ رکھتے ہیں، وہ طبعی خاندان کو تشکیل دینے کا سبب بنتے ہیں اور خونی رشتہ اور انسانی خلیوں کے اشتراک کی وجہ سے انسان کو خاندان کا جز و قرار دیتے ہیں۔ اس طبعی اتحاد اور ارتباط کی وجہ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو صلہ رحم کا حکم دیا ہے اور قرآن مجید اور ائمہ دین کی روایتوں میں اس سلسلہ میں بہت ہی تاکید کی گئی ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا^۱) ”اور اس خدا سے بھی ڈرو جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابت داروں کی بے تعلقی سے بھی۔ اللہ سب کے اعمال کا نگراں ہے۔“ پیغمبر اکرم صلی

^۱ بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۱۳۶ ح ۲۔

^۲ نساء، ۱

اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”میں اپنی امت کو صلہء رحم کی نصیحت کرتا ہوں اور اگر رشتہ داروں کے درمیان ایک سال کی دوری کا فاصلہ ہو تو بھی اپنے رشتہ کے پیوند کو نہ توڑیں!“

ہمایوں کے بارے میں انسان کا فریضہ

چونکہ ہمایہ زندگی بسر کرنے کی جگہ پر ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے زیادہ رابطہ رکھتے ہیں اور گویا ایک بڑے خاندان کے حکم میں ہوتے ہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کا اچھا اور برا طرز عمل ہمایوں پر دوسروں کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ جورات کو اپنے گھر میں صبح ہونے تک شور و غل مچاتا ہے، وہ شر کے آخر میں رہنے والوں کو تکلیف نہیں پہنچاتا ہے، لیکن اپنے ہمایہ کے آرام و آسائش میں خلل ڈالتا ہے۔

جو مالدار اپنے خوب صورت محل میں عیش و عشرت میں زندگی گزار رہا ہے، دور رہنے والے مفلسوں کی نگاہوں سے دور ہے، لیکن ہر لمحہ اپنے ایک تنگ دست اور غریب ہمایہ کی جھونپڑی میں اگے ہوئے ایک پھول کے پودے کو آگ لگاتا ہے، تو یقیناً ایک دن ایسا آئے گا جب وہ اپنے کیفر کردار تک پہنچ جائے گا۔ اس لحاظ سے دین مقدس اسلام میں ہمایہ کے حالات کی رعایت کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”جبرئیل امین نے ہمایہ کے بارے میں اس قدر مجھے نصیحت کی کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ خدائے متعال ہمایہ کو وارثوں میں قرار دے گا“^۱، نیز فرمایا: ”جو شخص اپنے ہمایہ کو تکلیف پہنچائے گا، اس تک بہشت کی خوشبو نہیں پہنچے گی۔ جو اپنے ہمایوں کے حق کی رعایت نہیں کرے گا، وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو سیر ہوگا اور وہ جانتا ہو اس کا ہمایہ بھوکا ہے اور اسے کچھ نہ دے تو وہ مسلمان نہیں ہے“^۲۔

^۱ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۵۱۔

^۲ مستدرک الوسائل، ج ۸، ص ۴۲۷۔

^۳ سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۱۹۰۔

ماں تھیں اور بچاروں کے بارے میں انسان کا فریضہ

بینک معاشرے کی تشکیل لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہے اور ایک معاشرے کے افراد کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ محتاجوں اور بے چاروں کی دستگیری کریں اور جو لوگ اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، کسی نہ کسی طرح ان کی مدد کر کے ان کی مشکلات کو حل کرے۔ آج تو یہ مسئلہ واضح ہو چکا ہے کہ مالداروں کے مفلس و نادار افراد کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ایسا بڑا خطرہ لاحق ہے کہ جو معاشرے کو نابود کر سکتا ہے اور سب سے پہلے مالدار ہی اس خطرے کے شکار ہوں گے۔ اسلام نے اس خطرہ کے پیش نظر چودہ سو سال پہلے ہی حکم دیا ہے کہ مالداروں کو اپنی آمدنی کے ایک حصہ کو ہر سال کمزوروں اور حاجتمندوں میں تقسیم کرنا چاہئے اور اگر اس سے ان کی ضرورت پوری نہ ہو سکے تو مستحب ہے کہ غریبوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جتنا ممکن ہو سکے راہ خدا میں انفاق کریں۔

خدا نے تعالٰیٰ فرماتا ہے: (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ^۱) تم نیکی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں سے راہ خدا میں انفاق نہ کرو، لوگوں کی خدمت و مدد کے بارے میں نقل کی گئی حدیثیں بے شمار ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُم لِلنَّاسِ“^۲ ”لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کے لئے فائدہ مند ہو۔“ نیز فرماتے ہیں: ”قیامت کے دن خدا کے نزدیک اس شخص کا مقام سب سے بلند ہوگا جو خدا کے بندوں کی حاجت روائی کی راہ میں سب سے زیادہ اقدام کرے۔“^۳

در بلا یا رباش یا ران را تا کند فضل ایزدت یاری

بہ ہمہ حال بد روی روزی تخم نیکی کہ این زمان کاری

^۱ آل عمران ۹۲

^۲ نہج الفصاحہ، ج ۱۵۰، ص ۳۱۵۔

^۳ کنز العمال، ج ۶، ص ۵۹۵۔

معاشرے کے بارے میں انسان کا فریضہ

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کی مدد سے کام کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے کام و کوشش سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان افراد سے تشکیل پانے والا معاشرہ ایک بڑے انسان کے مانند ہے اور تمام افراد اس بڑے انسان کے اعضاء کے مانند ہیں۔ انسان کے بدن کا ہر عضو، اپنے مخصوص کام کو انجام دیتا ہے اور اپنے کام کے نفع کے علاوہ دوسرے اعضاء کے منافع سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے یعنی اپنی سرگرمی کی حالت میں اپنے نفع کو دوسرے اعضاء کے منافع کے ضمن میں حاصل کرتا ہے اور دوسروں کی زندگی کے سائے میں اپنی زندگی کو جاری رکھتا ہے۔ اگر سارے اعضاء خود غرض ہوتے اور دوسروں کے کام نہ آتے، مثلاً جہاں پر ہاتھ پاؤں اپنے کام میں مشغول ہیں، بالکل اپنی نگاہ سے ان کا تعاون نہ کرتی یا منہ غذا کو چبانے اور اس سے لذت حاصل کرنے پر اکتفا کرتا اور معدہ کی ضرورت کو پورا نہ کرتا یعنی کھانے کو نہ نگھلتا تو انسان بلا فاصلہ مر جاتا اور نتیجہ کے طور پر خود غرض و انحصار طلب اعضاء بھی مر جاتے۔

معاشرہ کے بارے میں معاشرے کے افراد کا فریضہ بھی ایک انسان کے بدن کے اعضاء کے مانند ہے۔ یعنی انسان کو اپنا منافع معاشرے کے منافع کے ضمن میں حاصل کرنا چاہئے اور اپنے کام و کوشش سے معاشرے کو فائدہ پہنچانے کا خیال ہونا چاہئے تاکہ اپنی محتوں سے بہرہ مند ہو سکے اور سبھی کو فائدہ پہنچائے تاکہ خود بھی بہرہ مند ہو سکے۔

تمام لوگوں کے حقوق سے دفاع کرے تاکہ خود اس کے حقوق نابود نہ ہوں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم اپنی خداداد فطرت سے سمجھتے ہیں اور دین مقدس اسلام بھی۔ جو فطرت و خلقت پر استوار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور حکم نہیں رکھتا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”مسلمان آپس میں بھائی بھائی میں اور اجنبیوں کے مقابلہ میں ایک دست ایک دل اور ایک جہت میں“^۱ مزید فرماتے ہیں: ”المسلم من سلم المسلمون من يده ولسانه“^۲ ”مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان امان

^۱ نہج الفصاحہ، ص ۶۲۵، ح ۳۰۸۱ و ۳۰۸۲۔
^۲ بحار الانوار ج ۷۷ ص ۵۳۔

میں رہیں،“ مزید فرماتے ہیں ”: من اصبح ولم یتم بامور المسلمین فلیس بمسلم“، ”جو مسلمانوں کے مسائل کو اہمیت نہ دے وہ مسلمان نہیں ہے۔“

اسی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ تبوک میں لشکر اسلام کو لے کر روم کی سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت تین افراد نے اس جنگ میں شرکت نہیں کی تھی۔

اسلامی لشکر کے جنگ سے واپس آنے پر جب یہ تینوں آدمی ان کے استقبال کے لئے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا، تو آنحضرت نے اپنے رخ کو موڑ لیا اور ان کے سلام کا جواب نہیں دیا اور اسی طرح مسلمانوں نے بھی ان سے اپنا منہ موڑ لیا، نتیجہ میں مدینہ منورہ میں کسی نے حتیٰ ان کی عورتوں نے بھی ان سے بات نہیں کی انہوں نے بے بس ہو کر مدینہ کے پہاڑوں میں پناہ لی اور توبہ واستغفار کیا۔ چند دنوں کے بعد خدائے متعال نے ان کی توبہ قبول کی پھر وہ شہر کے اندر آ گئے۔

عدالت

قرآن مجید اور ائمہ دین کی روایتوں کے مطابق عدالت کی دو قسمیں ہیں: انفرادی عدالت اور اجتماعی عدالت۔ عدالت کی یہ دونوں قسمیں دین مبین اسلام کی نظر میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

انفرادی عدالت

انفرادی عدالت سے مراد وہ عدالت ہے کہ انسان جھوٹ، غیبت اور دوسرے گناہان کبیرہ سے پرہیز کرے اور دوسرے گناہوں کو بار بار انجام نہ دے جس میں یہ صفت ہو، اسے عادل کہتے ہیں اور اسلام کے قوانین کے مطابق ایسا شخص حج، حاکم، تقلید

اور دیگر اجتماعی ذمہ داریوں کو سنبھال سکتا ہے۔ لیکن جس میں یہ دینی صفات موجود نہ ہوں وہ ان اختیارات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا ہے۔

اجتماعی عدالت

”اجتماعی عدالت“ سے مراد وہ عدالت ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کے بارے میں افراط و تفریط نہ کرے اور سب کو قانون الہی کے مقابلہ میں مساوی قرار دے اور اجتماعی عدالت کو نافذ کرنے میں دینی مقررات کے حق سے تجاوز نہ کرے، جذبات میں نہ آئے اور سیدھے راستہ سے منحرف نہ ہو۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (ان اللہ یا مر بالعدل^۱) بیشک اللہ عدل کا حکم دیتا ہے، ”بیشمار آیتوں اور روایتوں میں گفتار و کردار میں عدالت کے بارے میں حکم ہوا ہے اور خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں چند مواقع پر ظالموں پر صراحتاً لعنت بھیجی ہے۔

علم اخلاق میں ”عدالت“ سے مراد ملکات و صفات نفسانی میں میانہ روی ہے اور یہ صفت اس میں پائی جاتی ہے جو انفرادی و اجتماعی عدالت کی رعایت کرتا ہو۔ سچائی لوگوں کے درمیان آپس میں رابطہ، جو انسان کی اجتماعی بنیاد ہے، ”گفتگو“ سے برقرار ہوتی ہے۔ اس بنا پر سچ بات جو انسان کیلئے پوشیدہ حقیقت کو ظاہر کرتی ہے، اجتماع کے ضروری ارکان میں سے ایک ہے، اور اہم فائدے۔ جن سے اجتماع ہرگز بے نیاز نہیں ہے۔ سچ بات سے حاصل ہوتے ہیں۔ سچائی کے فوائد کو مندرجہ ذیل چند جملوں میں بیان کیا جاسکتا ہے: ۱۔ سچ بولنے والا، اپنے ہم جنسوں کے لئے قابل اعتماد ہوتا ہے اور ان کو اس کی ہر بات کے بارے میں تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۲۔ سچ بولنے والا، اپنے ضمیر کے مقابلہ میں سر بلند اور جھوٹ کے رنج سے آسودہ ہوتا ہے۔

۳۔ سچ بولنے والا اپنے عہد و پیمان کی وفا کرتا ہے اور جو امانت اسکے حوالہ کی جاتی ہے، اس میں خیانت نہیں کرتا ہے، کیونکہ رخسار میں سچائی، گفتار کی سچائی سے جدا نہیں ہے۔

۴۔ سچ بولنے سے، اکثر اختلافات اور لڑائی جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں، کیونکہ اکثر اختلافات اور جھگڑے اس لئے وجود میں آتے ہیں کہ ایک طرف یا دونوں طرف کے لوگ حق و حقیقت سے منکر ہوتے ہیں۔

۵۔ سچ بولنے سے، اخلاقی عیوب اور قانون کی خلاف ورزی کا ایک بڑا حصہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ اکثر لوگ اسی قسم کے کردار کو چھپانے کیلئے جھوٹ بولتے ہیں امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: حقیقی مسلمان وہ ہے جو سچ بولنے کو۔ خواہ اس کے نقصان میں ہو۔ جھوٹ بولنے پر ترجیح دیتا ہے چاہے وہ اس کے لئے مفید ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح وہ اندرونی سکون حاصل کرتا ہے۔^۱

جھوٹ

”جھوٹ“ اسلام میں گناہ کبیرہ ہے، جس کے لئے خدائے متعال کے کلام میں یقینی عذاب کا وعدہ دیا گیا ہے۔ جھوٹ صرف شرع میں ہی گناہ اور برا عمل نہیں ہے بلکہ عقل کی رو سے بھی اس کی برائی واضح ہے۔ یہ ناپسندیدہ عمل، معاشرے میں پھیلنے سے، تھوڑی ہی مدت میں لوگوں کے اجتماعی رابطہ یعنی اعتماد کو ختم کر دیتا ہے، اور اس قسم کے رابطہ کے ختم ہونے سے، لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ہوتا لہذا، انفرادی طور پر زندگی گزارتے ہیں، اگرچہ بظاہر اجتماعی صورت دکھائی دیتی ہے۔

جھوٹ کے نقصانات

سچ بولنے کے بارے میں مذکورہ بیان سے جھوٹ بولنے کے نقصانات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ بولنے والا انسانی معاشرے

^۱ نہج البلاغہ صالح، کلمات قصار نمبر ۴۵۸ دتھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔

کا نابکار دشمن ہوتا ہے اور اپنے جھوٹ سے جو ایک بڑا جرم ہے، معاشرے کو خراب کر ڈالتا ہے، کیونکہ جھوٹ نیشہ آور چیز کے مانند ہے جو معاشرے کی عقل و شعور کی طاقت کو نابود کر کے حقائق پر پردہ پوشی کرتا ہے یا شراب کے مانند ہے جو لوگوں کو مست کر کے عقل کی طاقت کو برے اور بھلے میں تمیز کرنے سے بیکار بنا دیتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے جھوٹ کو گناہانِ کبیرہ میں شمار کیا ہے اور جھوٹ بولنے والے کے لئے کسی قسم کی دینی شخصیت کا قائل نہیں ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”بین طائفے منافق میں، اگرچہ وہ نماز بھی پڑھیں اور روزہ بھی رکھیں، جھوٹ بولنے والا، اپنے وعدہ پر وفانہ کرنے والا اور امانت میں خیانت کرنے والا ہے۔“ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ”انسان جب ایمان کی لذت کو چکھ لیتا ہے، تو جھوٹ کو ترک کر دیتا ہے اگرچہ مذاق میں بھی ہو۔“

غیت و تہمت

دوسروں کی ”بدگوئی“ کرنا اور ان کی سرزنش کرنا، اگر سچ ہو تو ”غیت“ ہے اور اگر جھوٹ ہو تو ”تہمت“ ہے کبھی سے ”بہتان“، بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ پروردگار عالم نے انسان کو (پیغمبروں اور ائمہ اطہار کے علاوہ) معصوم خلق نہیں کیا ہے اور ہر شخص خود میں موجود نقائص کی وجہ سے خطا و لغزش سے محفوظ نہیں ہے اور عام لوگ اس پردہ کے پیچھے زندگی کرتے ہیں جسے اللہ نے اپنی حکمت سے ان کے اعمال پر کھینچا ہے۔

چنانچہ اگر ایک لمحہ کے لئے اس الہی پردے کو ان کے نقائص اور عیوب سے ہٹا دیا جائے تو سب ایک دوسرے سے متفہم ہو کر بھاگ جائیں گے، اور ان کے معاشرے کی عمارت زمین بوس ہو کر ویران ہو جائیگی۔ اس لئے خدائے متعال نے غیت کو حرام قرار دیا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے امان میں رہیں۔ اور ان کی زندگی کا ظاہری ماحول آراستہ ہو جائے تاکہ یہی ظاہری زیبائی

^۱ میزان الحکمہ، ج ۱۰، ص ۱۵۴۔
^۲ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۴۰، ح ۱۱۔

تدریجاً باطنی برائی کی اصلاح کرے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (وَلَا يَتَّبِعْ بِعَصْمِكَ بَعْضًا يَحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَكُلَ حِمْلًا يَتَنَا)۔ ”ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کرو کہ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟“ ”یہ تم، ہکا گناہ اور اس کی برائی غیبت سے زیادہ شدید ہے اور اس کی برائی عقل کی رو سے واضح ہے۔ خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں اس کی برائی اور ناجائز ہونے کو مسلم جانا ہے اور بلا چون و چرا ذکر فرماتا ہے: (أَنَّمَا يُفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ)۔ ”بیشک جو ایمان نہیں رکھتے میں وہ افترا کہتے ہیں“۔

لوگوں کی عزت پر تجاوز

اسلام میں عصمت درمی گناہان کیمیرہ میں سے ہے اور موقع کے فرق کے مطابق اس جرم کے لئے سخت سزائیں، جیسے کوڑے، سنگسار اور قتل وضع ہوئی ہیں۔ اس برے عمل کی راہ کا کھلا ہونا، اگرچہ طرفین کی رضامندی سے ہی ہونسلوں کو۔ جسے اسلام نے زیادہ اہمیت دی ہے، متزلزل کر کے رکھ دیتا ہے اور وراثت وغیرہ کے احکام کو معطل کر دیتا ہے اور آخر کار ماں باپ اور فرزند کے پیار کو بے اثر کر کے رکھ دیتا ہے اور معاشرے کے حقیقی ضامن زاد و ولد کی فطری دلچسپی کو نابود کر دیتا ہے۔

رشوت: کسی ایسے حکم یا کام کے انجام دینے کے لئے پیسے یا کوئی تحفہ لینا، جبکہ وہ کام پیسے یا تحفہ لینے والے کا فریضہ ہو، تو اس کو ”رشوت“ کہتے ہیں۔ اسلام میں ”رشوت“ گناہ کیمیرہ ہے اور اس کا مرتکب ہونے والا اجتماعی اور دینی فوائد (عدالت) سے محروم اور عذاب الہی کا مستحق ہوتا ہے۔ کتاب و سنت اس کے گواہ ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے اور ان کے درمیان واسطہ بننے والے، پر لعنت کی ہے۔^۱ چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں ”کسی کی حاجت پورا کر کے رشوت لینا خدا سے کفر کے برابر ہے“^۲، البتہ یہ سب سرزنش اور مذمت اس رشوت کے بارے میں

^۱ حجرات، ۱۲

^۲ نحلہ، ۱۰۵

^۳ سفینۃ البحاء، ج ۱، ص ۵۲۳۔

^۴ سفینۃ البحاء، ج ۱، ص ۵۲۳۔

ہے جو حق بجانب حکم اور عادلانہ عمل کے بارے میں لی جائے اور جو رشوت غیر حق بجانب حکم اور ظالمانہ عمل کے لئے لی جائے، اس کا گناہ بہت بڑا اور اس کی سزا شدید تر ہے۔

حسن معاشرت: انسان جو سماج میں زندگی بسر کرتا ہے، اس کے لئے لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ بیشک یہ مل جل کر رہنا اس لئے ہے تاکہ انسان اپنی انسانیت اجتماعی زندگی کا تحفظ کر سکے اور روز بروز اپنی مادی و معنوی ترقی میں اضافہ کرے اور زندگی کی مشکلات کو بہتر و آسان تر صورت میں حل کرے۔

لہذا، لوگوں سے ایسا برتاؤ کرنا چاہئے جو محبوبیت کا سبب بنے اور دن بدن انسان کے اجتماعی وزن کو بڑھاو دے اور اس کے دوستوں میں اضافہ ہو، کیونکہ اگر لوگ کسی سے مل کر سنگینی یا تنگی کا احساس کریں گے تو ان کے دلوں میں نفرت اور تنگی پیدا ہو جائے گی اور آخر کار ایک ایسا دن آئے گا جب سب لوگ اس سے دوری اختیار کریں گے اور ایسا شخص معاشرے میں منفر و مبغوض ہو جائے گا اور اس کو سماج میں ہونے کے باوجود تنہائی کی حالت میں اور اپنے وطن میں ہوتے ہوئے بھی غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑے گی اور یہ حالت انسان کی بد بختی کا تلخ و تاریک ترین نمونہ ہے۔ اس لئے دین مقدس اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے حسن معاشرت کی نصیحت و تاکید کی ہے اور اس کے بارے میں بہترین آداب و رسوم بیان فرمائے ہیں۔

مبجلہ حکم دیا ہے کہ مسلمانوں کو ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کرنا چاہئے اور فضیلت اس کے لئے ہے جو سلام کرنے میں سبقت حاصل کرے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلام کرنے میں پہل کرتے تھے حتیٰ عورتوں اور بچوں کو بھی سلام کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص آپ کو سلام کرتا تو آپ کا بہترین جواب دیتے تھے۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: (واذا حیتتم بخیوا با حسن منها اور ڈوبا) ”جب تم لوگوں کو سلام کیا جائے، تو تم اس سے بہتر یا ویسا ہی جواب دو“، مزید حکم دیا ہے کہ انسان لوگوں سے ملنے وقت تواضع اور انکساری سے پیش آئے اور ہر ایک کا اسکی اجتماعی حیثیت کے مطابق احترام کرے۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے

:(وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَتُوبُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا) ”اور اللہ کے بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستہ فروتنی اور انکساری سے چلتے ہیں۔“ قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ تواضع اور انکساری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان خود کو لوگوں کے سامنے ذلیل و خوار کرے اور اپنی انسانیت کو نقصان پہنچائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی قدروں و منزلت اور فخر و مباہات کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرے اور دوسرے عظیم فخر و مباہات کو خود سے مخصوص نہ کرے اور لوگوں کو حقیر و ناچیز نہ سمجھے۔

اسی طرح لوگوں کے احترام کا معنی یہ ہیں کہ لوگوں کا اس حد تک احترام کرے کہ چاہلوسی نہ ہو بلکہ ہر ایک کا اس کی دینی و اجتماعی قدروں و منزلت کی حد میں احترام کرے، بزرگوں کا ان کی بزرگی کے مطابق احترام کرے اور دوسروں کا بھی ان کی انسانیت کے مطابق احترام کرے۔ نیز احترام و اکرام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کسی سے کوئی ناٹائے کام سرزد ہوتے دیکھے تو آنکھیں بند کر کے گزر جائے یا ایک ایسی محفل میں جہاں پر اہل محفل انسانی شرافت کے خلاف کام انجام دیتے ہوں یا کوئی خلاف شرع عمل انجام دیتے ہوں تو رسوائی سے ڈر کر ان کے ساتھ ہم رنگ و جماعت ہو جائے۔ لوگوں کا احترام حقیقت میں انسانی شرافت اور ان کی دینی قدروں کا احترام ہے نہ کہ ان کے جسم اور اعضاء کا احترام۔ اگر کوئی شخص اپنی انسانی شرافت اور دینی ترجیحات کو نابود کر دے تو کوئی دلیل نہیں بنتی کہ اس کا احترام کیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: دوسروں کی اطاعت کے ذریعہ خدا کی معصیت انجام نہیں دینا چاہئے۔^۱

نیکوں کی مصاحبت

اس کے باوجود کہ انسان بہت سے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے، مگر وہ زندگی کے تقاضے کے مطابق مجبور ہے کہ کچھ لوگوں کے ساتھ دوسروں کی نسبت زیادہ مل جل کر رہے یہ وہ لوگ ہیں جو ”دوست“ کے نام مشہور ہیں۔ البتہ اس دوستی کا سبب اخلاق، روش، اور پیشہ وغیرہ میں ایک قسم کی یکسانیت ہے جو دو یا چند افراد کے درمیان پائی جاتی ہے اور چونکہ وابستگی اور مصاحبت

^۱ فرقانہ ۶۳

^۲ وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۴۲۲۔

کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ دو ہم نشین افراد کے عادات و اخلاق ایک دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں، لہذا انسان کو نیک انسانوں کی دوستی اختیار کرنی چاہئے، کیونکہ اس صورت میں ان کے نیک اخلاق اس میں سرایت کریں گے اس کی بے لوث اور خیر خواہانہ دوستی سے استفادہ کرے گا اور اس کی دوستی کی پابنداری سے مطمئن رہے گا۔ اس کے علاوہ لوگوں کی نظروں میں اس کی اجتماعی حیثیت بھی بڑھ جائے گی۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ”خیر الاصحاب من یدلک علی الخیر“، ”بہترین دوست وہ ہے جو تجھے نیک کام کی طرف راہنمائی کرے۔“ مزید فرماتا ہے: ”المرء یوزن بخلیلہ“، ”مرد اپنے دوست کے ذریعہ تولد جاتا ہے“، ”تو اول بگو باچہ کس زبانی کہ تا من بگویم کہ تو کیستی ہاں قیمت آشنایان تو بود قیمت و ارزش جان تو تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم کس کے ہم نشین ہوتا کہ میں بتا سکوں کہ تم کون ہو تیری قدر و قیمت بھی وہی ہوگی جو تیرے دوست کی ہے۔“

بروں کی مصاحبت: بروں اور گنہگاروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بد بختی اور برے انجام کا سبب بنتا ہے۔ اس مطلب کی وضاحت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر ہم مجرموں اور بد کرداروں جیسے چوروں اور ڈاکوؤں سے ان کے انحراف و گمراہی کے سبب کے بارے میں پوچھیں تو وہ کسی شک و شبہ کے بغیر جواب دیں گے کہ برے لوگوں کی مصاحبت اور معاشرت نے ہمیں اس مصیبت میں گرفتار کیا ہے۔ ہزاروں بد کرداروں میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا کی جس نے خود بخود ناشائستہ راستہ کو انتخاب کیا ہو۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ”بروں کی ہم نشینی سے پرہیز کرو، کیونکہ برادر دوست تم کو اپنے جیسا بنادے گا، اور وہ تمہارے جیسا نہیں بنے گا“، ”مزید فرماتے ہیں: ”ایاک و مصادقہ الفاجر فانہ یشیع مصادقہ بالتافہ“، ”بد کردار کی دوستی سے

^۱ میزان الحکمة، ج ۲، ص ۳۲۷۔
^۲ شرح غرر الحکم، ج ۲، ص ۲۸۹۔
^۳ غرر الحکم، ج ۱۰۷، ص ۱۵۹۔

پر ہیز کرو کیونکہ وہ تم کو معمولی چیز کے مقابلہ میں بچ دے گا،“ بابدان کم نشین کہ درمانی خودی راست نفس انسانی ” بروں کی ہم نشینی کم اختیار کرو، کیونکہ انسان دوسروں کی عادت کو قبول کرنے والا ہوتا ہے،“

ماں باپ پر اولاد کے حقوق

انسان کو جو کام انجام دینا چاہئے جس کے بارے میں انجام دیتا ہو اور اس کو اس کا نفع ملتا ہو تو اسے ”حق“ کہتے ہیں اور جس کے لئے اسے انجام دینا چاہئے اسے ”فریضہ، حکم اور تکلیف“ کہتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی کے لئے اجرت پر کوئی کام انجام دیتا ہے، تو اجرت ادا کرنا صاحب کار کا فرض ہے اور مزدور کا حق ہے۔ اگر صاحب کار نے اجرت ادا نہ کی تو مزدور اس سے مطالبہ کر سکتا ہے اور اپنے حق کا دفاع کر سکتا ہے، کیونکہ انسان اس طرح خلق کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں اس کی زندگی ابدی نہیں ہے اور خواہ نخواہ کچھ مدت کے بعد، رخت سفر باندھتا ہے، خدائے تعالیٰ نے انسان کی نسل کو نابودی سے بچانے کے لئے تناسل و تولید کی روش کو قرار دیا ہے اور انسان کو تناسل کے وسائل مہیا کئے ہیں اور اس کے باطنی جذبات کو اس کام کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اسی کل آمدگی کا نتیجہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنی اولاد کو اپنے بدن کا ٹکڑا سمجھتا ہے اور اس کی بقا کو اپنی بقا جانتا ہے اور اس کی آسائش و کامیابی کی راہ میں ہر قسم کی تلاش و کوشش کرتا ہے اور گوناگوں رنج و الم برداشت کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کی ذات یا شخصیت کی نابودی کو اپنی ذات یا شخصیت کی نابودی جانتا ہے۔

حقیقت میں وہ خالق کائنات کے حکم کی تعمیل کرتا ہے جو بشر کی بقا چاہتا ہے۔ لہذا ماں باپ کا فرض ہے کہ جس حکم میں ضمیر و شرع متفق ہیں اس کو اپنے فرزند کے بارے میں نافذ کریں اور اس کی اچھی پرورش کریں تاکہ وہ ایک شائستہ انسان بن جائے، اس کے لئے اسی چیز کا انتخاب کریں جس کو انسانیت کی نگاہ میں اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں پر ہم ان میں سے بعض حقوق کو بیان کرتے ہیں: ۱۔ پہلے ہی دن سے جب بچہ بات یا اشارہ کو سمجھنے لگے، اس کے ضمیر میں پسندیدہ اخلاق اور شائستہ صفات کی بنیاد ڈال کر انہیں مستحکم کریں اور حتی الامکان اسے یہودہ باتوں کے ذریعہ نہ ڈرائیں اور اسے برے اور غفلت کے خلاف کاموں سے

روکیں اور خود بھی اس کے سامنے جھوٹ بولنے، گالیاں دینے اور برے الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کریں اور اس کے سامنے پسندیدہ کام انجام دیں تاکہ شریف اور عالی مزاج بن جائے اور اپنی طرف سے بخیدگی، ہمت اور عدالت کا مظاہرہ کریں تاکہ ان کی عدالت دوستی اور انسان پروری ”انتقال اخلاق“ کے قانون کے تحت اس میں منتقل ہو جائے اور زیادتی، حوصلہ شکنی اور خود پرستی سے محفوظ رہے۔

۲۔ جب تک میسر نہ ہو جائے کھانے پینے، سونے اور اس کی دوسری ضرورتوں میں اس کا خیال رکھیں اور اس کے جسمی حفظان صحت کی رعایت کریں تاکہ وہ ایک سالم بدن اور قوی دماغ اور اچھا مزاج والا بن کر تعلیم و تربیت کے لئے آمادہ ہو جائے۔

۳۔ جب بچہ میں تعلیم و تربیت کی استعداد پیدا ہو جائے (عام طور پر یہ مرحلہ سات سال کی عمر میں آتا ہے) اسے معلم کے حوالہ کریں اور کوشش کریں کہ ایک شائستہ معلم کی تربیت میں رہے تاکہ جو کچھ اس سے سنے اس کا اس پر اچھا اثر پڑے اور وہ اس کے روح کی شرافت، تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کا سبب بنے۔

۴۔ جب بچے کی عمر اتنی ہو جائے کہ وہ عام پروگراموں یا خاندانی نشست و برخاست میں شرکت کر سکتا ہو، تو اسے اجتماعی رسومات سے آشنا کرنے کے لئے اپنے ساتھ پروگراموں میں لے جانا چاہئے اور پسندیدہ معاشرتوں کے طرز عمل سے اسے آگاہ کرنا چاہئے۔

اولاد پر ماں باپ کے حقوق

وہ آواز جو ضمیر اور شرع کے منادی کی طرف سے ماں باپ کے کانوں میں پہنچی اور انہیں اولاد کے بارے میں ذمہ دار بنادیا، اسی طرح ضمیر اور شرع کی آواز نے اولاد کو بھی متوجہ کیا اور اس پر فرض کر دیا کہ اپنے ماں باپ کی نیکیوں کا۔ ہاتھ، زبان یا ہر وسیلہ سے۔ شکریہ بجالائے۔ ماں باپ وہ ہیں جو خدا کے ارادہ سے اپنے فرزند کو وجود میں لائے ہیں اور اپنے آرام و سکون اس کے معنوی اور جہانی آرام و سکون پر قربان کر کے ایک عمر راتوں کو جاگ کر اور دن میں رنج و غم برداشت کر کے اسے ایک قوی انسان

بناتے ہیں۔ کتنی نامردی، پتی اور نمک حرامی ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کو اذیت پہنچائے یا ان کے بوڑھا پے اور ناتوانی کے دنوں میں ان کی مدد نہ کرے!! خدا کی توحید، جو انسان کا پہلا فریضہ ہے، کے بعد دوسرا فریضہ جو اسلام نے انسان کے لئے معین کیا ہے، وہ ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ ہے: (وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً...) ”اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا“۔ اسلام میں مقرر شدہ فیضے کے مطابق، فرزند کو کسی صورت میں یہ حق نہیں ہے کہ اپنے ماں باپ کو ذلیل و خوار سمجھے اور ایک ایسا کام انجام دے جو ان کی رنجیدگی کا سبب بنے، اسے ہمیشہ اپنے ماں باپ کا احترام کرنا چاہئے اور ان کی نسبت فروتنی اور انکاری اور احسان و نیکی کے ساتھ پیش آنا چاہئے، خاص کر ان کی ضرورت کے وقت ان کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ لیکن جانتا چاہئے کہ ماں باپ کی مرضی کی رعایت کرنا صرف مستحب اور مباح کاموں میں ہے، واجبات میں ان کی مرضی کے مطابق انجام دینا لازم نہیں ہے۔

بھائیوں اور بہنوں کے باہمی حقوق

قرآن مجید میں، رشتہ داروں کے بارے میں بارہا تاکید کی گئی ہے اور قطع رابطہ سے منع کیا گیا ہے۔ ماں باپ اور اولاد کے بعد انسان کے قریبی ترین رشتہ دار بھائی اور بہن ہیں اور ان کے درمیان اجتماعی رابطہ فطری ہے اور یہ رابطہ تمام رابطوں سے مستحکم اور بنیادی تر ہے۔ بھائی بہنوں کا فریضہ ہے کہ ضرورت پر رشتہ کے ناطوں کو نہ توڑیں اور آپس میں تعاون کر کے حتی الامکان ایک دوسرے کی مدد کریں اور ضرورت پر ایک دوسرے کی دستگیری کریں۔ بڑے، چھوٹوں کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی سے پیش آئیں اور چھوٹے بھی بڑوں کا احترام کریں۔

عاق والدین: خاندانی اجتماع میں اولاد کی ماں باپ سے وہی نسبت ہے جو ایک درخت میں شاخوں کی جڑ سے ہوئی ہے، چونکہ جس طرح درخت کی شاخوں کا وجود جڑ پر منحصر ہوتا ہے، اسی طرح فرزند کی زندگی بنیاد ڈالنے والے اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ چنانچہ

انسانی معاشرہ والدین اور اولاد کے دو گروہ سے تشکیل پاتا ہے، اسلئے معاشرے کی اصلی بنیاد والدین ہی میں۔ ماں باپ کے ساتھ برا سلوک کرنا اور انھیں اذیت و آزار پہنچانا، نیک حرامی اور نامردی کے علاوہ انسانیت کے انحطاط اور معاشرے کی نابودی کا سبب بنتا ہے۔ کیوں کہ اولاد کی طرف سے ماں باپ کی بے احترامی ماں باپ کی طرف سے بھی عدم محبت اور بے توجہی کی صورت میں ظاہر ہوگی اور دوسرے یہ کہ جو اولاد اپنے ماں باپ کو ذلیل و خوار اور پست نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اپنی اولاد سے اپنے سے زیادہ توقع نہیں رکھیں گے اور اپنے بوڑھا پے اور ناتوانی کے دنوں میں ان کی طرف سے دستگیری اور مدد کی کوئی امید نہیں رکھیں گے اور اس طرح لامحالہ خاندان کی تشکیل سرد مہری کا شکار ہوگی جیسا کہ آج کل بہت سے نوجوانوں میں ایسی حالت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس طرز فکر کا عام ہونا قطعی طور پر تناسل اور توالد کی راہ کو مدد کرتا ہے، کیونکہ کوئی عقل مند اپنی گراں بہا عمر کو ایک ایسے پودے کی پرورش میں صرف نہیں کرتا جس کا نہ وہ پھل کھا سکے گا اور نہ اس کے سایہ میں بیٹھ سکے گا اور نہ اس کو دیکھنے میں غم و اندوہ کے علاوہ اسے کوئی فائدہ ہوگا۔ ممکن ہے ہم تصور کریں کہ حکومت مختلف انعامات سے لوگوں کو خاندان کی تشکیل میں تشویق کرے اور اس طرح تناسل و توالد کا مسئلہ حل ہو جائے، لیکن یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اجتماعی رسومات میں سے اگر کوئی بھی طریقہ اور رسم فطری پشت پناہی (جیسے ماں باپ اور اولاد کے جذبات) نہ رکھتی ہو تو وہ پائدار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فطری جبلتوں میں سے کسی ایک جبلت کو چھوڑنا انسان کو ممنوعی لذتوں سے محروم کرتا ہے۔

عزت نفس اور کامیابی

یہ بات مسلم اور یقینی ہے کہ ہر معاشرے میں بے چارے اور نادار مدد اور دستگیری کے مستحق ہوتے ہیں۔ سرمایہ داروں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں اور ان کے اس مسلم حق کو پامال نہ کریں اور شرع مقدس میں اسلام نے بھی اس حق کی رعایت کے سلسلہ میں تاکید و نصیحت کی ہے، اور دو ملتندوں پر ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ ناداروں اور بچاروں کی مدد کریں۔ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود کو نیکی کرنے والا، بخشش و عطا کرنے والا اور معاف کرنے والا کہا ہے، اور اپنے بندوں کو یہ پسندیدہ صفیتیں پیدا کرنے کی

ترغیب و تشویق فرماتا ہے۔ ”خدا ئے متعال نیک کام انجام دینے والوں کے ساتھ ہے۔“^۱ نیز فرماتا ہے ”: جس چیز کو انفاق کرتے ہو وہ خود تمہارے فائدے میں ہے۔“^۲ دوسری جگہ پر فرماتا ہے ”: جو کچھ انفاق کرتے ہو وہ تمہیں پلٹا دیا جاتا ہے اور تم نے کسی قسم کا نقصان نہیں اٹھایا ہے۔“^۳

احسان اور محتاجوں کی مدد

اجتماعی حالات اور احسان کے فوائد کے بارے میں غور و فکر اور مطالعہ ان آیات کے مضمون کو واضح کر دیتا ہے، کیونکہ حقیقت میں تمام اجتماعی توانائیاں سارے افراد کے لئے کام کرتی ہیں اور جس معاشرے میں کچھ غریب و نادار ضرورت کی دستی کی وجہ سے کام اور کوشش سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں تو ان کی تعداد کے اعتبار سے مال و ثروت کی پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس کے نامطلوب نتائج تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دولت مند دوسروں سے زیادہ بچارے ہو جاتے ہیں، لیکن اگر مالدار اپنی نیکی اور بخشش سے ناداروں کی دستگیری کریں تو ان کے حق میں بہت اچھے نتائج نکلتے ہیں کہ من جملہ ان کے:

- ۱۔ اس کام سے دوسروں کے دلوں میں اپنے بارے میں محبت پیدا کرتے ہیں اور ایک گروہ کو اپنا عاشق بناتے ہیں۔

۲۔ ایک ناچیز مال سے اپنے لئے زیادہ احترام حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ تمام لوگوں کی پشت پناہی کو اپنے لئے حاصل کرتے ہیں، کیونکہ لوگ نیکی کرنے والے کی طرف داری کرتے ہیں۔

۴۔ اس دن کے خطرے سے محفوظ رہتے ہیں کہ جس دن تمام ناداروں کی ناراضگی جمع ہو کر ہر خشک و تر کو بہا دے گی۔

^۱ عنکیوت، ۶۹۔

^۲ بقرہ، ۲۷۲۔

^۳ انفال، ۶۰۔

۵۔ وہی ناچیز مال جو اتفاق کیا ہے، اقتصاد کا پیہ حرکت میں آنے کا سبب بنتا ہے اور معاشرے کے مال میں اضافہ ہو کر خود ان کی طرف پلٹتا ہے۔ خدا کی راہ میں اتفاق کرنے کی فضیلت اور اسکی طرف ترغیب اور توثیق کرنے کے بارے میں بہت سی آیات و روایات موجود ہیں۔

تعاون: احسان و نیکی کا مسئلہ جو بیان ہو چکا، تعاون کے مختلف شعبوں میں سے ایک ہے جو انسانی معاشرے کی بنیاد ہے، کیونکہ سماج کی حقیقتہً افراد کا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ہے تاکہ ایک دوسرے کی مدد سے بھی کام ٹھیک ہو جائے اور بھی کی زندگی مستحکم اور بھی کی ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ لیکن یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ دین مقدس اسلام نے نیکی کو صرف مال کی صورت میں چاہا ہے بلکہ ہر بچارے کی دستگیری، اگر مال کی ضرورت بھی نہ ہو، دین مقدس اسلام کا مقصد ہے اور انسانی ضمیر کا مطلوب بھی ہے۔ ایک جاہل کو علم سکھانا، ایک اندھے کا ہاتھ پکڑنا، ایک گمراہ کی راہنمائی کرنا اور گرے ہوئے کی مدد کرنا وغیرہ سب احسان اور نیکی کے مصادیق اور اس تعاون میں سے ہیں کہ ہم نے اجتماع کو تشکیل دینے کے پہلے دن اس کے اعتبار کی تصدیق اور تائید کی ہے اور واضح ہے کہ اگر انسان بعض جزئی کام انجام نہ دے تو وہ بنیادی کام بھی انجام نہیں دے گا، اگر غیر اہم اور جزئی فرائض کی رعایت نہ کرے، تو وہ مکی اور اہم فرائض کو بھی انجام نہیں دے گا۔

خیرات اور نیکیوں کی طرف بقت کرنا

نیک کام کا پسندیدہ ہونا ان نتائج کی بنا پر ہے جو اس سے حاصل ہوتے ہیں البتہ جس قدر یہ نتائج و آثار عوامی تر اور پائندہ تر ہوں، اسی قدر نیکی بھی پسندیدہ تر و عالی تر ہوگی، ایک بیمار کا علاج کرنا نیک کام اور احسان ہے، لیکن ایک ہسپتال کو تعمیر کرنا اور اسے چالو کرنا جس میں روزانہ سیکڑوں بیماروں کا علاج کیا جائے، اس کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے۔ ایک طالب علم کی تعلیم پسندیدہ ہے، لیکن ایک ادارہ کی تائیس کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے جس میں سالانہ سیکڑوں دانشور علم حاصل کر کے فارغ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام اوقاف اور عوامی سطح کے خیرات و نیکیاں احسان و نیکیوں کے عالی مراتب شمار ہوتے ہیں۔ شرع کی زبان میں ان عمومی خیرات

کو ”صدقہ جاریہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”مرد کی سر بلندی کا سبب دو چیزیں ہیں ایک فرزند صالح اور دوسرے صدقہ جاریہ“ چنانچہ کتاب و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ”صدقہ جاریہ“ باقی رہتا ہے خدائے متعال صدقہ دینے والے کے نام ثواب لکھتا ہے۔

یتیم کا مال کھانا

جس طرح لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا عقلاً و شرعاً پسندیدہ ہے اسی طرح خدا کے بندوں کے ساتھ بُرائی کرنا ناروا اور قابلِ مذمت کام ہے لیکن شرع مقدس اسلام میں ظلم کے چند مواقع کی شدت کے ساتھ نبی کی گئی ہے کہ ان میں سے ایک ”مال یتیم میں تفریط“ ہے۔ اسلام نے یتیم کا مال کھانے کو گناہانِ کبیرہ میں شمار کیا ہے اور قرآن مجید میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جو یتیم کا مال کھاتا ہے، حقیقت میں وہ آگ کھاتا ہے اور اسے جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

چنانچہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر تاکید کا سبب یہ ہے کہ اگر کسی بوڑھے انسان سے ظلم کیا جائے تو ممکن ہے وہ مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کر اپنے حق کا دفاع کرے گا، لیکن کم عمر یتیم اپنے حق کا دفاع کرنے سے عاجز ہے۔ کسی کو قتل کرنا ظلم کا ایک اور مقام جسے شرع مقدس اسلام میں بہت ناپسند و قابلِ مذمت سمجھا گیا ہے وہ ”قتل نفس اور بے گناہ کو قتل کرنا“ ہے۔ قتل نفس گناہانِ کبیرہ میں سے ہے اور خدائے متعال نے اپنے کلام میں، ایک انسان کو قتل کرنا پوری انسانیت کو قتل کرنے کے برابر جانا ہے، یہ اس لئے ہے کہ انسان کو قتل کرنے والا انسانیت کے ساتھ سروکار رکھتا ہے اور انسانیت ایک آدمی اور ہزار آدمی میں یکساں ہے۔

رحمتِ خدا سے مایوسی: اسلام میں ایک خطرناک ترین گناہ ”خدا کی رحمت سے مایوسی ہے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: (قل یٰٰعبادی الذین اسرفوا علی انفسکم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ ہو الغفور الرحیم)“ پیغمبر! آپ پیغام پہنچا دیجئے کہ اے

میرے بند و انہوں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا اللہ تمام گناہوں کا معاف کرنے والا ہے اور وہ یقیناً زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔“ ایک دوسری جگہ پر رحمت خدا سے مایوس شخص کو قرآن کافر جانتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کی رحمت اور بخشش سے مایوس ہوا، تو پھر اس کے پاس باطنی طور پر تحریک کرنے والا محرک نہیں ہے کہ اچھے اور پسندیدہ کام انجام دے یا گناہان کبیرہ و صغیرہ اور برے کردار سے اجتناب کرے، کیونکہ ان دونوں چیزوں میں اصلی محرک عذاب خدا سے بچنے کے لئے ”رحمت و نجات کی امید“ ہے۔ اور چونکہ یہ امید اس شخص میں نہیں پائی جاتی ہے لہذا یہ شخص اس کافر سے کسی قسم کا فرق نہیں رکھتا ہے جو کسی دین کا پابند نہیں ہے۔

جہاد اور دفاع سے فرار کی سزا

میدان جنگ سے بھاگنے اور دشمن کو پیٹھ دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ، بھاگنے والا، اپنی جان کو معاشرے کی زندگی سے زیادہ قیمتی جانتا ہے اور حقیقت میں یہ دشمن کے سامنے دینی مقدمات اور معاشرے کی جان و مال کو پیش کرنے کے مترادف ہے جو اس کی زندگی کی حیثیتوں کو دھمکتا ہے۔ اسی لئے جہاد اور دفاع سے بھاگنے کو گناہان کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے اور خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (وَمَنْ يُولَمْ يَوْمَئِذٍ دَبْرَهُ الْأَمْتَرُ فَاَلْقَتْ أَلَمُ تَحْزِينِ إِلَى فَاءِ تَفْقَدِ بَاءِ بَغْضَبِ مِنَ اللَّهِ وَمَاؤُهُ جَهَنَّمَ...) ”اور جو آج کے دن پیٹھ دکھائیگا وہ غضب الہی کا حقدار ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا علاوہ ان لوگوں کے جو جنگی حکمت عملی کی بنا پر پیچھے ہٹ جائیں یا کسی دوسرے گروہ کی پناہ لینے کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دیں۔“

وطن کا دفاع: مذکورہ بیانات کے پیش نظر اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کے گھر بار کا دفاع اہم ترین واجبات میں سے ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ۚ) ”اور جو لوگ راہ خدا میں قتل ہو جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے“ اسلام کی ابتداء میں جان ہتھیلی پر لے کر خونین جنگوں میں

شرکت کرنے والے مجاہدوں اور اپنے پاک خون میں غلطاں ہونے والے شہیدوں کے بارے میں انتہائی حیرت انگیز اور عبرتناک داستانیں موجود ہیں یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے پاک خون اور ٹکڑے ٹکڑے ہوئے بدن سے اس دین مقدس اسلام کو مستحکم بنایا ہے۔

حق کا دفاع: ایک دوسرا دفاع جو آب و خاک کے دفاع سے عمیق تر اور وسیع تر ہوتا ہے، وہ حق کا دفاع ہے۔ یہ دین اسلام کا تہما مقصد ہے۔ اس خدائی روش کا بنیادی مقصد حق و حقیقت کو زندہ کرنا ہے، اسی لئے اس دین پاک کو ”دین حق“ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ دین جو حق کی طرف سے ہے، حق کے سوا کچھ نہیں ہے اور حق کے علاوہ کسی چیز کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتا ہے۔ خدائے متعال اپنی کتاب کی توصیف میں جو تمام حقائق کی جامع کتاب ہے فرماتا ہے: (”یہ دینی الی الحق والی طریق مستقیم“)۔ ”قرآن مجید را ہمنائی کرتا ہے حق کی طرف اور سیدھے راستہ کی طرف جس میں کسی قسم کا تناقض اور تضاد نہیں پایا جاسکتا ہے“^۱ سوائے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ حق کی پیروی کرے اور حق بات کہے حق سنے اور اپنی تمام توانائیوں اور ہر ممکن راہ سے حق کا دفاع کرے۔

غیظ و غضب: غیظ و غضب ایک ایسی حالت ہے کہ اگر انسان میں پیدا ہو جائے تو اسے انتقام کی فکر میں ڈالتی ہے اور اس کے باطنی آرام کو انتقام لینے کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ اگر انسان اس حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے سلسلہ میں تھوڑی سی سستی اور کوتاہی کرے تو بلافاصلہ اس کی عقل سلیم غیظ و غضب کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے اور ہر برائی اور ناروا و ناشائستہ چیز اسے صحیح نظر آتی ہے اور وہ اس حد تک پہنچتا ہے کہ انتقامی جذبہ کی وجہ سے ہر درندہ سے بڑا درندہ و اور ہر آگ سے زیادہ شعلہ ور ہوتا ہے۔ اسلام میں انتقام لینے کے سیلاب کو روکنے کے لئے بہت ہی تاکید ہوئی ہے اور اس کی پیروی کرنے کی زبردست مذمت کی گئی ہے۔ خدائے متعال ان لوگوں پر بہت عنایت کرتا ہے اور انہیں عفو کرتا ہے جو اپنے غیظ و غضب پر قابو پاتے ہیں اور غصہ کی حالت میں بردباری سے کام لیتے ہیں۔ فرماتا ہے: (”والکافرین الغیظ والعافین عن الناس“)۔ ”اور غصہ کو پی جاتے

^۱ احقافہ ۳۰

^۲ آل عمران/۱۳۴

میں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔“ (و اذا ما غضبوا هم یغفرون...^۱) اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کرتے ہیں۔“ کام کا واجب ہونا اور صنعت و حرفت کی اہمیت کام اور سرگرمی، وہ بنیادیں ہیں جن پر نظام خلقت استوار ہے اور یہ ہر مخلوق کی بقاء کے ضامن ہیں۔ خدائے متعال نے اپنی مخلوقات میں سے ہر ایک کو اس کے حالات کے مطابق کچھ وسائل سے مسلح کیا ہے کہ ان سے استفادہ کرنے پر وہ منفع کو حاصل کرتا ہے اور نقصانات سے بچتا ہے۔ انسان خدا کی مخلوقات میں حیرت انگیز ترین اور پیچیدہ ترین مخلوق ہے، دوسری مخلوقات کی نسبت اس کی حاجتیں زیادہ ہیں اور لہذا زیادہ سرگرمی کی ضرورت ہے تاکہ اس کے ذریعہ اپنی بے شمار ضرورتوں کو پورا کر سکے اور اپنے خاندانی نظام جسے فطرتاً تشکیل دینا چاہئے کو بھی برقرار کر سکے۔ اسلام چونکہ ایک فطری اور اجتماعی دین ہے، لہذا اس نے کار و کسب کو واجب قرار دیا ہے اور بیکار انسانوں کی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔

اسلام میں ہر فرد کو اپنے سلیقہ اور شوق کے مطابق صنعت و حرفت جس کی طرف خدائے متعال نے انسانی فکر کی ہدایت کی ہے ان میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا چاہئے اور اس طریقہ سے اپنی روزی کمائے اور معاشرے کی ذمہ داریوں میں سے کسی ایک کو اپنے ذمہ لے لے اور لوگوں کی آسودگی کے بارے میں کوشش کرے۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (وان یس للانسان الا ما سعی)^۲ اور یہ

کہ انسان کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہے، مگر یہ کہ سعی و کوشش کرے۔“

بیکاری کے نقصانات

مذکورہ بیانات سے واضح ہوا کہ کار و کوشش ایک راستہ ہے جسے خالق کائنات نے انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے تاکہ اسے طے کر کے اپنی زندگی کی سعادت کو پاسکے، البتہ خلقت و فطرت کی راہ سے انحراف چاہے کم ہی کیوں نہ ہو انسان کے لئے نقصان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ اس صورت میں جس چیز پر نظام زندگی استوار ہے، اس سے انحراف کرنے میں دنیا و آخرت کی بد بختی کے

^۱ شوریٰ/۳۷

^۲ نجم، ۳۹

علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اسی لئے ساتویں امام حضرت موسیٰ بن جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں ”: کام میں سستی اور تھکاوٹ کا اظہار نہ کرنا ورنہ دنیا و آخرت تیرے ہاتھ سے چلی جائیگی۔“

خود اعتمادی: عقائد کے باب میں بارہا یاد دہانی کرائی گئی کہ اسلام کا عام پروگرام یہ ہے کہ انسان خدائے یکتا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرے اور خالق کائنات کے علاوہ کسی کے سامنے سر تعظیم خم نہ کرے۔ سب خدا کی مخلوق اور اس کی پرورش یافتہ ہیں اور اس کا رزق کھاتے ہیں اور کسی کو کسی پر فضیلت کا حق نہیں ہے، سوائے اس چیز کے جو خدا کی طرف ملے۔

ہر مسلمان کو اپنے نفس پر اعتماد کرنا چاہئے اور جو آزادی خدا نے اسے دی ہے اس سے استفادہ کرے، اور جو وسائل اسے فراہم کئے ہیں ان سے بھرپورا فائدہ اٹھائے اور زندگی کی راہ کو طے کرے نہ یہ کہ دوسروں پر امید باندھ کر ہر روز خدا کے لئے ایک شریک ٹھہرائے اور ایک تازہ بت بنائے۔ نوکر کو جاننا چاہئے کہ وہ اپنی روٹی کھاتا ہے نہ مالک کی۔ مزدور کو جاننا چاہئے کہ وہ اپنی کمائی کی اجرت حاصل کرتا ہے نہ صاحب کار کی مفت میں دی گئی بخشش۔ بہر ملازم کو ایمان رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے کام کی مزدوری حاصل کرتا ہے نہ رئیس یا حکومت مربوط ادارہ یا معاشرے کا تحفہ۔

آخر کار آزاد انسان کو خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں باندھنی چاہئے اور کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہئے ورنہ اس کے باطن میں وہی پستی اور شرک کی غلامی پیدا ہو جائے گی جس کے آشکارا طور پر بت پرست ٹھکار ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، بیکاری کی عادت کرنے والوں اور اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالنے والوں پر لعنت بھیجی ہے۔ دور حاضر میں اجتماعی اور نفسیاتی تحقیقات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی برائیوں کا ایک بڑا حصہ بیکاری کی وجہ سے ہے۔ یہی بیکاری ہے جو معاشرے کے اقتصاد اور ثقافت کے پیسے کو چلنے سے روکتی ہے اور ہر قسم کے اخلاقی زوال اور خرافات پرستی کو رواج بخشتی ہے۔

کھیتی باڑی اور اس کے فائدے

کھیتی باڑی جس کے ذریعہ معاشرے کے لئے اناج میا کئے جاتے ہیں اپنی اہمیت کے پیش نظر انسان کے پسندیدہ ترین مشغلوں میں شمار ہوتی ہے، اسی لئے اسلام میں اس شغل کو اختیار کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ چھٹے امام، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ”قیامت کے دن کاشت کاروں کا مقام ہر مقام سے بلند تر ہوگا۔“ پانچویں امام حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: ”کوئی بھی کام کھیتی باڑی سے بہتر اور اس کا فائدہ اس سے زیادہ عمومی نہیں ہے۔ کیونکہ نیک و بد، چرند و پرند سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور زبان حال سے کسان کے لئے دعا کرتے ہیں۔“

دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے کے نقصانات

”لطیفی زندگی“، یعنی دوسروں کی امید اور پشت پناہی میں زندگی گزارنا۔ حقیقت میں ایسی زندگی، انسانی فخر، شرافت اور آزادی کو کھودینے اور تمام اجتماعی برائیوں اور جرم و گناہ کا باعث ہے کہ جس کا سرچشمہ ذلت و خواری ہے۔

جو دوسروں کے سہارے ہوتا ہے اس کی نگاہ لوگوں کی دست کرم پر ہوتی ہے، وہ حقیقت میں اپنے ارادہ و ضمیر کو اس راہ میں بچ دیتا ہے، اسے کرم فرما کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے وہ اس سے جو کچھ چاہتا ہے خواہ ”حق ہو یا باطل اچھا ہو یا برا“ وہ اسے انجام دینے پر مجبور ہوتا ہے۔

اور ہر رنگ و عار کو قبول کرنے، اجنبی پرستی، ہر ظلم و بے انصافی پر راضی ہو جانے اور آخر کار تمام انسانی قواعد و ضوابط کو پامال کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ اسلام میں ضرورت کے بغیر سوال کرنا حرام ہے، فقراء کی مالی امداد، جو اسلامی ضوابط میں ہے، صرف ان فقیروں سے مربوط ہے کہ جن کی آمدنی ان کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی کاروبار نہ ہو۔

^۱ میزان الحکمة، ج ۴ ص ۲۱۳۔

^۲ میزان الحکمة، ج ۴ ص ۲۱۳۔

ناپ تول میں کمی کی سزا

اسلام کی نظر میں ناپ تول میں کمی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ خدائے متعال اس گناہ کے مرتکب افراد کی سرزنش اور مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وَلِلْمُطَفِّفِينَ* اَلَا يَتَنَّبَهُ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ* يَوْمَ عَظِيمٍ^۱) ”ویل ہے ان کے لئے جو ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں کیا انھیں یہ خیال نہیں ہے کہ یہ ایک روز دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں؟“ ناپ تول میں کمی کرنے والا، لوگوں پر ظلم کرنے کے علاوہ، ان کے مال کو چوری کے راستے سے لوٹتا ہے، لوگوں میں اپنے اعتماد کو کھودیتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے گاہکوں اور اس کے بعد اپنے مال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

ظلم و ستم کی برائی

خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں سیکڑوں بار ”ظلم“ کا ذکر کیا ہے اور اس بری صفت جو درندوں کی خصلت ہے کی مذمت کی ہے (قرآن مجید کے دو تہائی سوروں میں، جو مجموعاً ۱۱۴ سورے میں، ظلم کا ذکر کیا گیا ہے) ایسا کوئی انسان پایا نہیں جاسکتا کہ جس نے اپنی فطرت سے ظلم کی برائی کو درک نہ کیا ہو، یا کم از کم یہ نہ جانتا ہو کہ ظلم و ستم نے انسانی معاشرے کے پیکر پر کتنی دردناک مصیبتیں ڈھائی ہیں اور کتنا خون بہایا ہے اور کتنے گھروں کو ویران کیا ہے۔

تجربے سے یقینی طور پر ثابت ہوا ہے کہ ظلم و ستم کے محل کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں پائدار نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی وقت ظالموں کے سروں پر گر کر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ خدائے متعال فرماتا ہے: (ۛۛۛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَۙۛۛۛ) خدائے متعال ہرگز ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا ہے، ”اولیائے دین فرماتے ہیں“: سلطنت اور ملک، کفر سے باقی رہ سکتا ہے، لیکن ظلم و ستم سے باقی نہیں رہ سکتا“^۳،

^۱ مطفّفین، ۵۱۔

^۲ انعام/ ۱۴۴۔

^۳ امالی شیخ مفید، ص ۳۱۰ (حواشی میں آیا ہے)۔

مردم آزاری اور شرارت حرام ہے

یہ دو صفتیں ایک دوسرے کے نزدیک ہیں، کیونکہ ”اذیت“ پہنچانا، دوسروں کو زبان سے رنج و تکلیف پہنچانا ہے، جیسے گالی دینا اور ایسی بات کہنا جس سے مخاطب رنجیدہ ہو جائے یا ہاتھ سے کوئی ایسا کام انجام دینا جس سے لوگ ناراض ہو جائیں۔ ”شرارت“ ایسا کام انجام دینا جو لوگوں کے لئے ”شر“ کا باعث ہو۔ بہر حال یہ دو صفتیں انسان کی ان آرزوؤں کے مقابلہ میں قرار پاتی ہیں، کہ انسان جن تک پہنچنے کے لئے اجتماع کو وجود میں لایا ہے، کہ وہ زندگی کی آرام و آسائش ہے۔

یہاں پر اسلام کا شرع مقدس، معاشرے کی مصلحت کو پہلے درجہ میں قرار دیتا ہے اور مردم آزاری و شرارت کو حرام قرار دیتا ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے: (وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغْيًا وَلَا تَتَرَفُّوا عَلَيْهِمْ حَتَّىٰ تَمُوتُوا وَآثُمًا مِّيتًا) اور جو لوگ صاحبان ایمان مرد یا عورت کو بغیر کچھ کئے دھرے اذیت دیتے ہیں، انہوں نے بڑے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ ”پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”جس شخص نے کسی مسلمان کو اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور میری اذیت خدا کی اذیت ہے، ایسے شخص پر تورات، انجیل اور قرآن مجید میں لعنت کی گئی ہے۔“

چوری: چوری ایک برا اور نامناسب مشغلہ ہے جو معاشرے کی اقتصادی حیثیت کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بدیہی ہے کہ انسان کی زندگی کے ابتدائی ضروریات میں سے مال و ثروت ہے جسے انسان اپنی عمر کی قیمت پر حاصل کرتا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے اس کے گرد ایک حفاظتی دیوار بنا دیتا ہے تاکہ ہر قسم کے تجاوز سے محفوظ رہے اور اس طرح اس کا مال معاشرے کی زندگی کی ضمانت اور اس کا پشت و پناہ بن جائے۔ البتہ اس دیوار کو توڑنا اور اس نظم کو ختم کرنا ایک ایسی عمر کے سرمایہ کو تباہ کرنے کے مترادف ہے کہ جس کو حاصل کرنے میں اس کی پوری عمر خرچ ہوئی ہے اور لوگوں کی سرگرمیوں کے ایک بڑے حصہ کو معطل کرنا لوگوں کے ہاتھ کاٹنے کے برابر ہے۔ اسی لئے اسلام نے اس نفرت انگیز عمل کے لئے کہ خود چور کا ضمیر بھی اس کے جرم ہونے

^۱ احزاب، ۵۸

^۲ الغدير، ج ۱۰، ص ۳۶۸۔

کی گواہی دیتا ہے، یہ سزا مقرر کی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ (یعنی دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں کاٹ دی جائیں) خدائے متعال فرماتا ہے:

(والنارِق والنارِقۃ فاقطعوا یدَیہما جزاءَ ما کُبا!) ”چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو کہ یہ ان کے لئے بدلہ اور خدا کی طرف سے ایک سزا ہے“۔

فرض شناسی: زندگی کے یہ بے شمار وسائل جو آج کل ہم انسانوں کے اختیار میں ہیں اور ہم ان کو حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے دن رات کوشش کرتے ہیں، ابتداء میں انسان کے اختیار میں نہیں تھے، بلکہ انسان کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں تدریجاً وجود میں آئے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہر صورت ابتدائی بشر سے لیکر آج کے متمدن انسان تک ہرگز کار و کوشش کا سلسلہ نہیں رکا ہے بلکہ انسان نے اپنی خدا داد فطرت کے ذریعہ اپنی زندگی کے وسائل فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ جس انسان کی وجودی توانائی کی سرگرمی ٹھپ ہو جاتی ہے تو اس کو مسلح کرنے کے داخلی و خارجی وسائل، آنکھ، کان، منہ، ہاتھ، پاؤں، دماغ، دل، پیچھے پھڑے اور جگر وغیرہ بے کار ہو جائیں گے، اور وہ مردہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔

اسی لئے انسان نہ صرف مجبور ہو کر کام کرتا ہے بلکہ اس جہت سے بھی کہ وہ انسان ہے لہذا گونا گوں سرگرمیاں انجام دیتا ہے، کیونکہ وہ اپنے انسانی شعور سے درک کرتا ہے کہ جس راہ سے بھی ممکن ہو، وہ اپنی زندگی کی سعادت اور خوشنہی کو حاصل کرے، اس لئے کار و کوشش میں لگ جاتا ہے اور اپنے مطالبات کی راہ میں قدم رکھتا ہے، لہذا انسان جس ماحول اور جس روش پر زندگی گزارتا ہے خواہ: دینی ہو یا غیر دینی، قانونی ہو یا استبدادی اور شرعی ہو یا خانہ بدوشی کی، اس میں اپنے لئے کچھ تکالیف و فرائض (وہ کام جن کا زندگی میں انجام دینا لازم جاتا ہے) کا احساس کرتا ہے کہ ان کو انجام دینے میں انسان کی حقیقی آرزوؤں کو پورا کر سکتا ہے اور اس کے لئے خوشحالی کی اور آسودہ و سعادتمندانہ زندگی فراہم کر سکتا ہے۔ البتہ ان تکالیف اور فرائض، جو سعادت مندی کی تہا راہ ہے، کی

قدر و قیمت خود انسانیت کی قدر و قیمت ہے کہ ہم اس سے زیادہ گراں بہا کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے اور اسے کسی دوسری چیز سے بدل نہیں سکتے۔ اس بنا پر ”فرض شناسی“ اور اسکا انجام دینا عمل کے میدان میں اہم ترین مسئلہ ہے کہ اس کا سروکار انسان کی زندگی سے ہے، کیونکہ اس کی اہمیت خود انسان کی اہمیت ہے، جو شخص اپنے مسلمہ فرائض کو انجام دینے میں پہلو تہی کرتا ہے یا کبھی کوتاہی کرتا ہے، تو وہ اسی کے مطابق انسانیت کی بلندی سے گرجاتا ہے اور فطری طور پر اپنی ہمتی اور بے قیمتی کا اعتراف کرتا ہے یا جو بھی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ اپنے معاشرے کے پیکر پر بلکہ حقیقت میں اپنے پیکر پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے۔

خدائے متعال فرماتا ہے: (والعصر * ان الانسان لفي خسر * الا الذين آمنوا وعلوا الصلوات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر) ”قسم ہے عصر کی بیشک انسان خسارہ میں ہے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت و نصیحت کی۔“ نیز فرماتا ہے: (ظہر الفساد في البر والبحر بما كسبت ايدي الناس) ”لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنا پر فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آگیا ہے۔“

فریضہ کی تعیین میں مختلف روشوں کا اختلاف

عالم انسانیت میں فریضہ کو پہچاننے اور اس پر عمل کرنے کی اہمیت بذات خود ایک پائدار و مسلم فریضہ ہے اور ہرگز کوئی ایسا انسان نہیں پایا جاسکتا جو اپنی انسانی فطرت سے اس حقیقت کا منکر ہو۔ جی ہاں، چونکہ انسانی فرائض انسان کی زندگی کی سعادت سے مکمل رابطہ رکھتے ہیں اور دین انسانی زندگی کے بارے میں غیر دینی طریقوں سے نظریاتی اختلاف رکھتا ہے لہذا دینی فرائض دوسرے فرائض کی روشوں سے اختلاف رکھیں گے۔ دین کا عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی ایک لامحدود اور ابدی ہے، جو موت سے ختم نہیں ہوتی اور موت کے بعد اس ابدی زندگی کا سرمایہ وہی صحیح عقائد پسندیدہ اخلاق اور اعمال صالحہ میں جنہیں انسان نے دنیا میں حاصل کیا ہے۔ اس لحاظ سے دین نے جو فرائض اور تکالیف فرد اور معاشرہ کے لئے مرتب کئے ہیں، ان میں اس ابدی دنیا کی زندگی کو بھی مد نظر

رکھا ہے۔ دین اپنے قوانین کو خدا شناسی اور خدا کی عبادت و بندگی کی روشنی میں مقرر کرتا ہے جس کا واضح اثر موت کے بعد قیامت کے دن ظاہر ہو گا۔ غیر دینی طریقے (جو بھی ہوں) صرف اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو مد نظر رکھتے ہیں اور انسان کے لئے کچھ فرائض وضع کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ مادی زندگی اور جسمانی قوای جو تمام حیوانوں میں مشترک ہیں سے بہتر استفادہ کریں۔ حقیقت میں یہ طریقے ایک حیوانی زندگی کو انسان کے لئے مرتب کرتے ہیں کہ جس کی منطق کا سرچشمہ چرندوں اور درندوں کے جذبات ہوتے ہیں اور انسان کی حقیقت پسندی اور اس کی مغویات سے بھری ابدی زندگی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانیت کے بلند اخلاق (جیسا کہ قطعی تجربہ بات سے ثابت ہے) غیر دینی معاشروں سے رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں اور روز بروز ان کا اخلاقی انحطاط واضح و آشکار تر ہوتا جا رہا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں: دین کی بنیاد، تقلید پر ہے، یعنی چون و چرا کے بغیر فرائض اور قوانین کے ایک سلسلہ کو قبول کرنا، لیکن اجتماعی طریقے وقت کی منطق کے ساتھ قابل مطابقت ہیں۔ جنہوں نے یہ بات کہی ہے، انہوں نے اس نکتہ سے غفلت کی ہے کہ جو قوانین و ضوابط معاشرے میں نافذ ہوتے ہیں، ان کو بلا چون و چرا نافذ ہونا چاہئے۔ ہرگز یہ نہ دیکھا گیا ہے اور نہ ہی سنا گیا ہے کہ کسی ملک میں لوگ ملک میں لاگو قوانین پر مناظرہ اور بحث و گفتگو کے بعد ان پر عمل کرتے ہوں اور جو بھی ان قوانین کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکا وہ اس پر عمل کرنے سے معاف ہو اور ان کو قبول کرنے میں مختار ہو، اس سلسلہ میں دینی اور غیر دینی روش میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن کسی ملک کے فطری اور اجتماعی حالات کا مطالعہ اور اس کی عام روش میں جستجو کر کے اس ملک کے قوانین کے کلیات کی حکمت کے کچھ جزئیات معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ دینی قوانین میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے۔ حقیقت پسندانہ راہ سے اور خلقت اور انسان کی فطری ضرورتوں کے بارے میں جستجو کر کے دین کے قوانین کے کلیات جو فطری روش ہے کے بارے میں بعض جزئیات کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید اور بہت سی روایتیں انسان کو سوچنے، غور و فکر اور تدبیر کی دعوت دیتی ہیں اور بعض

احکام میں اجمالی مصلحت کے بارے میں حکم یا اشارہ کیا جاتا ہے، چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہار علیہم السلام سے احکام کے فلسفہ کے بارے میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں اور در دست ہیں۔

دفاع کی اہمیت: جس طرح ایک انسان اپنی زندگی میں خوشنہی اور سعادت کا شیدائی ہوتا ہے اور ان کو حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہوتا ہے، اسی طرح وہ ہر طرف سے بے شمار خطرات سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض خطرے اس کے اصل وجود کو اور بعض اس کی زندگی کی سعادت و خوشنہی کو نشانہ بناتے ہیں، اس لئے انسان ان کو دور کرنے کے لئے مقابلہ اور دفاع کرنے پر مجبور ہے۔ انسان کی خلقت میں بھی ان ہی دو مرحلوں ”جذب و دفع“ کی پیشگوئی کی گئی ہے، اور اس کے وجود کی عمارت میں مناسب وسائل استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کے کچھ فوائد ہیں کہ جنہیں حاصل کرنا چاہئے اور بعض خطرات سے بھی دوچار ہے کہ بہر حال ان کے مقابلہ میں کھڑے ہو کر اپنی زندگی کے مقدمات کا دفاع کرنا چاہئے۔

جس نے لوگوں کی جانوں کو ختم کرنے، آزادی کے پرچم کو سرنگوں کرنے یا ان کی آزادی کو ختم کرنے کو اپنا مقصد قرار دیا ہے، وہ معاشرے کا دشمن ہے۔ انسان کا فخر و ایمان کی کمزوری اور نادانی معاشرے کے دشمن ہیں، جو اپنے معاشرے، یعنی زندگی کی سعادت اور انسانی حقیقت کا پابند ہے، اسے اپنے ان خطرناک دشمنوں کے مقابلہ میں دفاع کرنا چاہئے۔

بخش دینا: اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ انسان کے ضمیر میں، اصل زندگی اور شرافت مندانہ زندگی کی ایک ہی بنیاد ہے اور جو زندگی شرافت کے ساتھ ہو لیکن انسان کی سعادت اس میں نہ ہو، تو وہ حقیقت میں زندگی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی موت ہے جو طبعی موت سے تلخ و ناگوار ہے، جو انسان اپنی شرافت و سعادت کی اہمیت کا قائل ہے، اسے اس پست زندگی سے موت کی طرح فرار کرنا چاہئے۔ انسان جس ماحول میں بھی رہ رہا ہو اور جس روش کی طرف بھی مائل ہو، وہ اپنی خدا داد فطرت سے سمجھتا ہے کہ محترم و مقدس میں موت، بذات خود ایک سعادت ہے، دین کی منطق میں یہ مسئلہ دوسری ہر منطق سے زیادہ واضح اور وہم و گمان کے خرافات

سے نہایت دور ہے، جو شخص دین کے حکم سے اپنے دینی معاشرے کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان بچھا کر دے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کسی چیز سے محروم نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے اپنی چند روزہ زندگی کو خدا کی راہ میں پیش کر کے ایک نہایت شیریں، گراں بہا اور ابدی زندگی کو حاصل کیا ہے اور یقیناً اس کی سعادت ناقابل زوال ہے چنانچہ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

(ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتاً بل احياء عند ربهم يرزقون^۱) ”اور خبردار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پارہے ہیں“

لیکن غیر دینی طریقے، جو انسان کی زندگی کو اسی دنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود جانتے ہیں، ہرگز نہیں کہہ سکتیں کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ ہوتا ہے یا سعادت و خوشنہتی حاصل کرتا ہے، مگر یہ کہ وہم و گمان اور خرافات سے سمجھ میا جائے کہ جو وطن یا قومی مقدمات کی راہ میں قتل ہو جاتا ہے، اس کا نام جاں نثاروں اور قوم کے فداکاروں کی فہرست میں قرار پا سکتا ہے اور تاریخ میں سرے حروف سے لکھا جاسکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے زندہ و جاوید رہ سکتا ہے۔ لیکن جو تعجید اور تعظیم اسلام میں خدا کی راہ میں شہید ہونے اور قتل کئے جانے کے سلسلے میں کی گئی ہے، وہ کسی اور صلح عمل کے لئے نہیں کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”ہر نیکی سے بالاتر ایک نیکی ہے یہاں تک کہ راہ خدا میں شہید ہو جائے، اس کے بعد کوئی نیکی نہیں ہے۔“^۲

صدر اسلام کے مسلمان پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استغفار کی درخواست کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے نتیجے میں شہادت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوتے تھے اور شہادت کے ذریعہ دنیا سے چلے جانے والوں کے لئے گریہ نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ زندہ ہیں اور نہیں مرے ہیں۔

^۱ آل عمران، ۱۶۹

^۲ میزان الحکمة ج ۱، ص ۴۰۰۔

مال کی زکوٰۃ: مال سے انسان کی زندگی میں جو اعتدال پیدا ہوتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اسکی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ بہت سے لوگ زندگی مال کو ہی جانتے ہیں اور انسان کے لئے مال و دولت کے علاوہ کسی فضیلت و شرافت کے قائل نہیں ہیں۔ اور اپنی تمام سرگرمیوں کو پیسے جمع کرنے اور مال ذخیرہ کرنے میں صرف کرتے ہیں اور نتیجہ میں مال سے یہی دلچسپی اور حرص ان کو بخل کی صفت میں مبتلا کر دیتی ہے کہ جس کی بنا پر وہ دوسروں کو ان کے حق سے محروم کرتے ہیں اور کبھی اس سے بلند تر قدم اٹھا کر ہستی اور بخل کے سامنے تسلیم ہو کر خود بھی اس مال سے بہرہ مند ہونے سے محروم ہو جاتے ہیں، اس طرح نہ خود کھاتے ہیں اور نہ دوسروں کو کھلاتے ہیں اور صرف پیسے جمع کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

جو افراد بخل کی ناہنیدہ صفت میں مبتلا ہیں (البتہ کجوسی میں مبتلا ہونے والے ان لوگوں سے پست ہیں) وہ انسانی فطرت سے گر جاتے ہیں اور زندگی کے بازار میں دیوالیہ ہوتے ہیں، کیونکہ: ۱۔ زندگی میں، صرف اپنی سعادت، خوشنہی اور آسودگی کو چاہتے ہیں اور انفرادی زندگی کے قائل ہوتے ہیں، جبکہ انسان کی فطرت نے اجتماعی زندگی کو ہمارے لئے زندگی کے عنوان سے پہنچوایا ہے اور انفرادی زندگی جس راہ سے بھی ہو، اس کا انجام ناکامی ہے۔

۲۔ اپنی قدرت کا دوسروں کے سامنے مظاہرہ کر کے محتاجوں اور ناداروں کی خاطر و تواضع کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور باوجودیکہ محتاجوں کی کوئی مدد نہیں کرتے لیکن پھر بھی ان سے ہمیشہ اپنی تعظیم کرانا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ غلاموں کا سلوک کرتے ہیں اور بت پرستی کا جذبہ زندہ رکھتے ہیں جس کے نتیجہ میں معاشرے سے ہر قسم کی شہامت، شجاعت، فطرت کی بلندی اور انسانی فخر و مباہات ختم ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اس کے علاوہ کہ وہ خود پاک جذبات، محبت، مودت، انسان دوستی، خیر خواہی اور انسانی ہمدردی کو پامال کرتے ہیں، معاشرے میں جرم و خیانت اور ہر قسم کی پستی و رذالت کو ترویج دیتے ہیں، کیونکہ جرم و بھلا، جیسے: بدگوئی، بے حیائی، چوری، ڈاکہ زنی اور آدم کشی کا قوی

ترین طبعی عامل محتاجوں کے طبقہ میں موجود فقر و فاقہ غیظ و غضب اور کینہ وہ انتقامی جذبہ ہے جو مالداروں کے بارے میں ناداروں اور پچاروں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بخیل اور کنجوس مال دار اس کے باعث ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں بخیل شخص در حقیقت معاشرہ کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے، بہر حال وہ خدا کے غضب و سخت سزا اور لوگوں کی نفرت میں گرفتار ہوگا۔ قرآن مجید میں بخل اور کنجوسی کی ناپسند صفات کی مذمت اور سرزنش میں اور اس کے برعکس جود و سخاوت اور خدا کی راہ میں انفاق اور ناداروں و بے چاروں کی دستگیری کرنے والوں کی مدح و ثناء میں بہت سی آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں وعدہ کیا ہے کہ جو مال انفاق کیا جاتا ہے، اس کے عوض دس اور بعض مواقع میں ستر بلکہ سات سو سے بیش تر تک اضافہ کر کے انفاق کرنے والے کو واپس بھیجا جاتا ہے۔

تجربہ سے بھی ثابت ہوا ہے کہ سخی لوگ جب جو انفرادی کے ساتھ حاجتمندوں کی مدد کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کی مشکلات کو دور کرتے ہیں تو روز بہ روز ان کی دولت اور نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ کارگر گھٹا نشود در زمانہ بند ہزرگر کسی ندید در انگشت شانہ بند اگر لوگ کسی دن مشکلات سے دوچار ہو جائیں تو تمام دل ان کے ساتھ ہوں گے، انہوں نے جو دوسروں کے حق میں مدد کی ہے وہ اجتماعی صورت میں ان کے حق میں لوٹے گی۔ اور اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اچھے کردار سے ایک شریف انسان کے مانند اپنے ضمیر کو آرام بخشا ہے، واجب اور مستحب حقوق کے بارے میں ندائے آسمانی کو لبیک کہا ہے اور انسانیت کے پاک جذبات سے مہربانی، شفقت انسان دوستی اور خیر خواہی سے استفادہ کیا ہے، اس طرح عام محبوبیت اور خالص احترام کے مستحق ہوئے اور آخر کار خدا کی خوشنودی اور ابدی سعادت کو کم ترین قیمت پر خرید لیا۔

علم کی زکوٰۃ: ”علم اور ثقافت“ بے نظیر دولت ہے، جن سے انسان اپنی زندگی میں ہرگز بے نیاز نہیں ہوتا ہے اور ایسا انسان نہیں پایا جاسکتا، جو اپنی انسانی فطرت سے جہل پر علم کی برتری کو درک نہ کرتا ہو یا علماء اور دانشوروں کے احترام میں ان کے حق میں فیصلہ نہ دیتا ہو۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں عالم و جاہل میں فرق کے بارے میں زندہ و مردہ اور مینا و اور ناینا کی مثال دیتا ہے۔

اور اسلام میں علم و دانش کو جو اہمیت دی گئی ہے، وہ اہمیت کسی اور دین میں نہیں پائی جاتی، یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے“، نیز فرماتے ہیں: ”بگوارہ سے قبر تک علم حاصل کرو چاہے دنیا کے اس پار بھی ہو۔“ اسی کے پیش نظر اسلام نے بخل اور کنجوسی کی نہی کی ہے۔ علم کو چھپانے کی مذمت کی ہے، بلکہ دینی علوم کو چھپانا حرام قرار دیا ہے اور عالم کو جاہل کی تربیت کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے مقابلہ

چنانچہ، فطرت کے حکم سے، معاشرے کے بیرونی دشمنوں سے جنگ کرنی چاہئے اور معاشرہ کو نقصان سے بچانا چاہئے اور، اسی طرح معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے بھی جنگ اور مقابلہ کرنا چاہئے۔ معاشرے کا اندرونی دشمن وہ ہے جو عام روش اور رجاری قوانین کی مخالفت کرتا ہے اور اس طرح معاشرے کی زندگی کے ناطے کو توڑ دیتا ہے اور جاری نظام کو درہم و برہم کر دیتا ہے، اس لئے نظم و نسق، امور کی حفاظت اور معاشرے میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے کچھ افراد پر مثل پولیس وغیرہ کا نظام تشکیل دیا جاتا ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے مختلف سزائیں مقرر کی جاتی ہیں۔

اسلام نے بھی قوائے نافذہ کے علاوہ، معاشرے کے افراد کے لئے مختلف سزائیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو واجب قرار دیا ہے اور اس طرح مقابلہ کو مزید عوامی اور موثر تر بنا دیا ہے۔ اسلام اور معاشرے کی دوسری روشوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری روشیں صرف لوگوں کے افعال و اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ کرتی ہیں، لیکن اسلام لوگوں کے افعال کے علاوہ ان کے اخلاق کی طرف بھی توجہ کر کے دونوں مرحلوں میں فساد کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ جن اعمال کو اسلام نے گناہ اور مصیبت کے طور پر حرام قرار دیا ہے، وہ ایسے اعمال ہیں جن سے معاشرے میں بُرے اثرات اور منحوس نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس توصیف کے پیش نظر ان میں سے بعض اعمال براہ راست مرتکب ہونے والے ایک فرد یا تمام افراد کو برباد کر دیتے ہیں کہ

^۱ اصول کافی، ج ۱، ص ۳۰، ح ۱۔
^۲ نہج الفصاحہ، ص ۶۴، ج ۳۲۴، ۳۲۷۔

جس کی وجہ سے انسان کے کسی عضو میں زخم کے مانند معاشرے میں رخنہ ڈالتا ہے۔ اکثر گناہ جو انسان کی بندگی کی حالت میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور الہی حقوق کو ضرر پہنچاتے ہیں، ان کی بھی یہی حالت ہے، جیسے نماز نہ پڑھنا اور روزہ نہ رکھنا وغیرہ۔

ان میں سے بعض اعمال اجتماعی زندگی کے لئے بالواسطہ خطرہ بنتے ہیں، معاشرے کے پیکر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کی مثال ان بیماریوں کی سی ہے جو براہ راست انسان کی زندگی سے سروکار رکھتی ہیں اور زندگی کے رشتہ کو توڑ دیتی ہیں جیسے جھوٹ بولنا اور تہمت لگانا اسلام کی نظر میں ماں باپ کے حقوق، غیبت اور لوگوں پر تجاوز کا بھی یہی حکم ہے۔

اسلام میں گناہانِ کبیرہ کی عام سزا

مذکورہ برے اعمال، اسلام میں گناہانِ کبیرہ کہے جاتے ہیں اور خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں واضح طور پر ان گناہوں کے مرتکب لوگوں کے لئے عذاب کا وعدہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں سے بعض کے بارے میں سخت سزائیں مقرر کی ہیں۔ مکی طور پر ان گناہوں کے مرتکب لوگ (اگر ایک ہی بار بھی انجام دیں) عدل و انصاف کا خاتمہ کرتے ہیں، یعنی معاشرے کے ایک صالح عضو سے اس کی شرافت کو سلب کرتے ہیں۔ جو شخص گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنی عدالت کو کھودیتا ہے اور وہ ان اختیارات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا، جن سے معاشرے کا ایک صالح عضو بہرہ مند ہوتا ہے۔ وہ اسلامی حکومت میں کوئی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا، خلافت کے عہدہ پر فائز نہیں ہو سکتا، امامِ جماعت نہیں بن سکتا، اور کسی کے حق میں یا مخالفت میں اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہے اور وہ اسی حالت میں رہے گا جب تک کہ توبہ نہ کر لے اور مسلسل تقویٰ و پرہیزگاری سے دوبارہ ”عدالت“ کی صفت کا مالک بن جائے۔

احکام کے بارے میں چند سبق

اجتہاد اور تقلید

انسان کی زندگی میں پائی جانے والی حاجتیں اور ان کو پورا کرنے کے لئے ان کی سرگرمیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ایک معمولی انسان ان کو گننے اور شمار کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، ان سب کے بارے میں اور مہارت حاصل کر کے کافی مقدار میں معلومات حاصل کرنے کی بات ہی نہیں، دوسرے یہ کہ انسان اپنے کام کو فکر و ارادہ سے انجام دیتا ہے اور جہاں پر اسے کوئی فیصلہ کرنا ہو، تو اس کے بارے میں اس کے پاس کافی معلومات ہونا چاہئے ورنہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اس کو اپنے انجام دینے والے کاموں میں خود ماہر ہونا چاہئے یا کسی ماہر سے پوچھے اور اس کے حکم کے مطابق اس کام کو انجام دے۔ چنانچہ فطری طور پر ہم مریضوں کا علاج کرنے کے لئے طیب سے، مکان کا نقشہ بنانے کے سلسلہ میں انجینئر سے، معاری میں معمار سے رجوع کرتے ہیں اور دروازے اور کھڑکیاں بنانے میں بنجار پر اعتماد کرتے ہیں۔ پس ہم ہمیشہ بہت کم کاموں کے علاوہ اپنے دوسرے تمام مسائل میں تقلید کرتے ہیں۔

جو یہ کہتا ہے کہ: ”میں اپنی زندگی میں تقلید کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا ہوں“، وہ شخص یا اپنی بات کے معنی کو نہیں سمجھا ہے یا ایک فکری آفت میں مبتلا ہوا ہے۔ چونکہ اسلام نے اپنی شریعت کی بنیاد انسانی فطرت پر ڈالی ہے، لہذا اسی روش کا انتخاب کیا ہے۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ دینی معارف اور احکام کو سیکھیں ان معارف کا سرچشمہ کتاب خدا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی سنت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔ بدیہی ہے کہ تمام دینی معارف کو کتاب و سنت سے حاصل کرنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور یہ کام مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کے علاوہ تمام مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے خود بخود دین کا حکم اس صورت میں نکلتا ہے کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو دینی معارف و احکام کو استدلال کی راہ سے حاصل نہیں کر سکتے، انھیں ان لوگوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو دینی احکام کو دلیل سے حاصل کر چکے ہوں اور اس طرح

اپنے فریضہ پر عمل کریں۔ جو عالم دینی احکام کو استدلال کی راہ سے حاصل کرتا ہے، اس کو ”مجتہد“ اور اس کے کام کو ”اجتہاد“ کہا جاتا ہے اور جو مجتہد کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو ”مقلد“ اور اس کے اس کام کو ”تقلید“ کہتے ہیں۔ البتہ اس نکتہ کو جاننا چاہئے کہ تقلید، عبادت، معاملات اور دین کے دوسرے عملی احکام میں جائز ہے، لیکن اصول دین میں، جو اعتقادی مسئلہ ہے، کسی صورت میں کسی کی تقلید نہیں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اصول دین میں ایمان و عقیدہ ضروری ہے نہ عمل، اس لئے دوسروں کے ایمان کو اپنا ایمان فرض نہیں کیا جاسکتا ہے یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ خدا ایک ہے اس دلیل پر کہ ہمارے والدین یا عالم ایسا کہتے ہیں۔ یا مرنے کے بعد زندگی حق ہے، کیونکہ تمام مسلمان اس کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنے اصول دین کو دلیل کی راہ سے جانے اگرچہ سادہ طریقہ سے ہی ہو۔

نجاسات

نجاسات (نجس چیزیں) چند چیزیں ہیں: ۱۔ پیشاب اور پاخانہ۔ ۲۔ اس حرام گوشت حیوان کا پیشاب اور پاخانہ نجس ہے جو خون جندہ رکھتا ہو یعنی وہ حیوان جس کی رگ کاٹنے پر خون اچھل کر نکلے، جیسے بلی، لومڑی، خرگوش وغیرہ بلکہ اگر مرغی یا کوئی دوسرا حیوان جو نجاست کھانے کی وجہ سے حرام گوشت بن چکا ہو، تو اس کا بھی پیشاب و پاخانہ نجس ہے۔

۳۔ خون جندہ رکھنے والے حیوانوں کا مردار، خواہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت لیکن حرام گوشت حیوان کے بعض اجزاء جیسے اون بال اور ناخن جو جان نہیں رکھتے ہیں پاک ہیں۔

۴۔ خون جندہ رکھنے والے حیوانوں کا خون، خواہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت۔

۵۔ ننگی میں رہنے والے کتے اور سور، ان کے تمام اجزاء یہاں تک کہ ان کے بال بھی نجس ہیں۔

^۱ پیشاب نکلنے کی جگہ صرف پانی سے پاک ہوتی ہے اور پاخانہ نکلنے کی جگہ کو پانی سے دھویا جاسکتا ہے یا پتھر یا اسکے مانند تین ٹکڑوں سے پاک کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ پاخانہ اپنی جگہ سے باہر نہ پھیلا ہو ورنہ پانی کے بغیر پاک نہیں ہوگا۔ ضمناً یاد دہانی کی جاتی ہے کہ اگر پاخانہ تین پتھر سے صاف نہ ہو تو اس سے زیادہ پتھر سے پاک کیا جائے۔

۷۔ شراب اور مست کرنے والی ہر سیال چیز۔

۸۔ آب جو۔

مطہرات

(پاک کرنے والی چیزیں) ہر وہ چیز جس سے نجاست پاک کی جاتی ہے، اسے (مطہر) کہتے ہیں اور مطہرات درج ذیل ہیں: ۱۔ پانی یہ ہر نجس ہوئی چیز کو پاک کرتا ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ پانی مطلق ہو۔ اسلئے مضاف پانی، جیسے ہندوانہ اور گلاب کے پانی سے نجاست پاک نہیں ہوتی اور ان سے وضو و غسل بھی صحیح نہیں ہے۔

۲۔ زمین یہ جوتے کی تہ اور پاؤں کے تلوے کو پاک کرتی ہے۔

۳۔ آفتاب یہ نجس زمین اور چٹائی وغیرہ کو اپنی گرمی سے خشک کر کے پاک کرتا ہے۔

۴۔ استحالہ یعنی نجس چیز اپنی جنس بدل کر ایک پاک چیز کی صورت میں ظاہر ہو جائے۔ جیسے کتانک کی کان میں گر کر نمک میں تبدیل ہو جائے۔

۵۔ انتقال یعنی انسان کے بدن کا خون یا خون ہندہ رکھنے والے کسی حیوان کا خون ایک ایسے حیوان کے بدن میں منتقل ہو جائے جو خون ہندہ نہ رکھتا ہو۔ جیسے انسان کے بدن کا خون مچھر یا مکھی وغیرہ کے بدن میں منتقل ہو جائے۔

۶۔ عین نجاست کا زائل ہو جانا، یعنی حیوان کے ظاہر اور انسان کے باطن، مثلاً اگر حیوان کی پشت یا انسان کی ناک کے اندر کا حصہ خون آلود ہو جائے تو خون کے زائل ہونے کے بعد پاک ہو جاتا ہے اور اسے پانی سے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔

^۱ پانی کی دو قسمیں ہیں: کُر اور قلیل۔ کُر پانی: بیس مثقال کم ۱۲۸ من تبریزی ہے، جو تقریباً ۳۸۴ کلوگرام ہوتا ہے اور اگر کوئی نجاست اس سے مل جائے، تو نجس نہیں ہوتا، قلیل پانی: وہ پانی جو کُر سے کم ہو، اگر اس سے کوئی نجاست مل جائے تو وہ نجس ہو جاتا ہے اور اس کا پاک ہونا اس طرح ہے کہ جاری یا بارش کے پانی سے متصل ہو جائے یا اس پر ایک کُر کا اضافہ کیا جائے۔

۷۔ تبعیت تبعیت سے مراد یہ ہے کہ ایک نجس چیز دوسری نجس چیز کے پاک ہونے سے پاک ہو جاتی ہے، جیسے کافر کے مسلمان ہونے سے اس کا فرزند باپ کی تبعیت میں پاک ہو جاتا ہے۔

۸۔ کم ہونا یعنی انکسار کا پانی ابلانے سے نجس ہو جاتا ہے، لیکن اگر ابلانے کے ذریعہ دو تہائی پانی بھاپ میں تبدیل ہو کر کم ہو جائے تو باقی پانی پاک ہو جاتا ہے۔

غسل

غسل دو طریقہ سے انجام دیا جاسکتا ہے: (ترتیبی اور ارتعاسی)

غسل ترتیبی سے مراد یہ ہے کہ سر و گردن اور دائیں و بائیں طرف کو ترتیب سے دھویا جائے۔ غسل ارتعاسی یہ ہے کہ انسان یکبارگی پورے بدن کو پانی میں ڈبو دے۔ غسل کی دو قسمیں ہیں: واجب اور مستحب۔ دین اسلام میں مستحب غسل بہت زیادہ ہیں اور واجب غسل سات میں: ۱۔ غسل جنابت

۲۔ غسل میت

۳۔ غسل مس میت یعنی اگر انسان مردہ کے بدن کو سرد ہونے کے بعد اور غسل میت دینے سے پہلے مس کرے یعنی اپنے بدن کا کوئی حصہ اس کے بدن سے ملائے، تو اسے غسل کرنا چاہئے۔

۴۔ نذر یا عذ کیا ہو یا قسم کھائی ہو کہ غسل کرے گا۔

۵۔ غسل حیض

۶۔ غسل نفاس

۷۔ غسل استحاضہ

پہلے چار غسل مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں اور آخری تین غسل صرف عورتوں سے مخصوص ہیں۔ شخص مجنب پر جو چیزیں حرام ہیں، وہ حسب ذیل ہیں: ۱۔ اپنے بدن کے کسی حصہ کو قرآن مجید کے الفاظ، خدا کے نام اور پیغمبرؐ وائمه اطہار علیہم السلام کے ناموں سے مس کرنا۔

۲۔ مسجد الحرام اور مسجد النبیؐ میں داخل ہونا۔

۳۔ دوسری تمام مساجد میں رُکنا اور کوئی چیز ان میں رکھنا۔

۴۔ قرآن مجید کے ان چار سوروں میں سے کسی ایک کی تلاوت کرنا کہ جن پر سجدہ واجب ہے۔ یعنی سورہ نجم، اقراء، الم تزلزل اور حم سجدہ۔

جنابتہ حیض، نفاس اور استحاضہ کے تمام احکام کو توضیح المسائل سے حاصل کرنا چاہئے۔ نوٹ۔ غسل میں بھی وضو کی طرح نیت کرنا لازم ہے اور غسل سے پہلے بدن پاک ہونا چاہئے اور بدن تک پانی پہنچنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہونی چاہئے۔

وضو اور اس کے احکام

انسان کے لئے وضو سے پہلے مواک کرنا اور کھلی کرنا مستحب ہے یعنی پاک پانی منہ میں ڈالے اور کھلی کرے۔ اس کے علاوہ استشفاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا بھی مستحب ہے۔

وضو کی کیفیت اور اس کے شرائط: وضو میں چہرے کو سر کے بال گنے کی جگہ سے ٹھوڑی تک اور ہاتھوں کو کہنی سے انگلیوں کے سرے تک دھونا چاہئے اور سر کے اگلے حصہ پر اوپریروں کے اوپری حصہ پر مسح کرنا چاہئے۔

وضو میں مندرجہ ذیل چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے: ۱۔ وضو کے اعضاء پاک ہوں۔

۲۔ وضو کا پانی پاک، مطلق اور مباح ہو۔

۳۔ نیت: یعنی وضو کو رضاء الہی کے لئے انجام دینا چاہئے، لہذا اگر ٹھنڈک حاصل کرنے یا کسی دوسرے مقصد سے وضو کرے تو صحیح نہیں ہے۔

۴۔ ترتیب: یعنی پہلے چہرہ پھر دایاں ہاتھ اس کے بعد بایاں ہاتھ دھونا چاہئے، اس کے بعد سر پھر پاؤں کا مسح کرنا چاہئے۔

۵۔ مولات: یعنی وضو کے افعال یکے بعد دیگرے انجام دے اور ان کے درمیان اتنا فاصلہ نہ ہو کہ کسی عضو کو دھونے یا مسح کرنے کے وقت اس سے پہلا والا عضو خشک ہو جائے، لیکن اگر وضو کے افعال پے درپے انجام پانے کے باوجود ہوا گرم ہونے یا بدن کی گرمی وغیرہ کی وجہ سے وضو کی رطوبت خشک ہو جائے تو وضو صحیح ہے۔ نوٹ: یہ ضروری نہیں ہے کہ سر کا مسح سر کی کھال پر ہو بلکہ سر کے اگلے حصہ کے بالوں پر بھی صحیح ہے، لیکن اگر سر کے دوسرے حصوں کے بال اگلے حصہ پر جمع ہوئے ہوں تو پہلے انہیں ہٹانا چاہئے اور اگر سر کے اگلے حصہ کے بال اس قدر لمبے ہوں کہ گنگھی کرنے سے چہرے پر آئیں تو اس صورت میں بالوں کی جڑ پر مسح کرنا چاہئے یا مانگ نکال کر کھال پر مسح کرنا چاہئے۔

مطلات وضو

جو چیزیں وضو کو باطل کرتی ہیں انہیں ”مطلات“ کہتے ہیں اور وہ آٹھ ہیں:

۱۔ پیشاب

۲۔ پاخانہ

^۱ یعنی پانی انسان کا اپنا ہونا چاہئے یا اس کا مالک اس سے وضو کرنے پر راضی ہو۔

۳۔ ریح (یہ اس صورت میں ہے کہ جب ہوا پاخانہ کے مقام سے خارج ہو یا بیماری اور آپریشن کی وجہ سے، مخرج دوسری جگہ ہو گیا ہو)

۴۔ بیوشی

۵۔ متی

۶۔ وہ نیند، جس میں آنکھیں نہ دیکھ سکیں اور کان نہ سن سکیں، اس بنا پر اگر آنکھیں نہ دیکھیں لیکن کان سنیں تو وضو باطل نہیں ہوتا ہے۔

۷۔ دیوانگی

۸۔ جنابت اور وہ اسباب جن کے لئے غسل کیا جاتا ہے نیز استحاضہ جسے عورتیں بعض اوقات دیکھتی ہیں، وضو کو باطل کرتا ہے۔

تیمم

اگر انسان وقت کی تنگی، بیماری یا پانی نہ ہونے یا اسی طرح کی کسی اور چیز کی وجہ سے نماز اور اس کے مانند دوسرے اعمال کے لئے وضو یا غسل نہ کر سکے تو اسے تیمم کرنا چاہئے۔

تیمم کا طریقہ

تیمم میں چار چیزیں واجب ہیں: ۱۔ نیت

۲۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو مٹی یا اس چیز پر مارنا جس پر تیمم کرنا صحیح ہے۔

۳۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو سر کے بال اگنے کی جگہ سے بھوؤں اور ناک کے اوپر پوری پیشانی پر پھیرنا۔ بہتر ہے کہ ہاتھوں کو بھوؤں پر بھی پھیرا جائے۔

۴۔ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دائیں ہاتھ کی پوری پشت پر اور اس کے بعد دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پوری پشت پر کھینچنا۔ وضو کے بدلے کئے جانے والے تیمم میں اتنی ہی مقدار کافی ہے لیکن اگر تیمم غسل کے بدلے ہو، تو ایک بار پھر ہاتھوں کو زمین پر مار کر صرف ہاتھوں کی پشت پر مسح کرے۔

تیمم کے احکام

۱۔ اگر مٹی نہ ملے تو ریت پر، اور اگر ریت نہ ملے تو ڈھیلے پر، اور اگر وہ بھی نہ ملے تو پتھر پر تیمم کرنا چاہئے اور جب ان میں سے کوئی بھی چیز نہ ملے تو کہیں پر جمع ہوئی گرد و غبار پر تیمم کرنا چاہئے۔

۲۔ چونے اور دوسری معدنی چیزوں پر تیمم کرنا صحیح ہے۔

۳۔ اگر پانی کو منگنا بچا جا رہا ہو، لیکن انسان اسے خرید سکتا ہو تو تیمم نہیں کر سکتا ہے بلکہ اسے پانی خرید کر وضو اور غسل کرنا چاہئے۔

ناز

خدا نے متعال فرماتا ہے: (ما سکلم فی سقر، قالوا لم نک من المصلین) ”جب اہل جہنم سے پوچھا جائے گا آخر تمہیں کس چیز نے

جہنم میں پہنچا دیا ہے؟ تو وہ کہیں گے ہم ناز گزار نہیں تھے۔“ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”ناز دین کا ستون ہے، اگر

بارگاہ الہی میں یہ قبول ہو جائے گی تو دوسری عبادتیں بھی قبول ہوں گی اور اگر یہ قبول نہ ہوئی، تو دوسری عبادتیں بھی قبول نہیں ہوں

گی،“ جس طرح ایک انسان دن رات میں پانچ بار ایک نر میں نہائے تو اس کے بدن میں کسی قسم کا میل کچل باقی نہیں رہے گا، اسی

طرح پانچ وقت کی نمازیں بھی انسان کو لگنا ہوں سے پاک کرتی ہیں، جاننا چاہئے کہ جو ناز پڑھتا ہے لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا، وہ اس

شخص کے مانند ہے، جو اصلاً ناز نہیں پڑھتا ہے۔ خدا نے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: (فویل للمصلین، الذین ہم عن صلاتہم ساهون

۱) ”تو بتا ہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔“ ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے اور دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، لیکن رکوع و سجود کو مکمل طور پر بجا نہیں لارہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”یہ شخص جس طرح نماز پڑھ رہا ہے اگر اسی حالت میں اس دنیا سے گزر گیا تو مسلمان کی حیثیت سے دنیا سے نہیں گیا ہے۔“ اس بنا پر نماز کو خضوع و خشوع کی حالت میں پڑھنا چاہئے اور نماز پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ کس ذات سے محو گفتگو ہے اور رکوع و سجود اور دوسرے تمام اعمال کو صحیح طور پر انجام دے تاکہ نماز کے عالی نتائج سے بہرہ مند ہو جائے۔

خدائے متعال قرآن مجید میں نماز کے بارے میں فرماتا ہے: (ان الصلوة تنی عن الفشاء والمنکر...)۔ نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکتی ہے، یقیناً ایسا ہی ہے کیونکہ نماز کے آداب اس طرح ہیں کہ اگر نماز گزار ان کا لحاظ رکھے تو کبھی برائی کے پیچھے نہیں جائے گا۔ مثلاً آداب نماز میں سے ایک یہ ہے کہ نماز گزار کی جگہ اور لباس غصبی نہ ہوں، اگر اس کے لباس میں حتیٰ ایک دھاگا بھی غصبی ہو تو اس کی نماز صحیح نہیں ہے۔ تو جو نماز گزار اس حد تک حرام سے پرہیز کرنے پر مجبور ہے تو ممکن نہیں ہے کہ وہ حرام مال کو استعمال کرے یا کسی کا حق ضائع کرے نیز نماز اس صورت میں قبول ہوتی ہے کہ انسان، حرص، حد اور دوسری بری صفتوں سے دور رہے اور مسلم ہے کہ تمام برائیوں کا سرچشمہ یہی بری اور ناشائستہ صفتیں ہیں اور نمازی جب اپنے آپ کو ان صفتوں سے دور رکھے گا، تو وہ یقیناً تمام برائیوں سے دور رہے گا۔

اگر بعض لوگ نماز پڑھنے کے باوجود ناپسند کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں، تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ نماز کے ضروری احکام کے مطابق عمل نہیں کرتے اور نتیجہ میں ان کی نماز قبول نہیں ہوتی ہے اور وہ اس کے عالی نتائج سے محروم رہتے ہیں۔ دین اسلام کے شارع مقدس نے نماز کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ، ہر حال میں حتیٰ جان کنی کی حالت میں بھی انسان پر نماز کو واجب قرار دیا ہے، اگر وہ نماز کو زبان پر جاری نہیں کر سکتا ہے تو دل پر جاری کرنا چاہئے اور اگر جنگ، دشمن کے خوف یا اضطراب اور مجبوری کی وجہ

سے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھ سکے تو اس کے لئے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا واجب نہیں ہے اور جس طرف بھی ممکن ہو نماز پڑھے۔

واجب نمازیں

واجب نمازیں چھ ہیں: ۱۔ پنجگانہ نمازیں^۱

۲۔ نماز آیات

۳۔ نماز میت

۴۔ واجب طواف کی نماز

۵۔ ماں باپ کی قضا نمازیں جو بڑے بیٹے پر واجب ہوتی ہیں۔

۶۔ وہ نمازیں جو اجارہ، نذر، قسم اور عہد کی وجہ سے واجب ہوتی ہیں۔



مقدمات نماز

نماز بجالانے، یعنی پروردگار عالم کی خدمت میں حاضر ہونے اور ذات مقدس الہی کی انظار بندگی اور رہنمائی کے لئے کچھ مقدمات

ضروری ہیں۔ جب تک یہ مقدمات فراہم نہ ہو جائیں نماز صحیح نہیں ہے اور یہ مقدمات حسب ذیل ہیں: ۱۔ طہارت

۲۔ وقت

۳۔ لباس

^۱ یومیہ نمازوں سے مراد: صبح کی دو رکعتیں، ظہر و عصر کی چار چار رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں اور عشا کی چار رکعتیں ہیں۔

۴۔ مکان

۵۔ قبلہ

ان مقدمات کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ طہارت: نماز ہی کو نماز کی حالت میں با طہارت ہونا چاہئے، اپنے فریضہ کے مطابق نماز کو با وضو یا غسل یا تیمم کے ذریعہ بجالائے اور اس کا بدن اور لباس نجاست سے آلودہ نہ ہوں۔

۲۔ وقت: نماز ظہر و عصر میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص وقت اور مشترک وقت ہے، نماز ظہر کا مخصوص وقت اول ظہر سے نماز ظہر پڑھنے کا وقت گزرنے تک ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں سو ا بھی نماز عصر پڑھے، تو اس کی نماز باطل ہے۔ نماز عصر کا مخصوص وقت اس وقت ہوتا ہے جب مغرب سے پہلے صرف نماز عصر پڑھنے کے برابر وقت بچا ہو۔ اگر کسی نے اس وقت تک ظہر کی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کی نماز ظہر قضا ہو جائے گی۔

اسی طرح نماز ظہر کے مخصوص وقت اور نماز عصر کے مخصوص وقت کے درمیان کا وقت نماز ظہر و عصر کا مشترک وقت ہے۔ اگر کوئی شخص غلطی سے اس وقت کے اندر نماز عصر کو نماز ظہر سے پہلے پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے ظہر کی نماز اس کے بعد پڑھنی چاہئے۔ نماز مغرب کا مخصوص وقت اول مغرب سے تین رکعت نماز پڑھنے کے وقت کے برابر ہے۔ نماز عشا کا مخصوص وقت وہ وقت ہے جب نصف شب^۲ سے پہلے نماز عشا پڑھنے کے برابر وقت بچا ہو۔ اگر کسی نے اس وقت تک نماز مغرب

^۱ اگر ایک لکڑی یا اس کے مانند کوئی چیز سیدھی زمین میں نصب کی جائے تو، سورج چڑھنے پر اس کا سایہ مغرب کی طرف پڑے گا جس قدر سورج اوپر چڑھے گا، یہ سایہ کم ہوتا جائے گا اور اول ظہر میں اس کی کمی آخری مرحلہ پر پہنچ جائے گی، جب ظہر کا وقت گزرے گا تو سایہ مشرق کی طرف پلٹ جاتا ہے اور سورج جس قدر مغرب کی طرف بڑھے گا سایہ زیادہ ہوتا جائے گا۔ اس بنا پر جب سایہ کم ہوتے ہوئے کمی کے آخری درجہ پر پہنچ جائے اور پھر سے بڑھنا شروع ہو جائے تو معلوم ہو تا ہے کہ ظہر کا وقت ہے۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض شہروں جیسے مکہ مکرمہ میں ظہر کے وقت سایہ بالکل غائب ہوتا ہے، ایسے شہروں میں سایہ کے دوبارہ نمودار ہونے پر ظہر کا وقت ہوتا ہے۔

^۲ سورج ڈوبنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد مغرب ہوتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد مشرق کی طرف رونما ہونے والی سرخی غائب ہو جائے۔

^۳ نصف شب، شرعی ظہر کے بعد گیارہ گھنٹے اور پندرہ منٹ گزرنے کے بعد ہوتی ہے۔

نہیں پڑھی ہے تو اسے پہلے نماز عشا پڑھنی چاہئے پھر اس کے بعد نماز مغرب پڑھے۔ نماز مغرب کے مخصوص وقت اور نماز عشاء کے مخصوص وقت کے درمیان نماز مغرب و عشا کا مشترک وقت ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں غلطی سے نماز مغرب سے پہلے نماز عشا کو پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے نماز مغرب کو اس کے بعد بجالانا چاہئے۔ نماز صبح کا وقت اول فجر صادق سے سورج نکلنے تک ہے۔

۳۔ لباس: نمازی کے لباس میں چند چیزیں شرط ہیں: ۱۔ لباس مباح ہو، یعنی نمازی کا اپنا لباس ہو یا اگر اپنا لباس نہ ہو تو اس لباس کا مالک اس میں نماز پڑھنے پر راضی ہو۔

۲۔ لباس نجس نہ ہو۔

۳۔ مرد ار کی کھال کا نہ ہو، خواہ حلال گوشت حیوان کی کھال ہو یا حرام گوشت کی۔

۴۔ حرام گوشت حیوان کے اون یا بالوں کا نہ ہو۔ لیکن سمور کے کھال سے بنے ہوئے لباس میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

۵۔ اگر نمازی مرد ہے تو ریشمی اور زرباف لباس نہیں ہونا چاہئے اور خود کو بھی سونے سے زینت نہ کرے۔ نماز کے علاوہ بھی مردوں کے لئے ریشمی لباس پہننا اور سونے سے زینت کرنا حرام ہے۔

۴۔ مکان: نمازی کے مکان۔ یعنی وہ جگہ جہاں پر وہ نماز پڑھتا ہے۔ کے کچھ شرائط ہیں: ۱۔ مباح ہو۔

۲۔ ساکن ہو۔ اگر ایک ایسی جگہ جو متحرک ہو، جیسے گاڑی میں اور متحرک کشتی میں نماز پڑھنے پر مجبور ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، البتہ گاڑی وغیرہ قبلہ کے مخالف سمت میں چل رہی ہوں تو نمازی کو قبلہ کی طرف گھومنا چاہئے۔

^۱ فجر کی اذان کے قریب مشرق کی طرف ایک سفیدی اوپر کی طرف بڑھتی ہے اسے فجر اول یا فجر کاذب کہتے ہیں۔ جب یہ سفیدی پھیل جاتی ہے، تو فجر دوم یعنی فجر صادق ہے اور صبح کی اذان کا وقت ہے۔

۳۔ اگر مکان نجس ہو تو اس قدر ترنہ ہو کہ اس کی رطوبت نمازی کے بدن یا لباس تک پہنچ جائے۔ لیکن پیشانی رکھنے کی جگہ اگر نجس ہو تو خشک ہونے کی صورت میں بھی نماز باطل ہے۔

۴۔ پیشانی رکھنے کی جگہ گھٹنوں کی جگہ سے، ملی ہوئی چار انگلیوں سے زیادہ پست یا بلند نہیں ہونی چاہئے۔

۵۔ قبلہ: خانہ کعبہ، جو مکہ مکرمہ میں ہے، قبلہ ہے اور اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنی چاہئے۔ البتہ جو لوگ دور ہیں وہ اگر اس طرح کھڑے ہو جائیں یا بیٹھ جائیں کہ کہا جائے کہ قبلہ کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں، تو کافی ہے، اسی طرح دوسری چیزیں جیسے حیوانات کا ذبح کرنا بھی قبلہ کی طرف رخ کر کے انجام دیا جانا چاہئے۔ جو شخص بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو اسے دائیں پہلو پر ایسے لیٹ کر نماز پڑھنا چاہئے کہ اس کے بدن کا اگلا حصہ قبلہ کی طرف ہو، اور اگر ممکن نہ ہو تو بائیں پہلو پر اس طرح لیٹے کہ اس کے بدن کا اگلا حصہ قبلہ کی طرف ہو، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اسے پشت پر اس طرح لیٹنا چاہئے کہ اس کے پاؤں کے تلے قبلہ کی طرف ہوں۔ اگر انسان تحقیق کے بعد نہ سمجھ سکے کہ قبلہ کس طرف ہے تو اسے مسلمانوں کے محرابوں، قبروں یا دوسرے راستوں سے پیدا ہوئے گمان کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

ترجمہ قرآن
Translation Movement

واجبات نماز

واجبات نماز یعنی وہ چیزیں جو نماز میں واجب ہیں، گیارہ ہیں: ۱۔ نیت

۲۔ تکبیرۃ الاحرام

۳۔ قیام

۴۔ قرات

۵۔ رکوع

۶۔ سجود

۷۔ تہجد

۸۔ سلام

۹۔ ترتیب یعنی نماز کے اجزاء کو معین شدہ دستور کے مطابق پڑھے، آگے پیچھے نہ کرے۔

۱۰۔ طائیت یعنی نماز کو وقار اور آرام سے پڑھے۔

۱۱۔ موالات: یعنی نماز کے اجزاء کو پے در پے بجالائے اور ان کے درمیان فاصلہ نہ ڈالے۔ مذکورہ گیارہ چیزوں میں سے پانچ چیزیں ارکان میں کہ اگر عدا یا سوا کم و زیاد ہو جائیں، تو نماز باطل ہے اور باقی چیزیں رکن نہیں ہیں، صرف اس صورت میں نماز باطل ہوگی کہ ان میں عدا کی زیادتی کی جائے۔

ترجمہ قرآن
Translation Movement

ارکان نماز

ارکان نماز حسب ذیل ہیں: ۱۔ نیت

۲۔ تکبیرۃ الاحرام

۳۔ قیام۔ تکبیرۃ الاحرام کے وقت پر قیام اور متصل بہ رکوع

۴۔ رکوع

۵۔ دو سجدے

۱۔ نیت ”نیت“ سے مراد یہ ہے کہ انسان نماز کو قصد قربت سے، یعنی خدائے متعال کے حکم کو بجالانے کے لئے انجام دے۔ ضروری نہیں ہے کہ نیت کو دل سے گزارے یا مثلاً زبان سے کہے ”: میں چار رکعت نماز نظر پڑھتا ہوں قربۃ الی اللہ“

۲۔ تکبیرۃ الاحرام: اذان و اقامت کہنے کے بعد، نیت کے ساتھ ”اللہ اکبر“ کہنے سے نماز شروع ہوتی ہے اور چونکہ اس تکبیر کے کہنے سے کچھ چیزیں جیسے کھانا پینا، فناء اور قبلہ کی طرف پشت کرنا، حرام ہو جاتی ہیں، اس لئے اسے تکبیرۃ الاحرام کہتے ہیں۔ اور مستحب ہے کہ تکبیرۃ الاحرام کہتے وقت ہاتھوں کو بلند کریں، اس عمل سے خدائے متعال کی بزرگی کو مد نظر رکھ کر غیر خدا کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیں

۳۔ قیام: تکبیرۃ الاحرام کہتے وقت میں قیام اور قیام متصل بہ رکوع، رکن ہے، لیکن حمد اور سورہ پڑھتے وقت قیام اور رکوع کے بعد والا قیام رکن نہیں ہے اس بناء پر اگر کوئی شخص رکوع کو بھول جائے اور سجدے میں پہنچنے سے پہلے اسے یاد آجائے اسے کھڑا ہونے کے بعد رکوع میں جانا چاہئے، لیکن اگر جھکے ہوئے رکوع کی حالت میں ہی سجدہ کی طرف پلٹے، تو چونکہ قیام متصل بہ رکوع انجام نہں پایا ہے اس لئے اسکی نماز باطل ہے۔

۴۔ رکوع: نمازی کو قرائت کے بعد اس قدر جھکنا چاہئے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں اور اس عمل کو رکوع کہتے ہیں۔ رکوع میں ایک مرتبہ ”سبحان ربی العظیم و بحمدہ“ یا تین مرتبہ ”سبحان اللہ“ کہنا چاہئے۔ رکوع کے بعد مکمل طور پر کھڑا ہونا چاہئے اس کے بعد سجدے میں جانا چاہئے۔

۵۔ سجدہ ”سجدہ“ یہ ہے کہ پیشانی، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنوں اور دونوں پاؤں کے انگوٹھوں کے سرے کو زمین پر رکھے اور ایک مرتبہ ”سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ“ یا ”سبحان اللہ“ تین مرتبہ پڑھے۔ اس کے بعد بیٹھے اور سجدہ میں جا کر مذکورہ ذکر پڑھے۔ جس چیز پر پیشانی رکھتا ہے وہ زمین یا زمین سے اگنے والی چیز ہونی چاہئے، کھانے پینے پوشاک اور معدنی چیزوں پر سجدہ جائز نہیں ہے۔

تہجد و سلام: اگر نماز دور رکعتی ہے، تو دو سجدے بجالانے کے بعد کھڑا ہو جائے اور حمد و سورہ کے بعد قنوت بجالائے پھر رکوع اور دو سجدوں کے بعد تہجد پڑھے پھر سلام پڑھ کر نماز تمام کرے۔

اگر نماز تین رکعتی ہو تو تہجد کے بعد اٹھے اور صرف ایک بار حمد یا تین مرتبہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھے، پھر رکوع، دو سجدے، تہجد اور سلام پڑھے۔ اور اگر نماز چار رکعتی ہے تو چوتھی رکعت کو تیسری رکعت کی طرح بجالا کر، تہجد کے بعد سلام پڑھے۔ ۱۔ حمد و سورہ کے بعد ہاتھوں کو اپنے چہرے کے روبرو بلند کر کے قنوت میں جو بھی ذکر چاہے کہے، مثلاً: ”ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار“

۲۔ تہجد سے مراد یہ ہے کہ ان جملات کو کہے: ”اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ، اللہم صل علی محمد و آل محمد“۔

۳۔ سلام کو اس طرح بجالائے: السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ترجمہ قرآن
Translation Movement

نماز آیات

چار چیزوں کی وجہ سے نماز آیات واجب ہوتی ہے: ۱۔ سورج گھٹن۔

۲۔ چاند گھٹن۔ چاہے کچھ حصے کو گھٹن لگا ہوا ہو کوئی اس سے خوفزدہ بھی نہ ہو۔

۳۔ زلزلہ۔ اگرچہ کوئی نہ ڈرے۔

۴۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اور سیاہ و سرخ آندھی وغیرہ، اس صورت میں کہ اکثر لوگ ڈر جائیں۔

ناز آیات پڑھنے کا طریقہ

ناز آیات دو رکعت ہے اور ہر رکعت میں پانچ رکوع ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان نیت کے بعد تکبیر کے اور حمد اور ایک مکمل سورہ پڑھے پھر رکوع میں جائے، پھر رکوع سے کھڑا ہو جائے، اور دوبارہ حمد اور ایک سورہ پڑھے پھر رکوع بجالائے یہاں تک کہ پانچ مرتبہ رکوع بجالائے اور پانچویں رکوع سے اٹھنے کے بعد دو سجدے بجالائے پھر کھڑے ہو کر دوسری رکعت کو پہلی رکعت کے مانند بجالاکر تشهد اور سلام کے بعد ناز تمام کرے۔

ناز آیات کا دوسرا طریقہ: انسان نیت اور تکبیر اور سورہ حمد پڑھنے کے بعد ایک سورہ کی آیات کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے اس کے ایک حصہ کو پڑھ کر رکوع میں جائے، رکوع سے اٹھ کر سورہ حمد پڑھے بغیر سورہ کا دوسرا حصہ پڑھے اور پھر رکوع بجالائے اور اسی طرح پانچویں رکوع سے پہلے سورہ کو ختم کر کے پھر رکوع بجالائے اس کے بعد دو سجدے بجالائے پھر دوسری رکعت کو پہلی رکعت کے مانند بجالاکر ناز کو ختم کرے۔

مسافر کی نماز

مسافر کو چھ شرائط کے ساتھ چار رکعتی نماز کو دو رکعت پڑھنا چاہئے: ۱۔ اس کا سفر آٹھ فرسخ سے کم نہ ہو یا چار فرسخ جائے اور چار فرسخ واپس آئے۔

۲۔ ابتداء سے آٹھ فرسخ سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

۳۔ راستہ میں اپنے قصد کو نہ توڑے۔

۴۔ اس کا سفر گناہ کے لئے نہ ہو۔

۵۔ سفر اس کا پیشہ نہ ہو۔ پس اگر کسی کا پیشہ سفر ہو (جیسے ڈرائیور) تو اسے نماز پوری پڑھنی چاہئے مگر یہ کہ دس روز اپنے گھر میں رہے، تو اس صورت میں تین بار سفر کرنے پر نماز قصر پڑھے۔

۶۔ حد ترخص تک پہنچ جائے، یعنی اپنے وطن یا دس دن تک قیام کی جگہ سے اس قدر دور چلا جائے کہ شرکی دیواروں کو نہ دیکھ سکے اور اس شرکی اذان کو نہ سن سکے۔

نماز جماعت

مستحب ہے کہ مسلمان ہجگاہ نمازوں کو جماعت کی صورت میں پڑھے اور نماز جماعت کا ثواب فرامی پڑھی جانے والی نماز کے کئی ہزار گنا ہے۔

نماز جماعت کی شرائط

- ۱۔ امام جماعت بالغ، مؤمن، عادل اور حلال زادہ ہونا چاہئے، نماز کو صحیح پڑھتا ہو اور اگر ماموم مرد ہے تو امام کو بھی مرد ہونا چاہئے۔
- ۲۔ امام اور ماموم کے درمیان پردہ یا کوئی اور چیز حائل نہ ہو جو امام کو دیکھنے میں رکاوٹ بنے، لیکن اگر ماموم عورت ہو تو اس صورت میں پردہ یا اس کے مانند کسی چیز کے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
- ۳۔ امام کی جگہ ماموم کی جگہ سے بلند نہ ہو، لیکن اگر بہت کم (چار انگلیوں کے برابر یا اس سے کم) بلند ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔
- ۴۔ ماموم کو امام سے تھوڑا نیچے یا اس کے برابر ہونا چاہئے۔

نماز جماعت کے احکام

۱۔ ماموم حمد و سورہ کے علاوہ ساری چیزیں خود پڑھے، لیکن اگر اس کی پہلی یا دوسری رکعت ہو اور امام کی تیسری یا چوتھی رکعت ہو تو اسے حمد و سورہ کو بھی پڑھنا چاہئے اور اگر سورہ پڑھنے کی وجہ سے امام کے ساتھ رکوع میں نہ پہنچ سکے تو صرف حمد پڑھ کر خود کو رکوع میں امام کے ساتھ پہنچا دے اور اگر نہ پہنچ سکا تو نماز کو فرادی کی نیت سے پڑھے۔

۲۔ ماموم کو رکوع، سجد اور نماز کے دوسرے افعال امام کے ساتھ یا اس سے تھوڑا بعد انجام دینا چاہئے، لیکن تکبیرۃ الاحرام کو قطعاً امام کے بعد کہے۔

۳۔ اگر امام رکوع میں ہو اور اس کی اقتداء کرے اور رکوع میں پہنچ جائے، تو اس کی نماز صحیح ہے اور ایک رکعت حساب ہوگی۔

روزہ

دین مقدس اسلام کے فروع دین میں سے ایک ”روزہ“ ہے۔ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ رکھے یعنی پروردگار عالم کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے صبح کی اذان سے مغرب تک، روزہ کو باطل کرنے والی چیزوں (منفطرات روزہ) سے پرہیز کرے۔

روزہ کو باطل کرنے والی چیزیں

چند چیزیں روزہ کو باطل کرتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں: ۱۔ کھانا اور پینا، اگرچہ اس چیز کا کھانا اور پینا معمول نہ ہو، جیسے مٹی اور درخت رس۔

۲۔ خدا، رسول خدا اور آپ کے جانشینوں (ائمہ ہدیٰ) کی طرف جھوٹ کی نسبت دینا۔

۳۔ غلیظ غبار کو حلق تک پہنچانا۔

۴۔ پورے سر کو پانی میں ڈبو دینا۔

۵۔ قے کرنا اگر عدا ہو۔ دوسرے منفرات روزہ کے بارے میں مراجع کی توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

اسلام میں جہاد

جہاد کے کئی مسائل ہر مخلوق کا اپنی ذات کا دفاع کرنا اور اسی طرح اپنے منافع کا دفاع کرنا ایک عام قانون ہے جو عالم خلقت میں بلا چون و چرا ثابت ہے۔ انسان بھی اپنی حیثیت سے اپنی ہستی اور منافع کا دفاع کرتا ہے اور دوسروں کے مانند دفاع کی توانائیوں سے مسلح ہے تاکہ اپنے دشمن سے مقابلہ کر سکے۔ انسان اپنی خداداد جبلت اور فطرت سے قائل ہے کہ اسے اپنا دفاع کرنا چاہئے اور اپنے اس دشمن کو نابود کر دینا چاہے جو کسی بھی وسیلہ سے اس کو نابود کرنے سے باز نہیں آ رہا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اس کے حیاتی منافع پر قبضہ کرنا چاہے تو اسے دفاع کی غرض سے اٹھنا چاہئے اور ہر ممکن طریقے سے اس کو روکنا چاہئے۔ یہ فطری موضوع جو ایک انسان کی فطرت میں ثابت اور پائدار ہے، اسی طرح انسانی معاشروں میں بھی ثابت و مستحکم ہے۔ یعنی جو دشمن معاشرے کے افراد یا معاشرے کی آزادی کے لئے خطرہ ہو، وہ اس معاشرے کی نظر میں سزائے موت کا مستحق ہے اور جب سے انسان اور انسانی معاشرے میں یہ فکر ان میں ثابت اور برقرار ہے کہ ہر فرد اور معاشرہ اپنے جانی دشمن کے بارے میں ہر قسم کا فیصلہ کر سکتا ہے اور رد عمل دکھا سکتا ہے۔ اسلام بھی۔ جو ایک اجتماعی دین ہے اور توحید کی بنیاد پر استوار ہے۔ حق اور عدالت کے سامنے تسلیم نہ ہونے والوں کو اپنا جانی دشمن جانتا ہے اور انہیں نظام بشریت میں محل جان کر ان کے لئے کسی قسم کی قدر و قیمت اور احترام کا قائل نہیں ہے اور چونکہ خود کو عالمی دین جانتا ہے اس لئے اپنے پیروؤں کے لئے کسی ملک اور سرحدوں کی محدودیت کا قائل نہیں ہے اور جو بھی شرک کے عقیدہ میں مبتلا ہو اور واضح منطق اور حکیمانہ پسند و نصیحت کو قبول نہ کرنا ہو اور حق اور احکام الہی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا ہو، تو اسلام اس کے ساتھ جنگ کرتا ہے تاکہ وہ حق و عدالت کے سامنے ہتھیار

ڈال دے۔ مختصر یہ کہ جہاد کے سلسلہ میں اسلام کے قوانین بھی یہی ہیں اور وہ مکمل طور پر اس روش کے مطابق ہیں جو ہر انسانی معاشرہ کی اپنی فطرت کے مطابق اپنے جانی دشمنوں کے بارے میں ہے۔ اسلام بدخواہ دشمنوں کے پروپیگنڈوں کے باوجود، تلوار کا دین نہیں ہے، کیونکہ اسلام کی روش سلاطین کی روش نہیں ہے کہ جن کی دلیل و منطق صرف تلوار اور سیاسی حربے ہوتے ہیں، بلکہ اسلام ایک ایسا دین ہے، جس کا بانی خدائے متعال ہے، جو اپنے آسمانی کلام میں لوگوں کے ساتھ منطق و عقل کی بنیاد پر بات کرتا ہے اور اپنی مخلوقات کو اس دین کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی فطرت کے مطابق ہے۔

جس دین کی عمومی تختہ سلام ہو اور اس کا عمومی پروگرام قرآن مجید کے نص کے مطابق ”والصلح خیر“ ہو، وہ ہرگز تلوار کا دین نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں، جب اسلام کی نورانیت نے تمام حجاز کو منور کر رکھا تھا اور مسلمان اہم جنگوں اور سخت مقابلوں میں مبتلا تھے، تو اس وقت قتل ہونے والے مسلمانوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہ تھی اور قتل ہونے والے کفار کی تعداد ایک ہزار تک نہیں پہنچی تھی۔ کتنی بے انصافی ہے کہ ایسے دین کو تلوار کا دین کہا جائے۔

اسلام میں جنگ کے موقع

اسلام، جن کے ساتھ جنگ کرتا ہے، وہ حسب ذیل چند گروہ میں: ۱۔ مشرکین: مشرکین یعنی وہ لوگ جو توحید، نبوت اور معاد کے قائل نہیں ہیں۔ ان کو پہلے اسلام لانے کی دعوت دیتا ہے تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ اور بہانہ باقی نہ رہے، دین کے حقائق کو ان کیلئے واضح کر کے تشریح کرتا ہے پس اگر انہوں نے قبول کیا تو دوسرے مسلمانوں کے بھائی اور نفع و نقصان میں برابر ہوں گے، اور اگر قبول نہ کیا اور حق و حقیقت کے واضح ہونے کے باوجود تسلیم نہ ہوئے تو اسلام ان کے مقابلہ میں اپنا دینی فریضہ ”جہاد“ کو انجام دیتا ہے۔

۲۔ اہل کتاب: اہل کتاب ”یہود، عیسائی اور مجوسی میں“ اسلام ان کو صاحب دین اور صاحب کتاب آسمانی جانتا ہے۔ یہ لوگ توحید، نبوت مطلقہ اور معاد کے قائل ہیں ان لوگوں کے ساتھ بھی مشرکین جیسا سلوک کرنا چاہئے، لیکن چونکہ اصل توحید پر عقیدہ رکھتے ہیں

لہذا جزیہ ادا کر کے اسلام کی پناہ میں آسکتے ہیں یعنی اسلام کی سرپرستی کو قبول کریں اور اپنی آزادی کی حفاظت کریں اور اپنے دینی احکام پر عمل کریں۔ تو دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کی جان، مال اور عزت محترم ہوگی اور اسکے عوض میں اسلامی معاشرہ کو کچھ مال ادا کریں گے، لیکن ان کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے، دین کے دشمنوں کی مدد اور دوسرے ایسے کام انجام نہیں دینا چاہئے جو مسلمانوں کے نقصان میں ہو۔

۳۔ بغاوت اور فساد برپا کرنے والے: بغاوت اور فساد برپا کرنے والے یعنی وہ مسلمان جو اسلام و مسلمین کے خلاف مسلحانہ بغاوت کر کے خونریزی کریں، اسلامی معاشرہ ان کے ساتھ جنگ کرتا ہے تاکہ وہ ہتھیار ڈال کر فساد اور بغاوت سے ہاتھ کھینچ لیں۔

۴۔ دین کے دشمن: دین کے دشمن جو دین کی بنیاد کو ویران کرنے یا حکومت اسلامی کو نابود کرنے کے لئے حملہ کریں، تو تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ دفاع کریں اور ان کے ساتھ کافر حربی کا سلوک کریں۔ اگر اسلام اور مسلمین کی مصلحت کا تقاضا ہو تو اسلامی معاشرہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ وقتی طور پر جنگ بندی کا معاہدہ کر سکتا ہے، لیکن یہ حق نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ایسا دوستانہ رابطہ برقرار کرے کہ ان کے گفتار و کردار مسلمانوں کے انگار و اعمال پر منفی اثر ڈال کر انہیں خراب کر دیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ جہاد کے بارے میں اسلام کا عام طریقہ

اسلامی معاشرہ پر فرض ہے کہ اگر جہاد کے شرائط موجود ہوں تو ان کفار سے راہ خدا میں جنگ کریں جن کی سرحد ملی ہوئی ہے، اور ہر مسلمان بالغ، عاقل، صحت مند اور جس کے ہاتھ پاؤں اور آنکھ صحیح و سالم نہ ہوں، پر جہاد واجب کفائی ہے۔ اسلام کے لشکر پر فرض ہے کہ جب دشمن کے ساتھ مقابلہ پر آئے، تو دینی حقائق کو ان کے لئے اس طرح بیان اور واضح کرے کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اور ان کو حق کی طرف دعوت دے اور صرف اس صورت میں جنگ کا اقدام کرے کہ حق کے واضح ہونے کے بعد بھی وہ دین کو قبول نہ کریں۔ اسلام کے سپاہی کو دشمنوں پر پانی بند نہیں کرنا چاہئے اور دشمن پر شب خون نہیں مارنا چاہئے دشمن کی عورتوں، بچوں

ہاتواں بوڑھوں اور دفاع کی قدرت نہ رکھنے والوں کو قتل نہیں کرنا چاہئے، دشمن کے برابر یا دو گنا ہونے کی صورت میں میدان جنگ سے فرار نہ کرے۔ اگر ہم اسلام کے جنگی طریقہ کو ترقی یافتہ ملتوں کے جنگی طریقوں سے موازنہ کریں، جو ہر خشک و تر کو جلا دیتے ہیں اور کسی کمزور اور پچارہ کے حال پر رحم نہیں کرتے، تو واضح ہو جائے گا کہ اسلام کس قدر انسانیت کے اصول کا پابند ہے۔

حکومت قضاوت اور جہاد کیوں مردوں سے مخصوص ہے معاشرے کے حساس ترین اجتماعی امور کہ، جن کی باگ ڈور صرف عقل و استدلال کے سپرد کی جانی چاہئے اور ان میں جذبات و احساسات کی کسی صورت میں مداخلت نہیں ہونی چاہئے، وہ حکومت قضاوت اور جنگ کے شعبے ہیں۔ کیوں کہ مملکت کے امور کو چلانے اور معاشرے میں پیدا ہونے والی دشمنیوں کو حل کرنے میں ہزاروں ناقابل برداشت واقعات اور طرح طرح کی چرمی گوئیوں اور جان، مال، عزت و ابرو کی دھکیوں جیسے گونا گوں مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ جس کو نہایت قوی اور مقتدر مزاج افراد کے علاوہ کوئی طاقت برداشت نہیں کر سکتی کہ اور ان تمام مسائل سے چشم پوشی کر کے صبر نہیں کیا جاسکتا ہے، اور گونا گوں مخالفتوں کے درمیان اجتماعی عدالت کو نافذ نہیں کیا جاسکتا ہے، جو اس عہدہ کا حامل ہو اسے دوست و دشمن، بڑے اور بھلے، چالوس اور بد گوئی کرنے والے اور عالم و جاہل کو ایک نظر سے دیکھنا چاہئے اور اپنے خواہشات نفسانی کے برعکس حکومت کرنی چاہئے اور فیصلہ دینا چاہئے۔ بدیہی ہے کہ جس کے وجود میں جذبات کا غلبہ ہوتا ہے وہ اس کام کو انجام دینے کی توانائیاں نہیں رکھتا ہے۔ جب جذبات حکومت اور قضاوت سے عاجز ہوں گے تو جنگ کے شعبے میں بدرجہ اولیٰ نامناسب ہوں گے کیونکہ دوسرے اجتماعی امور کے برعکس جنگ میں ہر خشک و تر کو جلا دیتے ہیں جنگی سپاہی اور دشمن کے شیر خوار بچے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔

اسلام کا جنگی طریقہ عدالت کی بنیاد پر استوار ہے، البتہ اس قسم کی کا طریقہ جذبات کے غلبہ سے عمل میں نہیں لایا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر جنگ کے وقت جذبات اور ہمدردی کی بنا پر قطب موافق کی طرف مائل ہو تو ضرورت سے زیادہ نرمی اختیار کر کے شکست کھائے گا اور اگر قطب مخالف کی طرف مائل ہو، تو حد سے تجاوز کر کے گنہگار اور بے گناہ کو یکساں سمجھ کر انسانی اصول و ضوابط کو پامال

کرے گا۔ اس سلسلہ میں اسلام کے نظریہ کی حقانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ مغربی ممالک نے مدتوں سے عورتوں کو معاشرے میں مردوں کے دوش بدوش قرار دیا ہے اور تعلیم و تربیت سے ان کی نشوونما کرتے ہیں اور اب تک حکومت کے عہدوں، عدلیہ کے عالی مقامات اور جنگی سرداروں کے عہدوں پر مردوں کے مقابلہ میں عورتوں نے کوئی قابل توجہ ترقی نہیں کی ہے۔ البتہ خانہ داری اور بچوں کی تربیت کے کاموں میں، کہ جن کا سرچشمہ جذبات اور ہمدردی سے ہمیشہ پیش قدم رہی ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے ایک مختصر جملہ میں معاشرے میں عورت کی حیثیت و منزلت کو یوں بیان فرمایا ہے ”فان المرأة ریحانة وليست بقرماتية“

”بیشک عورت ایک خوشبودار پھول ہے نہ سورا“ اور یہ ایک بہترین جملہ ہے جو اسلامی معاشرے میں عورت کی اجتماعی منزلت کی نشاندہی کرتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ عورتوں کے بارے میں نصیحت فرماتے تھے، یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو آخری کلمہ فرمایا اور اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے وہ یہ تھا ”اللہ اللہ فی النساء“^۱ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور مختلف قسم کی سزائیں

اسلام کی حیات و بقا سے مربوط ضرورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے قوانین کی مخالفتوں کو روکا جائے۔ اس ضرورت کو دور کرنے کے لئے دو امور سے استفادہ کیا گیا ہے: ۱۔ سزا کے لئے قوانین کا وضع کرنا، جن کو اسلامی حکومت کے ذریعہ نافذ ہونا چاہئے اور اس طرح شرعی احکام کی مخالفت کو روکا جاسکتا ہے۔

۲۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اسلام نے اپنے تمام پیروں پر واجب کیا ہے کہ جب دیکھیں کہ کسی قانون پر عمل نہیں ہو رہا ہے، تو وہ آرام سے نہ بیٹھیں بلکہ خلاف ورزی کرنے والے کو اطاعت پر مجبور کریں اور اسے نافرمانی کرنے سے روکیں۔ مسلمانوں کے عام افراد، بادشاہ و رعایا، طاقتور و کمزور، مرد و عورت اور چھوٹے بڑے سب اس دینی فریضہ کو نافذ کرنے پر مامور ہیں اور خاص شرائط

^۱ وسائل الشیعة، ج ۱۴، ص ۱۲۰، باب ۸۷۔

^۲ بحار الانوار، ج ۳۲، ص ۵۳۰۔

کے ساتھ اس کام (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کو انجام دینا چاہئے۔ یہ اسلام کے شاہکاروں میں سے ایک شاہکار ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کو روکنے کے لئے، دنیا کے مختلف کورٹ کچری اور تھانوں سے بہتر اور قومی تر ہے۔

اسلام میں فیصلہ

مسائل عدلیہ کے کلیات شرعی طور پر جو صفتیں قاضی میں ہونی چاہئیں، حسب ذیل میں: ۱۔ بالغ

۲۔ عاقل

۳۔ اسلام

۴۔ عدالت۔ یعنی گناہان کبیرہ کو انجام نہ دے اور گناہان صغیرہ پر اصرار نہ کرے۔

۵۔ حلال زادہ

۶۔ علم، یعنی عدلیہ سے مربوط قوانین کو اپنے اجتہاد سے جانتا ہو، اگر دوسرے کے قوی کے مطابق سنائے تو کافی نہیں ہے۔

۷۔ یادداشت۔ یعنی بھولنے والا فیصلہ نہیں دے سکتا ہے۔

۸۔ ینائی۔ اکثر فقہاء کی نظر میں نابینا چ نہیں بن سکتا ہے۔

اگر قاضی میں مذکورہ صفات میں سے کوئی ایک صفت نہیں پائی جاتی ہو تو وہ خود بخود فیصلہ دینے کے منصب سے عزل ہو جاتا ہے۔

قاضی (ج) کے فرائض اسلام کی مقدس شریعت میں، جو فیصلہ دینے کے منصب پر فائز ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل فرائض کا انجام دینا ضروری ہے: ۱۔ لوگوں کے ایک دوسرے کے خلاف دعووں کے بارے میں فقہ کی کتابوں میں موجود قوانین کے

مطابق فیصلہ دینا۔

۲۔ یتیموں اور دیوانوں کی سرپرستی کرنا، اگر ان کے باپ یا دادا نے ان کے لئے کوئی سرپرست معین نہ کیا ہو۔

۳۔ عمومی اوقاف اور مجہول الممالک اموال کی حفاظت کرنا۔

۴۔ احمقوں کے مال کی دیکھ بھال کرنا۔

۵۔ دیوانہ پن اور مفلس ہونے کا حکم جاری کرنا اور حکم جاری کرنے کے بعد مفلس کے مال کی حفاظت کرنا۔

۶۔ خیانت کرنے کی صورت میں وصی کو بدل دینا۔

۷۔ وصی کے ساتھ ایک امین کو بھی رکھنا، جب وصی اکیلے ہی ذمہ داری کو نبھانے سکے۔

۸۔ اگر کوئی اپنا قرض ادا نہ کر سکے تو اسے مہلت دینا۔

۹۔ ممکن ہونے کے باوجود واجب نفقہ دینے سے اجتناب کرنے والوں پر ذمہ داری عائد کرنا۔

۱۰۔ اس کے حوالہ کئے گئے اسناد اور امانتوں کا تحفظ کرنا۔

۱۱۔ شرعی حدود جاری کرنا۔

۱۲۔ شرعاً معین شدہ افراد کو جیل بھیجنے کا حکم جاری کرنا۔

فیصلہ کرنے کی اہمیت

اسلام میں ”قاضی“ کے لئے معین کئے گئے فرائض کی تحقیقات سے فیصلہ کرنے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی لئے قاضی

اپنے فیصلہ میں جذبات سے کام نہیں لے سکتا ہے اور رشوت لینے کا، یہاں تک کہ برحق افراد سے بھی، سخت منع کیا گیا ہے۔ اس

کے علاوہ اسے ان افراد کے درمیان فرق نہیں کرنا چاہئے جو اس کے پاس رجوع کرتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام ”مالک اشتر“ کے نام لکھے گئے ایک حکم نامہ میں فیصلہ کے بارے میں فرماتے ہیں ”لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرنا جو دعویٰ دائر کرنے والوں کے رجوع کرنے سے تھک کر دل تنگ نہ ہو جائے اور کاموں کی رسیدگی میں مکمل طور پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا ہو اور امور کے بارے میں فیصلہ دینا اس کے لئے مشکل نہ ہو۔“

دعویٰ کرنے والے اسے خوار اور حقیر نہ سمجھیں امور کے مشکلات کے بارے میں تحقیقات اور دقت کرے اور کسی کام کو سرسری طور پر انجام نہ دے، اگر کیس اس کے لئے واضح ہے تو لوگوں کی چابکدستی، دھکی اور طمع و لالچ دلانے کے اثر میں نہ آئے اور حکم الہی کو کسی شک و شبہ کے بغیر اٹھا کر کے نافذ کرے اور لوگوں کے مال پر طمع کرنے سے پرہیز کرے، چونکہ اس قسم کے لوگ کم پائے جاتے ہیں اس لئے ان کی اہم اور بنیاد ذمہ داری کے پیش نظر مناسب تنخواہ معین کرے تاکہ وہ اپنی آبرو مند زندگی میں دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور رشوت لینے کے لئے کوئی بہانہ باقی نہ رہے اور انہیں فیصلہ سنانے کی آزادی دینا تاکہ دوسروں کی بد گوئی اور چالبازیوں سے محفوظ رہیں۔“

ترجمہ
Translation Movement

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا کہ استدلال کی قدرت مرد میں اور جذبات کی قدرت عورت میں زیادہ ہوتی ہے اس لئے اسلام میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (والمستشهدون مع الشہیدین من رجالکم فان لم یکونوا رجليں فامرأتان متینتان یرضون من الشہداء ان تفضل احدہما فتدکر احدہما الاخریٰ...) ”اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بناؤ اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں تاکہ ایک بہکنے لگے تو دوسری یاد دلادے۔“

تہا وہ عام راستہ کہ جس کے ذریعہ تمام حالات میں حوادث پر قابو پایا جاسکتا ہے، گواہی کو برداشت کرنا اور اس کو انجام دینا ہے اور دوسرے وسائل جیسے ”لکھنا“، اور ”فنی وسائل“، جو حوادث کو ضبط کرنے اور شکل و اعتراف کو استحکام بخشنے کے لئے فراہم کئے گئے ہیں، عام نہیں ہیں اور انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ اس لئے، اسلام نے اس بہت سادہ اور طبعی وسیلہ کو اہمیت دی ہے اور حکم دیا ہے کہ لوگ اس راستہ سے حوادث پر قابو حاصل کریں اور ضرورت کے وقت گواہی دیں۔

۱۔ بالغ ہو، اس بنا پر نابالغ بچے کی گواہی قبول نہیں ہے، صرف جو بچہ دس سال کی عمر تک پہنچا ہو، اگر اس نے گناہ نہ کیا ہو، تو وہ زخم لگانے کے بارے میں گواہی دے سکتا ہے۔

٢٨٢ بقره

۳۔ مسلمان ہو، لیکن اگر وصیت کرتے وقت مسلمان گواہ تک رسائی ممکن نہ ہو تو کافر ذمی (اہل کتاب جو اسلام کی پناہ میں ہو) کی گواہی قابل قبول ہے۔

۴۔ عادل ہو، پس فاسق اور جھوٹی گواہی دینے والے کی گواہی قبول نہیں ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کر کے اس پر ثابت قدم رہے۔

۵۔ حلال زادہ ہو، اس لحاظ سے حرام زادہ کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

۶۔ اس پر الزام نہ ہو، اس بنا پر اس شخص کی گواہی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے جو دعوے کے موضوع میں غرضمند ہو۔

۷۔ یقین رکھتا ہو، اس بنا پر جو حدس و یقین جس کے طریقہ سے حاصل نہ ہوا ہو، اس پر گواہی نہیں دی جاسکتی ہے اور اگر جھوٹی گواہی کی وجہ سے کسی کے نقصان میں کوئی حکم جاری ہوا ہو، تو گواہ ضامن ہے اور اس کی تنبیہ کی جانی چاہئے اور اس کے جھوٹ کو بھی لوگوں میں اعلان کرنا چاہئے۔

اقرار

اقرار کی اہمیت: معاشرے میں پامال اور ضائع ہونے والے حقوق کو زندہ کرنے کے بارے میں ”اقرار“ کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ کیونکہ عدلیہ جس کا کام اتہابی تلاش و کوشش، دلائل کو جمع کرنے کے لئے محنت و مشقت، قرائن، گواہوں کی گواہی اور حدس و اندازہ سے انجام دیتی ہے، اے ”اقرار“ کے ذریعہ آسان ترین اور واضح ترین صورت میں دو جملوں میں انجام دیا جاتا ہے۔

اسلام میں انفرادی نقطہ نظر سے بھی اقرار کی بہت اہمیت ہے، کیونکہ اقرار کا سرچشمہ وہ فطرت ہے کہ اسلام کی تمام سعی و کوشش اس کو زندہ کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں صرف ہوتی ہے اور وہ ایک ایسے انسان کی حق پرستی کی فطرت ہے جس کے مقابلہ میں ہوا و ہوس پرستی قرار پائی ہے۔

خدا نے تعالٰیٰ اپنے کلام پاک میں پیرواں اسلام سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے: (یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین) ”اے ایمان والو! عدل و انصاف کے ساتھ قیام کرو اور اللہ کے لئے گواہ بنو چاہے اپنی ذات یا اپنے والدین اور اقربا ہی کے خلاف کیوں نہ ہو۔“

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ”حق بات کہو اگرچہ اپنے نقصان میں ہو۔“

اقرار کے معنی اور اس کی شرائط

”اقرار“ شرع و شریعت میں ایک ایسا قول ہے کہ کہنے والا دوسرے کا حق اپنے اوپر ثابت کرتا ہے، جیسے کہتا ہے: ”میں ایک ہزار روپے کا فلاں شخص کا مقروض ہوں۔“ اقرار کرنے والے کے لئے بالغ، عاقل اور صاحب اختیار ہونا شرط ہے، اس بناء پر بچہ، دیوانہ، مست، یہوش، سوئے ہوئے اور مجبور شخص کا اقرار صحیح نہیں ہے۔

شفعہ

اگر دو آدمی، دو گھریا کسی اور ملکیت کے مشترک مالک ہوں اور ان میں سے ایک اپنے حصہ کو کسی تیسرے شخص کے ہاتھ بیچ دے، تو اس کا دوسرا شریک حق رکھتا ہے کہ اسی عقد اور اسی قیمت پر اس کے حصہ کو لے لے، اس حق کو ”شفعہ“ کہتے ہیں۔ واضح ہے کہ اسلام میں یہ حق کمپنیوں کے توہیہ اور شرکاء کے تصرفات کی وجہ سے رونما ہونے والے نقصانات اور خرابیوں کو دور کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اکثر یہ اتفاق پیش آتا ہے کہ ملکیت میں تازہ شریک کے تسلط سے صاحب شفعہ کو نقصان پہنچتا ہے، یا سلیتوں میں اختلاف کی وجہ سے اختلافات اور کشیدگیوں کا ایک سلسلہ وجود میں آتا ہے، یا مالکیت میں آزادی (صاحب شفعہ) شریک کے لئے وثی فائدہ رکھتی ہو، بنیبر اس کے کہ بیچنے والے شریک کے لئے کوئی نقصان ہو۔

شفعہ، زمین، گھر، باغ اور دیگر غیر منقولہ اموال کے لئے ثابت ہے اور منقولہ اموال میں شفعہ نہیں ہے۔

^۱ نساء، ۱۳۵

^۲ میزان الحکمة، ج ۲، ص ۴۶۸۔

مرد اور عورت کا طبقہ

خالق کائنات نے نوع بشر کو دوسرے جاندار مخلوقات کے مانند نرمادہ میں تقسیم کیا ہے اور اس طرح اس نوع کی بقاء کا تہا صامن تناسل و تولد کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ مرد اور عورت اس کے باوجود کہ نسل پھیلانے کے لئے دو مختلف نظاموں سے مسلح ہیں، ان میں سے ہر ایک ایک انسان کی مکمل فطری توانائیاں رکھتا ہے اور یہ انسان کی ذاتی خصوصیتوں میں بھی برابر ہیں۔ ان دونوں صنفوں کی تہا خصوصیت جو سماج میں جداگانہ امتیازات کا سرچشمہ ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ: مرد کی صنف میں غور و خوض کی خاصیت زیادہ قوی ہوتی ہے اور عورت کی صنف میں جذبات اور ہمدردیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور انہی خصوصیات کی وجہ سے، معاشرے میں ان دونوں میں سے ہر ایک نے مخصوص فرائض کو اپنے ذمہ لیکر معاشرہ کو چلاتے ہیں۔ اگر یہ اپنی ذمہ داریوں سے ہاتھ کھینچ لیں تو معاشرہ ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔

اسلام نے جو احکام ان دو صنفوں کے لئے وضع کئے ہیں، ان میں کلی طور پر ہر ایک کی صنفوں اور خصوصیتوں کو مد نظر رکھا گیا ہے اور مشترک قوانین میں اسی نوعی اشتراک کو مد نظر رکھ کر ان دونوں صنفوں کو حتی الامکان نزدیک لایا گیا ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ اسلام نے اپنی حقیقت بینی کی بنا پر، ان دو صنفوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے کیسے موثر قدم اٹھائے ہیں اور بالخصوص عورتوں کے حالات میں بہتری اور آسودگی لانے کے لئے کیسے قوانین بنائے ہیں، ہمیں اسلام سے قبل عورتوں کے عام حالات سے آگاہ ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں ایک تحقیق کریں اور ماضی کے ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ معاشروں میں جو برتاؤ عورتوں کے ساتھ ہوتا تھا اسے مد نظر رکھیں پھر عورتوں کے بارے میں اسلام کے وضع کئے گئے قوانین کی تحقیق کریں۔

اسلام سے پہلے معاشرے میں عورت

الف: قبائلی معاشرے میں عورت قدیم ملتوں میں جب ان کا طرز زندگی قانونی یا دینی نہیں تھا اور صرف قومی آداب و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے تو عورت انسان شمار نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے ساتھ ایک پالتو جانور جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ انسان جب

آغاز سے پالتو جانوروں کو یکے بعد دیگرے اپنا اسیر بنا کر ان کی تعلیم و تربیت کرتا تھا، ان کی حفاظت اور ان کی زندگی کے لئے بے پناہ محنت کرتا اور رنج و تکلیف اٹھاتا تھا، تو یہ سب اس لئے نہیں تھا کہ انہیں انسانیت کی حیثیت سے پہچانے یا انہیں اپنے معاشرے کا ایک عضو قرار دے اور ان کے لئے کچھ حقوق کا قائل ہو جائے بلکہ وہ ان کے گوشت، کھال، ہاؤن، دودھ، سواری، سامان ڈھونے اور دیگر فوائد سے بہرہ مند ہونے کے لئے تھا۔ اس لئے ان جانوروں کی بقاء اور زندگی کے لئے کچھ وسائل جیسے خوراک اور رہائش وغیرہ فراہم کرتا تھا، لیکن یہ محنت و مشقت ان کے ساتھ ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنے فائدے کے لئے ہوتی تھی۔

انسان ان جانوروں کا دفاع کرتا تھا اور اجازت نہیں دیتا تھا کہ کوئی انہیں مار ڈالے یا انہیں اذیت پہنچائے اور اگر کوئی ان پر تجاوز کرتا تو وہ اس سے انتقام لیتا تھا، لیکن یہ سب اس لئے تھا کہ خود کو ان کا مالک جانتا تھا اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا چاہتا تھا نہ یہ کہ ان حیوانات کے لئے کسی حق کا قائل تھا۔ عورت کو بھی اسی طرح اپنے استفادہ کے لئے چاہتا تھا۔ عورت کی معاشرے میں رکھوالی کرتا تھا اور اس کا دفاع کرتا تھا، جو اس پر تجاوز کرتا اسے سزا دی جاتی تھی،

لیکن نہ اس لئے کہ وہ انسان ہے یا معاشرے کا عضو شمار ہوتی ہے یا کسی حق و احترام کی حقدار ہے بلکہ اس لئے کہ زندہ رہے اور مرد کے جنسی خواہشات کا کھلونا بنی رہے اور اہل خانہ یعنی مردوں کے لئے کھانا پکائے اور تیار کرے، ساحل نشین قوموں کے لئے مچھلی پکڑے، سامان ڈھونے، گھر کا کام کرے اور ضرورت کے وقت بالخصوص قحط سالی اور مہمان نوازی کے موقع پر اس کے گوشت سے غذا تیار کی جائے۔ باپ کے گھر میں بھی عورت کی یہی حالت تھی یہاں تک کہ اسے شوہر کے حوالہ کیا جاتا تھا، لیکن نہ اس کے اپنے اختیار و انتخاب سے بلکہ ماں باپ کے حکم سے وہ بھی ایک قسم کا بچہ تھا نہ کہ ازدواج ہمد و پیہمان۔ عورت باپ کے گھر میں باپ کے ماتحت اور شوہر کے گھر میں شوہر کے ماتحت اور اس کی تابع ہوتی تھی اور ہر حالت میں صاحب خانہ کے زیر نظر اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتی تھی۔ صاحب خانہ اسے بچہ سمجھتا تھا یا اسے کسی کو بخش سکتا تھا یا دوسرے مقاصد کے لئے جیسے عیاشی یا بچہ پیدا کرنے یا خدمت کرنے کے لئے عادیہ قرض یا کرایہ پر دوسروں کو دے سکتا تھا اگر اس سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہوتی تو اسے ہر

طرح کی سزا دینے کا حق تھا، یہاں تک کہ قتل تک کر سکتا تھا، اور اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا تھا

-

ب۔ عورت ترقی یافتہ سلطنتی معاشرے میں ترقی یافتہ سلطنتی معاشرہ، جیسے ایران، مصر، ہندوستان اور چین کے جو وقت کے بادشاہوں کی مرضی پر چلتا تھا اور اسی طرح متمدن معاشرہ جیسے کلدہ، روم اور یونان جہاں کے لوگ قانونی حکومت کی زندگی بسر کرتے تھے، اگرچہ عورت کی حالت دوسرے معاشروں سے بہتر تھی اور کئی طور پر مالکیت سے محروم قرار نہیں دی جاتی تھی، لیکن پھر بھی مکمل آزادی نہیں رکھتی تھی جس گھر میں عورت زندگی گزارتی تھی اس کا سرپرست جیسے باپ، بڑا بھائی یا شوہر اس پر مطلق حکومت کرتا تھا۔ یعنی اسے حق ہوتا تھا کہ جس کے ساتھ چاہے اس کا عقد کرے یا عادت و کرایہ پر دیدے یا کسی کو بخش دے اور خاص کر (خطا سرزد ہونے پر) اسے قتل کر سکتا تھا یا گھر سے نکال سکتا تھا۔

بعض ملکوں میں عورت فطری رشتہ داری سے محروم تھی اور مرد اپنی محرم عورتوں سے شادی کر سکتا تھا۔ بعض دوسرے ممالک میں، عورت باضابطہ اور قانونی رشتہ دار شمار نہیں ہوتی تھی، اور میراث کی حقدار نہیں ہوتی تھی۔

بعض جگہوں پر کئی مرد ایک عورت سے شادی کرتے تھے اور زمانہ جاہلیت میں بعض عرب قومیں اپنی بیٹیوں کو زندہ دفناتے تھے، عورت کو منحوس جانتے تھے۔ اگر اس پر کوئی زیادتی اور ظلم ہوتا تو اسے عدالت میں جا کر شکایت کرنے اور اپنا دفاع کرنے کا حق نہیں تھا اور اسے گواہی دینے کا حق بھی نہیں تھا۔ خلاصہ یہ کہ اس معاشرے میں عورت ایک کمزور عضو شمار ہوتی تھی جسے مرد کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنا ہوتی تھی۔ اسے ہرگز اپنے ارادہ سے فیصلہ کرنے، کام اور پیشہ کے انتخاب میں آزادی نہیں تھی۔ بلکہ ایک چھوٹے بچے کے مانند تھی جسے بالغ ہونے تک کسی کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنا پڑتی ہے فرق صرف یہ تھا کہ یہ عورت کبھی بالغ نہیں ہوتی تھی! عورت ایک جنگلی اسیر کے مانند تھی کہ جب تک آزاد نہ ہو جائے دشمن کی غلامی میں رہتا ہے اور اس کے کام

وکوشش سے استفادہ کیا جاتا ہے، اس کے مکروفریب سے ہوشیار رہتے ہیں، فرق یہ تھا کہ عورت کو اس اسیری سے آزاد ہونے کی کبھی امید نہیں ہوتی تھی۔

ج: عورت دینی معاشرہ میں: دینی معاشروں میں بھی عورت پر جو کچھ دوسرے معاشروں میں گزرتی تھی۔ کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا اور اس کے لئے کسی قسم کے حق کے قائل نہ تھے۔ یہودیوں کی موجودہ تورات نے عورت کو موت سے زیادہ تلخ بتایا ہے اور کمال سے مایوس ٹار کیا ہے۔ رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے فرانس میں عیسائی پادریوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا، جس میں عیسائی پادریوں نے عورتوں کی حالت پر مفصل بحث و تحقیق کے بعد حکم صادر کیا کہ ”: عورت ایک انسان ہے لیکن مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔“ ان تمام معاشروں میں، اولاد باپ کی تابع ہوتی تھی نہ ماں کی اور ان کے نسب کی بنیاد باپ سے تشکیل پاتی تھی نہ ماں سے، صرف چین اور ہندوستان کی چند جگہوں پر کئی شوہر کرنے کا رواج تھا، بچے ماں کے تابع ہوتے تھے اور ان کے نسب کی بنیاد مائیں تشکیل دیتی تھیں۔

خلاصہ

اسلام سے پہلے پوری دنیا میں تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی معاشروں میں، عورت کو معاشرے کا ایک سرگرم عضو شمار نہیں کیا جاتا تھا اور وہ استقلال و آزادی کی مستحق نہیں تھی اور ہمیشہ ایک کمزور اور محکوم مخلوق شمار ہوتی تھی اور وہ خود بھی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی انسانی خصلتوں کو کھو کر کے اپنے لئے کسی قسم کی اجتماعی شخصیت کو تصور نہیں کر سکتی تھی۔

لفظ ”عورت“، ذلت، خواری پستی اور بیوقوفی کے معنی دیتا تھا۔ ہر زبان کے ادبیات کے نظم و نثر میں عورت کے بارے میں بہت سی ناشاریتہ باتیں اور خرافات پائے جاتے ہیں جو ماضی کے معاشروں میں عورت کے بارے میں روار کھے جانے والے نظریہ کی عکاسی کرتے ہیں۔

عورت کے بارے میں اسلام کا نظریہ

جس دن اسلام کا سورج بشریت کے افق پر طلوع ہوا، اس وقت عورت کی سماجی حالت وہی تھی جو خلاصہ کے طور پر بیان کی گئی۔ اس زمانہ کی دنیا میں عورت کے بارے میں چند غلط اور خرافات پر مشتمل اٹھار اور ظالمانہ طرز عمل کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ لوگ (حتیٰ خود عورت کا طبقہ) عورت کے لئے کسی مقام یا حق کے قائل نہیں تھے اور اسے ایک پست مخلوق سمجھتے تھے جو شریف انسان (مرد) کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اسلام نے پوری طاقت کے ساتھ ان اٹھار کی مخالفت کی اور عورت کے لئے حسب ذیل حقوق مقرر فرمائے: ۱۔ عورت ایک حقیقی انسان ہے اور انسان کے نرمادہ جوڑے سے پیدا کی گئی ہے اور انسان کی ذاتی خصوصیات کی حامل ہے اور انسانیت کے مفہوم میں مرد کو اس پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (یا ایہا الناس انا خلقکم من ذکر و انثیٰ) ”انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے“۔ کئی دوسری آیتوں میں فرماتا ہے: (بعضکم من بعض) ”تم سب ہم جنس ہو“۔

۲۔ عورت مرد کے مانند معاشرہ کا عضو ہے اور قانونی شخصیت کی مالک ہے۔

۳۔ عورت چونکہ فطری رشتہ دار ہے اسلئے سرکاری اور قانونی طور پر بھی رشتہ دار ہے۔

۴۔ بیٹی، اولاد ہے جس طرح بیٹا اولاد ہے، اسلئے بیٹیاں بیٹوں کی طرح اولاد ہیں، اس لحاظ سے عورت بھی مرد کی طرح اپنے سہمی اور نبی رشتہ داروں جیسے باپ اور ماں سے میراث پاتی ہے۔

۵۔ عورت فکری آزادی کی مالک ہے اور اپنی زندگی میں ہر قسم کا فیصلہ کر سکتی ہے اور شرعی حدود میں اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے شوہر منتخب کر سکتی ہے اور باپ یا شوہر کی ولایت اور سرپرستی میں رہے بغیر آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہے اور ہر جائز

پیشہ کو منتخب کر سکتی ہے۔ عورت عمل کے میدان میں مستقل ہے اور اس کا کام اور کوشش محترم ہے اور وہ مالک بن سکتی ہے اور اپنی دولت و ثروت کو مرد کی سرپرستی اور مداخلت کے بغیر تصرف کر سکتی ہے اور اپنے انفرادی و اجتماعی مال اور حقوق کا دفاع کر سکتی ہے اور دوسروں کے حق میں یا خلاف گواہی دے سکتی ہے۔ وہ جنسی آمیزش کے مسئلہ کے علاوہ (جس میں ازدواجی زندگی کے معاہدہ کے مطابق اپنے شوہر کی اطاعت کرنا ضروری ہے) اپنے شوہر کے لئے کوئی دوسرا کام انجام دے تو وہ قابل قدر ہے۔

۶۔ مرد کو عورت پر حکم چلانے اور ظلم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور ہر ظلم جو مردوں کے بارے میں مقدمہ چلا کر قابل سزا ہے وہ عورتوں کے بارے میں بھی مقدمہ چلانے اور سزا دینے کے قابل ہے۔

۷۔ عورت معنوی و دینی شخصیت کی مالک ہے اور اخروی سعادت سے محروم نہیں ہے، وہ ایسی نہیں ہے جیسا کہ اکثر ادیان اور مذاہب عورت کو ایک شیطان کے مانند رحمت خداوندی سے مایوس تصور کرتے ہیں۔ خدائے متعال اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے: (من عمل صلیحاً من ذکر او انثی و ہو مؤمن فلیخیمہ حیوۃ طیۃ و لجزینہم اجر ہم باحسن ما کانوا یعملون^۱) ”جو شخص بھی نیک عمل کرے گا وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے اور انہیں ان اعمال سے بہتر جزا دیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے ہیں“ (یٰٰنّٰی لّا ضیّع عمل عامل منکم من ذکر او انثی ۛ) ”میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت“ ۛ درج ذیل آیہ شریفہ کے مطابق ممکن ہے ایک عورت تقویٰ اور دین کی بدولت ہزاروں مردوں پر امتیاز اور فوقیت حاصل کرے: (یاٰہنّا الناس انا خلّقکم من ذکر و انثی و جعلکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اکثم^۲) ”اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں

^۱ نحلہ ۹۷

^۲ آل عمران ۱۹۵

^۳ حجرات ۱۳

تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔“

نکاح

نکاح کے مسائل اور احکام

اسلامی تعلیمات میں نکاح اور ازدواجی زندگی کے موضوع کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کی اہمیت اس حد تک ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: نکاح میری سنت ہے اور جو بھی میری سنت پر عمل نہ کرے، اے اپنے آپ کو مجھ سے نسبت نہیں دینی چاہئے اور وہ اپنے آپ کو مسلمان شمار نہ کرے!۔

نکاح کے احکام

دین اسلام میں نکاح کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ ”دائم نکاح“ یہ وہ نکاح ہے کہ عقد جاری ہونے کے فوراً بعد میاں بیوی کا رشتہ ہمیشہ کے لئے برقرار ہو جاتا ہے۔ یہ رشتہ صرف طلاق کے ذریعہ توڑا جاسکتا ہے۔ اس ازدواج میں مرد کو مہر کے علاوہ بیوی کی حیثیت کے مطابق اس کی زندگی کے اخراجات ادا کرنے ہوتے ہیں اور کم از کم چار راتوں میں سے ایک رات کو اس کے ساتھ گزارے بیوی اس سلسلہ میں شوہر کے تقاضا کو مسترد نہیں کر سکتی ہے۔

۲۔ موقت نکاح جسے ”متعہ“ کہا جاتا ہے۔ یہ نکاح ایک محدود اور معین مدت کے لئے میاں بیوی کے درمیان رابطہ کو پیدا کرتا ہے اور جوں ہی مدت ختم ہوئی یا مرد نے باقی مدت کو بخش دیا تو طلاق کے بغیر میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس ازدواج میں نکاح دائم کے احکام میں سے کوئی حکم نہیں پایا جاتا ہے بلکہ یہ کہ عقد کے وقت شرط کی گئی ہو۔

نوٹ: نکاح موقت ”متعہ“ اسلام میں جائز ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھا یہاں تک کہ دوسرے خلیفہ نے بعض وجوہات کی بنا پر اس پر پابندی لگا دی، اس لئے اہل سنت اسے جائز نہیں جانتے، لیکن شیعوں کے نزدیک جائز ہے اور اسے اسلام کے شاہکاروں میں سے ایک جانتے ہیں، کیونکہ معاشرے کی ضرورتوں کے ایک اہم حصہ کو جس کو دوسرے راستہ سے روکنا ممکن نہیں ہے دور کرتا ہے اور عمومی غنت کا بہترین حامی اور ضامن ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ”اگر موقت نکاح کو ممنوع نہ قرار دیا گیا ہوتا تو شقی اور بد بخت کے علاوہ کوئی زنانہ کرتا“^۱

جن کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے

اسلام میں بعض عورتوں کے ساتھ رشتہ داری اور نبی رشتہ کی وجہ سے نکاح کرنا حرام اور ممنوع ہے، اور وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ ماں، دادی، نانی اور جتنا سلسلہ اوپر چلا جائے۔

۲۔ بیٹی، نواسی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

۳۔ پوتی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

۴۔ بہن، بھانجی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

۵۔ بھتیجی، بھتیجی کی بیٹی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

۶۔ پھوپھی

۷۔ خالہ

نوٹ: جو عورتیں نبی رشتہ کی وجہ سے مرد پر حرام ہیں وہی عورتیں ایک شیر خوار بچہ کو دودھ پلانے سے حرام ہو جاتی ہیں۔ بعض

^۱ وسائل الشیعہ، ج ۱۴، ص ۴۳۶، باب متعہ۔

عورتیں سہی رشتہ (دامادی) کی وجہ سے مرد پر حرام ہو جاتی ہیں، وہ حسب ذیل میں: ۱۔ بیوی کی ماں اور اس کی دادی ونانی اور جتنا سلسلہ اوپر چلا جائے۔

۲۔ بیوی کی بیٹیاں، اگر مرد نے اس بیوی سے ہمبستری کی ہو۔

۳۔ باپ کی بیوی، اگرچہ باپ نے اس کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی ہو۔

۴۔ بیٹے کی بیوی، اگرچہ بیٹے نے اس کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی ہو۔

۵۔ بیوی کی بہن۔ جب تک بیوی زندہ اور مرد کے عقد میں ہو۔

۶۔ بیوی کی بھتیجی اور بھانجی، جبکہ بیوی سے اجازت نہ لی ہو، لیکن بیوی کی اجازت سے حرام نہیں ہیں۔ بعض عورتیں دوسرے وجوہات سے مرد پر حرام ہو جاتی ہیں:

۱۔ شادی شدہ عورت۔

۲۔ پانچویں عورت، جس مرد کے چار دائمی عقد والی بیویاں ہوں۔

۳۔ کافر عورت، لیکن یہودی اور عیسائی کے مانند اہل کتاب ہو تو اس کے ساتھ موقت عقد کیا جاسکتا ہے۔

عقد کا ولی

دین اسلام میں، مرد اور عورت اگر بالغ ہوں تو اپنا شریک حیات انتخاب کرنے میں آزاد و مستقل ہیں۔ لیکن نابالغ بیٹی اور بیٹے کے ولی ان کے باپ ہیں، اس معنی میں کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا عقد کسی لڑکے سے کر سکتا ہے اور اپنے نابالغ بیٹے کا عقد کسی لڑکی سے کر سکتا ہے۔

اولاد کے حقوق اور تبعیت

۱۔ اگر شادی شدہ عورت سے کوئی بچہ پیدا ہو تو یہ بچہ اس کے شوہر کا ہے چنانچہ وہ بچہ دائمی بیوی ہو تو شوہر اپنا بچہ ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔ اگر بچہ اپنی زندگی کا خرچ پورا نہ کر سکتا ہو، تو اسکے ماں باپ کو اس کے اخراجات کو پورا کرنا چاہئے اور چنانچہ ماں باپ اپنے اخراجات پورے نہ کر سکتے ہوں تو ان کے اخراجات ان کے فرزند کے ذمہ ہیں۔

اسلام میں متعدد بیویاں

شریعت اسلام کے مسلمات میں سے ہے کہ مرد ایک ساتھ چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس حکم کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے درج ذیل نکات پر توجہ کرنا ضروری ہے : ۱۔ یہ حکم اختیاری احکام میں سے ہے اور واجبی و حتی حکم نہیں ہے یعنی مسلمان مرد پر واجب نہیں ہے کہ چار بیویاں رکھے بلکہ ایک ہی وقت میں دو یا تین یا چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے میں شرط یہ ہے کہ ان کے درمیان عدالت کی رعایت کرے اور یہ کام بہت مشکل ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے اس کام کے لئے قدم اٹھانا اپنے لئے استثناء حالت پیدا کرنا ہے۔

۲۔ بشر کی ضرورتوں میں سے ایک تناسل و تولد اور آبادی بڑھانا ہے۔ خالق کائنات نے اسی غرض سے انسان کو مرد اور عورت میں تقسیم کیا ہے۔ اسلام بھی چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے انسان کی ضرورتوں کو مد نظر رکھا ہے اسی لئے ازدواج کا حکم دیا ہے اور چونکہ مرد اور عورت میں تناسل اور تولد صلاحیت کے لحاظ سے، فرق ہے، اس لئے متعدد شادیاں جائز کی ہیں۔

اب ہم اختلاف کی علتیں بیان کرتے ہیں : الف: کبھی طور پر عورت نوسال کی عمر میں ازدواج کی صلاحیت پیدا کرتی ہے جبکہ مرد کے لئے یہ استعداد پندرہ سال میں پیدا ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر اگر ہم کسی معین سال کو مد نظر رکھ کر لڑکے اور لڑکیوں کی ولادت کو

(اکثر لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ ہوتی ہیں) درج کریں گے اور بعد والے سالوں کی ولادتوں کو اس پر اضافہ کریں گے تو سو لمبوں سال ہر لڑکا جواز دواج کی شرعی صلاحیت پیدا کرے گا اس کے مقابلہ میں سات لڑکیاں ازدواج کی صلاحیت پیدا کریں گی۔ اگر لڑکوں کے ازدواج کی عمر جو معمولاً بیس سال سے اوپر ہے، کو مد نظر رکھیں، تو اکیسویں سال میں ہر ایک لڑکے کے مقابلہ میں دو لڑکیاں شادی کے لائق ہوں گی اور پچیسویں سال میں کہ عام طور پر شادی اسی عمر میں کر دی جاتی ہے۔ ہر دس لڑکوں کے مقابلہ میں سولہ لڑکیاں شادی کے لائق ہو جائیں گی۔ ب۔ عورت غالباً پچاس سال کی عمر میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کھودیتی ہے جبکہ مرد اپنی طبعی عمر کے آخری دنوں تک یہ صلاحیت رکھتا ہے۔

ج۔ اعداد و شمار کے مطابق نوزاد لڑکوں کی موتیں نوزاد لڑکیوں سے زیادہ ہوتی ہیں اور عورتوں کی اوسط عمر مردوں کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ گوناگوں عوامل کی وجہ سے عورتوں کی نسبت مردوں میں موتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح (اعداد و شمار کے مطابق) مرد کی عمر غالباً عورت کی عمر سے کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرہ میں ہمیشہ بیوہ عورتیں بیوی کے بغیر مردوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اس بات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں متعدد شادیوں کی رسم صدیوں تک باقی تھی اور باوجود اس کے کہ بعض لائابالی اور فائدہ عدالت مردوں نے بھی یہ کام انجام دیا ہے، لیکن کبھی کوئی مکمل یا عورتوں کی کمی کا مسئلہ پیش نہیں آیا ہے۔ کہتے ہیں: چونکہ متعدد شادیوں کا مسئلہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے، چوں کہ اس کے جذبات کو مجروح کرتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اسے انتقام لینے پر مجبور کرتا ہے اور مرد کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

ایسا سوچنے والوں نے اس حقیقت میں غفلت برتی ہے کیونکہ مذکورہ مخالفت عادت سے مربوط ہے نہ اسکی فطرت اور طبیعت سے، کیونکہ اگر اس کی بنیاد فطرت پر ہوتی تو متعدد شادیوں کا کام علا کبھی وقع ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ جو عورتیں کسی مرد کی دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی بنتی ہیں، وہ عورتوں کے اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جو کہ اپنی مرضی اور رغبت سے شادی شدہ کسی مرد سے شادی کرنے پر آمادہ ہوتی ہیں۔

اگر یہ کام انکی فطری اور طبعی جذبات کے خلاف ہوتا، تو ہرگز ایسی چیز کو قبول نہ کرتیں، چنانچہ اگر ازدواج میں کسی عورت سے یہ شرط کی جائے کہ اسے تہا زندگی گزارنا ہوگی اور کسی سے بات نہیں کرے گی، تو چونکہ یہ کام اسکی فطرت کے خلاف ہے، اس لئے ہرگز وہ اس شرط کو قبول نہیں کرے گی۔ اسکے علاوہ دین اسلام میں اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ایک راستہ موجود ہے، وہ یہ کہ عورت ازدواج کے وقت عقد لازم کے ضمن میں شرط رکھ سکتی ہے کہ اس کا شوہر دوسری شادی نہ کرے اور اس طرح اس کا سد باب کر سکتی ہے۔ اولاد کی میراث کا مسئلہ بھی دوسری صورت میں منظم کیا جاسکتا ہے، مثلاً حکومت کو مرد کا وارث قرار دیں اور معاشرے کے فرزندوں اور نوزاد بچوں کی تربیت حکومت کے ذمہ چھوڑ کر بچوں کو پرورش گاہ اور نرسریوں میں پالا جائے۔

اگرچہ یہ طریقہ انسانی معاشروں میں استثنائی طور پر انجام پاتا ہے، لیکن ایک ناقابل تغیر قانون کی حیثیت سے جاری رہنے کی ہرگز صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ یہ طرز عمل، مختصر زمانہ میں، انسانی جذبات، غمخواری، مہر و محبت اور قوی خاندانی ہمدردی۔ جو نسل کی ایجاد کے لئے انسان کا اصلی محرک ہے کو نابود کر کے رکھ دیتا ہے اور نتیجہ کے طور پر نسل بڑھانے کے موضوع کو لوگوں میں خاص کر عورتوں میں کہ واقعا ایام حل کے دوران ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھاتی ہیں ایک بیہودہ عمل دکھاتا ہے اور مہر و محبت والے خاندان کو ایک تاریک زندان میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ایسے حالات کے رونما ہونے کی وجہ سے تناسل و تولید کا راستہ بالکل بند ہو جاتا ہے اور خاندان جو حقیقت میں شہری معاشرہ کو تشکیل دیتا ہے نابود ہو کر رہ جاتا ہے، اور خاندان کی تشکیل اور تناسل و تولید فنی وسائل اور سیاسی فہم کاریوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، جیسے بچہ پیدا کرنے والوں کے لئے بڑے بڑے انعامات کا اعلان کرنا یا سخت قوانین نافذ کرنا وغیرہ۔ بدیہی ہے کہ اس قسم کی حالت جو فطرت کے ساتھ سازگار نہیں ہوتی پائدار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ واضح ہے کہ اس صورت میں، انسان کی زندگی ایک وحشتناک مہل میں تبدیل ہو کر خشک و بے لذت ہوگی اور حقیقت میں، انسان کی زندگی کا ماحول مویشیوں سے زیادہ ہست اور درندوں کے ماحول سے زیادہ خطرناک ہوگا۔

طلاق (میاں بیوی کی جدائی): میاں بیوی کے شرعی رابطہ کے ختم ہونے کے بعد، ایک دوسرے سے جدا ہو کر ازدواجی حقوق کے قوانین کی پابندی سے آزاد ہونے کو ”طلاق“ کہتے ہیں۔ طلاق کا قانون اسلام کا ایک ناقابل انکار امتیاز ہے جو وہ محبت اور چند دیگر ادیان پر رکھتا ہے اور انسانی معاشرے کی ایک ضرورت کو پورا کرتا ہے، کیونکہ بے شمار ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ میاں اور بیوی کے اخلاق آپس میں سازگار نہیں ہوتے اور پیار و محبت کا ماحول ایک میدان جنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ان کے درمیان مصاحبت ممکن نہیں ہوتی، اس صورت میں اگر میاں بیوی کا رشتہ توڑنے کے قابل نہ ہوتا تو میاں بیوی کو عمر بھر ایک بد بختانہ زندگی گزارنا پڑتی جو کہ درحقیقت ایک شعلہ ورجہم ہے اور تنہی و محرومیت کے ساتھ نامناسب جسمانی اذیتیں برداشت کرنا پڑتیں اور اس مطلب کی بہترین مثال یہ ہے کہ عیسائی حکومتیں بھی عام ضرورتوں کے پیش نظر آخر کار ”طلاق“ کو قانونی حیثیت دینے پر مجبور ہوئیں۔

اسلام میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، البتہ اس حکم میں مرد اور عورت کی فطری حالت کو مد نظر رکھا گیا ہے، کیوں کہ اگر طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں ہوتا، چونکہ عورت مرد سے زیادہ جذبات کی اسیر ہوتی ہے، اسلئے میاں بیوی کا رابطہ ہمیشہ کمزور پڑتا اور تشکیل پایا ہوا خاندان متزلزل ہو کر آسانی کے ساتھ بکھر جاتا۔ اسکے باوجود دین اسلام میں ایسی راہیں موجود ہیں کہ عورت بھی طلاق کے حق سے استفادہ کر سکتی ہے، اپنے شوہر سے معاشرت کے ضمن میں دورانِ نشی کے پیش نظر عقد نکاح کے وقت شرط رکھے کہ اگر احتمالی مشکلات میں سے کوئی مشکل پیش آئے تو طلاق جاری کرنے کی وکالت کا حق ہوگا یا یہ شرط رکھے کہ اگر شوہر بلاوجہ اسے طلاق دے تو اس پر اس کے مشکلات کو حل کرنے کی ذمہ داری ہوگی۔ اسلامی شریعت نے اگرچہ طلاق کو قانونی حیثیت دی ہے، لیکن اس کی غیر معمولی اور زبردست مذمت کی ہے اور بہت نصیحت کی ہے کہ اگر مسئلہ اضطراب کی حد تک نہ پہنچے تو مرد اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور ازدواجی رشتہ کو نہ توڑے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ”خدا اے متعال کے نزدیک ناپسند و منفور ترین

چیزوں میں سے ایک طلاق ہے،^۱ اسی لئے اسلام میں طلاق کے لئے چند مشکل قوانین وضع کئے گئے ہیں، جیسے طلاق دو عادل افراد کے سامنے انجام پانا چاہئے اور ان دنوں میں ہو کہ عورت اپنی عادت کے ایام میں نہ ہو اور مرد نے ان دنوں اس سے ہمستری نہ کی ہو۔ اسی طرح مقرر ہوا ہے کہ اگر طرفین کے درمیان کوئی اختلاف یا نزاع پیدا ہو جائے تو دو افراد کو حکم قرار دیں تاکہ میاں بیوی کے درمیان مصاحت کرائیں اور صرف اس صورت میں طلاق دی جائے کہ جب مصاحت کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں۔

طلاق صحیح ہونے کی شرائط

اپنی بیوی کو طلاق دینے والے مرد میں درج ذیل شرائط ہونی چاہئیں :

۱۔ بالغ ہو۔

۲۔ عاقل ہو۔

۳۔ اپنی اختیار سے طلاق دے۔

۴۔ طلاق دینے کا قصد رکھتا ہو۔ اس بنا پر نابالغ، دیوانہ یا طلاق دینے پر مجبور شخص یا مذاق میں صیغہ طلاق پڑھنے والے کا طلاق صحیح نہیں ہے۔

۵۔ طلاق کے وقت عورت خون حیض کو سے پاک ہونا چاہئے اور پاک ہونے کے بعد شوہر نے اس کے ساتھ ہم بستری نہ کی ہو۔

۶۔ طلاق اپنے مخصوص صیغوں میں پڑھا جائے اور دو عادل کے سامنے انجام پائے۔

^۱ وسائل الشیعہ، ج ۱۵ ص ۲۶۶ باب۔

طلاق کی قسمیں

طلاق کی دو قسمیں ہیں : ۱۔ طلاق رجعی : یہ وہ طلاق ہے کہ مرد اپنی اس بیوی کو طلاق دے کہ جس کے ساتھ ہم بستری کی ہو۔ اس صورت میں مرد طلاق کا عدہ تمام ہونے سے پہلے رجوع کر کے نئے عقد کے بغیر ازدواجی رابطہ کو پھر سے برقرار کر سکتا ہے۔

۲۔ طلاق بائن : یہ وہ طلاق ہے، کہ جس میں طلاق جاری ہونے کے بعد مرد رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔ اس کی چند قسمیں ہیں : الف: عورت کے ساتھ مرد کے ہمستری ہونے سے پہلے دیا جانے والا طلاق۔ ب: یائسہ عورت کی طلاق یعنی وہ عورت جس میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو۔

ج: اس عورت کی طلاق جس کی عمر ابھی نو سال تمام نہ ہوئی ہو۔ مذکورہ تین قسم کے طلاقوں میں عدہ نہیں ہے۔

د: اس عورت کی طلاق جس کو تین مرتبہ طلاق دی گئی ہو۔ اس طلاق میں اس کے علاوہ کہ مرد رجوع نہیں کر سکتا ہے اسے پھر سے اپنے عقد میں بھی نہیں لاسکتا ہے مگر یہ کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد کے عقد دائمی میں آجائے اور اس سے ہم بستری کی جائے پھر وہ مرد اسے طلاق دیدے یا مرجائے تو اس صورت میں عدہ تمام ہونے کے بعد پہلا شوہر اس کے ساتھ پھر سے عقد کر سکتا ہے۔

هـ۔ طلاق خلع: اس عورت کی طلاق جو اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی ہے اور اپنا مہر یا کوئی اور مال اسے بخش کر اس سے طلاق حاصل کرے، اس کو ”خلع“ کہتے ہیں۔ اس طلاق میں جب تک بیوی اپنے شوہر کو بخش دے گئے مال کا مطالبہ نہ کرے، اس وقت تک مرد رجوع نہیں کر سکتا ہے۔ طلاق مبارات: یہ وہ طلاق ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو نہ چاہتے ہوں اور بیوی مرد کو کچھ مال دے اور اس کے مقابلہ میں وہ اسے طلاق دے۔ اس طلاق میں بھی جب تک بیوی اپنے ادا کئے ہوئے مال کا مطالبہ نہ کرے، مرد رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔

ز۔ نواں طلاق: ان شرائط کے ساتھ جو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، اس طلاق کے بعد عورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے اور کسی صورت میں اس کے ساتھ دوبارہ ازدواجی رشتہ برقرار نہیں کر سکتا ہے۔

عدت کے احکام اور اس کی قسمیں

جس عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ ہم بستری کی ہو اور ازدواج کے رشتہ کو مستحکم کیا ہو، اگر اس کا شوہر اسے طلاق دیدے، تو اسے ایک معین مدت تک عدہ رکھنا چاہئے یعنی اس مدت میں ازدواج کرنے سے پرہیز کرے۔ اس کام کے دو اہم نتائج ہیں: اول یہ کہ: نطفوں کے مخلوط ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ: ممکن ہے اس مدت کے دوران میاں بیوی اپنی جدائی سے پشیمان ہو کر رجوع کریں۔ عدہ کی مدت کے دوران مرد کو بیوی کے اخراجات کو ادا کرنا چاہئے اور اسے اپنے گھر سے نہ نکالے۔ اور اگر یہ چوتھی بیوی تھی تو عدہ تمام ہونے تک دوسری عورت سے عقد نہ کرے۔ اگر طلاق مرد کی مملکت بیماری کے دوران انجام پائے تو اس کے ایک سال کے اندر مرنے کی صورت میں بیوی اس کے ترکہ سے میراث لینے کی حقدار ہے۔

عدت کی قسمیں عدہ کی تین قسمیں: ۱۔ حاملہ عورت کا عدہ

۲۔ غیر حاملہ عورت کا عدہ

۳۔ عدہ وفات

ان کی تفصیل حسب ذیل ہے: ۱۔ اگر حاملہ عورت کو طلاق دی جائے تو اس کا عدہ بچہ کی پیدائش یا اسکے ساقط ہونے تک ہے۔ اس بنا پر اگر طلاق دینے کے ایک گھنٹہ بعد اس کا بچہ پیدا ہو جائے تو وہ دوسرا شوہر کر سکتی ہے۔

۲۔ جو عورت حاملہ نہ ہو اور اس کی عمر پورے نو سال ہو یا سہ نہ ہو، جبکہ اس کے شوہر نے اس کے ساتھ ہم بستری کی ہو اور حیض کے علاوہ دنوں میں طلاق دی ہو تو اسے اتنا انتظار کرنا چاہئے کہ دوبار حیض دیکھے اور پاک ہو جائے اور جوں ہی تیسرے حیض کو دیکھے گی اس کا عدہ تمام ہو جائے گا۔

۳۔ جس عورت کا شوہر مر جائے اور وہ حاملہ نہ ہو تو اسے چار مہینے دس دن عدہ رکھنا چاہئے۔ اگر حاملہ ہو تو اسے بچے کی پیدائش تک عدہ رکھنا چاہئے لیکن اگر چار مہینے دس دن گزرنے سے پہلے، بچہ پیدا ہو جائے تو اسے اپنے شوہر کے مرنے کے دن سے چار مہینے دس دن تک انتظار کرنا چاہئے اور اسے ”عدہ وفات“ کہتے ہیں۔

اسلام میں غلامی

شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے یہ فکر اس کے ہمراہ تھی کہ انسان کو بھی دوسری اشیاء کے مانند اپنی ملکیت قرار دے سکتا ہے۔ قدیم مصر، ہندوستان، ایران، عربستان، روم، یونان، یورپ اور امریکہ کے تمام ممالک میں غلام بنانے کا رواج تھا اور یہ رواج یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی عام تھا اسلام نے بھی اس میں کچھ تبدیلیاں لا کر اسے جائز قرار دیا ہے۔

برطانیہ کی حکومت پہلی حکومت تھی جس نے غلامی کی روش کی مخالفت کی اور ۱۸۳۳ء میں سرکاری طور پر غلامی کے طرز عمل کو منسوخ کیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے ممالک نے بھی اس روش کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۸۹۰ء میں ’بروکسل‘ میں منعقد ایک میٹنگ میں ایک عمومی قانون کی حیثیت سے غلامی ممنوع قرار دی گئی اور اس طرح دنیا سے غلام کی خرید و فروخت ختم ہو گئی۔

غلام بنانے کے طریقے: ایسا لگتا ہے کہ یہ قدیم رسم انسان میں من مانی اور بے حساب رائج نہیں تھی کہ جو بھی چاہتا کسی دوسرے کو اپنی ملکیت میں لے لیتا بلکہ غلامی مندرجہ ذیل راہوں میں سے کسی ایک راہ سے انجام پاتی تھی: ۱۔ جنگ و فتح: قدیم الایام سے

اگر دو جانی دشمنوں میں سے ایک دوسرے پر فتح پا کر بعض افراد کو اسیر بناتا تھا، تو وہ ان جنگی اسیروں کے لئے کسی انسانی احترام کا قائل نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے لئے ان کے ساتھ ہر طرح کا برتاؤ کرنے کا حق سمجھتا تھا۔ یعنی قتل کر ڈالے یا بخش دے یا آزاد کرے یا غلاموں کی حیثیت سے اپنے پاس رکھے اور ان سے استفادہ کرے۔

۲۔ تولید و تربیت: خاندان کے باپ، خاندان کے سرپرست ہوتے تھے اور اپنی اولاد کو اجتماعی شخصیت کے مالک نہیں جانتے تھے بلکہ انھیں خاندان کے تابع اور محض اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور خود کو ان کے بارے میں ہر قسم کا فیصلہ کرنے کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے ضرورت کے وقت اپنی اولاد کو بیچ دیتے تھے اور اسی اصل کی بنیاد پر کبھی عورتوں کو بھی بیچ دیتے تھے۔

۳۔ طاقت ور لوگ جو اپنے آپ کو دوسروں سے بلند سمجھتے تھے: ایسے افراد اپنے حکم کو لوگوں کا نظم و نسق چلانے میں نافذ العمل جانتے ہوئے انھیں اپنا غلام شمار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے قدرتمند بادشاہ اپنے کو خدائی کے قابل جان کر لوگوں کو اپنی پرستش کرنے پر مجبور کرتے تھے یہ افراد لوگوں کو اپنا غلام بنانے میں مطلق العنان تھے اور اپنے ماتحتوں میں سے جس کو بھی چاہتے، اسے اپنا غلام بناتے تھے۔

خلاصہ ترجمہ
Conclusion Summary

غلامی کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اسلام نے اپنی اولاد اور عورتوں کو بیچنے کے ذریعہ اور زبردستی اور غذہ گردی کے ذریعہ غلام بنانے سے منع کیا ہے۔ اسلام کی نظر میں ہر انسان جو انسانیت کے راستہ پر گامزن ہے اور کم از کم انسانیت کے اصول کا دشمن نہ ہو، وہ آزاد ہے اور کوئی شخص اسے اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ لیکن جو انسانیت کا جانی دشمن ہے اور جان بوجھ کر انسانیت کے اصول کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا ہے اور اپنی پوری طاقت سے اسے نابود کرنے پر تلا ہوا ہے، وہ ہرگز انسانی احترام کا مستحق نہیں ہے اور اسے اپنے ارادہ و عمل میں آزاد نہیں ہونا چاہئے اور غلامی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان کے عمل و ارادہ کی آزادی اس سے سلب کی جائے اور دوسرے کا ارادہ اس

پر حکومت کرے اسی عالمی اصول پر جو ہمیشہ دنیا والوں کی طرف سے مورد تائید قرار پایا ہے کفار حربی سے لئے گئے جنگی اسیروں کو غلامی یعنی انہیں ارادہ و عمل کی آزادی سلب کرنے کی سزا دیتا ہے کیونکہ وہ انسانیت کے حقیقی دشمن ہیں۔ اسلام جو سلوک جنگی اسیروں کے ساتھ روا رکھتا تھا، وہ وہی سلوک ہے جسے دوسرے بھی روا رکھتے ہیں۔ جب کوئی ملت جنگ کے بعد فاتح ملت کے سامنے کسی قید و شرط کے بغیر ہتھیار ڈالتی ہے، تو جب تک ان کے درمیان باقاعدہ صلح برقرار نہ ہو تب تک اسے ارادہ و عمل کی آزادی سے محروم کرنے کی سزا دی جاتی ہے۔ ان ملتوں کا اسلام کے ساتھ جو تھا اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام اسے ”غلامی“ کے نام پر یاد کرتا ہے اور یہ قومیں اس لفظ کو استعمال کرنے سے پہلو تہی کرتی ہیں۔ البتہ جس روش کو وہ زندہ اور معاشرے کے لئے راہنما جانتے ہیں اپنی تعلیمات کی بنیاد کو نام گزار سی کی بنیاد پر استوار نہیں کرنا چاہئے۔

اسلام اور دوسرے نظریات کی تحقیق

گزشتہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کو منوخ کرنے والی عام قرارداد نے بجائے اس کے کہ اسلام کے کام میں کوئی گرہ لگائے، ایک گرہ کو کھول دیا ہے۔ حقیقت میں یہ قرارداد دین اسلام کے قوانین کی ایک دفعہ کا نفاذ ہے کیونکہ اس طرح عورتوں اور بچوں کو بچنے کا موضوع ختم ہوا ہے، اور یہ وہی چیز ہے جسے چودہ سو سال پہلے اسلام نے منوخ کیا تھا۔

اسلام نے جنگی اسیروں کی غلامی کا جو راستہ کھلا رکھا ہے، وہ اس لئے ہے کہ انسان کو ہمیشہ اس حکم کی ضرورت ہے، اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ تنہا چیز جسے اسلام نے ”غلامی“ کا نام دیا ہے وہ یہی جنگی اسراء ہیں۔

لیکن دوسرے لوگ ”غلامی“ کے نام کو زبان پر لائے بغیر غلامی، ”غلامی“ کی رسم کو مستحکم کر رہے ہیں، اور جو استفادہ صدر اسلام میں مسلمان (جنگی اسیروں) غلاموں سے کرتے تھے وہی استفادہ آج کی حکومتیں جنگی قیدیوں اور جنگ میں شکست کھائی ملتوں سے کرتے ہیں۔

غلاموں کے ساتھ اسلام کا سلوک

اسلامی قوانین کے تحت اسیر کئے گئے کفار حربی، ممکن ہے مسلمانوں کے سرپرست اور حاکم کے حکم سے آزاد کئے جائیں یا بطور غلام رکھے جائیں۔ جنگ ہوازن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی ہزار عورتوں اور بچوں کو ایک ساتھ آزاد کیا۔ جنگ بنی المصطلق میں مسلمانوں نے کئی ہزار اسیروں کو آزاد کیا۔ اسلام میں، غلام، گھر کے اعضاء کے مانند ہیں، گھر کے دوسرے اعضاء کے ساتھ جیسا سلوک کیا جاتا ہے ویسا ہی برتاؤ ان کے ساتھ بھی کیا جانا چاہئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دو کڑے خریدتے تھے، ان میں سے بہتر اپنے غلام کو دیتے تھے اور معمولی کڑے کو خود پہنتے تھے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں، ان کے ساتھ سختی نہ کریں، گالیاں نہ دیں اور جہانی اذیتیں نہ پہنچائیں اور ضرورت کے وقت ان کے ازدواج کے وسائل فراہم کریں یا خود ان کے ساتھ ازدواج کریں۔ خدائے متعال اس سلسلہ میں فرماتا ہے: (بعضکم من بعض!) ”ب ایک پیکر کے اعضاء ہیں“، اسلام میں، غلام، اپنے مالک کی اجازت سے یا دوسرے راستہ سے مالک بن سکتے ہیں اور جس مال کے وہ مالک بن جائیں، آزادی کے بعد ان کے لئے کسی قسم کا تنگ و عار نہیں ہے، جیسے کہ غلامی کے زمانہ میں بھی نہیں تھا کیونکہ اسلام میں بزرگی اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے لوگوں میں سب سے زیادہ پرہیزگار شخص کو سب سے بہتر جانتا ہے۔ اسلام کی نظر میں ایک باتقویٰ غلام ہزار بے تقویٰ آزاد لوگوں سے بہتر ہے۔ اسلام کی بعض عظیم شخصیتیں جیسے سلمان فارسی اور بلال حبشی آزاد کئے گئے غلام تھے۔ اسلام نے غلام کو آزاد کرنے کے مسئلہ کو ہمیشہ مد نظر رکھا ہے اور اس کام کے لئے مختلف راستے کھولے ہیں منجملہ جرمانہ اور بعض گناہوں کا کفارہ غلاموں کی آزادی کے لئے قرار دیا ہے،

اس کے علاوہ غلاموں کو آزاد کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اور اسے اہم مقدمات میں قرار دیا ہے تاکہ اس طرح ہر سال بہت سے غلام آزاد ہو کر آزاد معاشرے کے عضوبن سکیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ اسلام حتی الامکان غیر اسلامی معاشروں (کفار حربی) سے ایک گروہ کو جنگی اسیروں کی صورت میں پکڑتا تھا اور انھیں حق و عدالت کے معاشرے میں داخل کرتا تھا، ان کی تعلیم و تربیت کرتا تھا پھر مختلف راستوں سے آزاد کر کے اسلامی معاشرے کا حصہ بناتا تھا۔ اس لحاظ سے جو شخص بھی جنگی اسیر ہوتا تھا، آزاد ہونے تک غلام رہتا تھا۔ اگر وہ مسلمان ہونے کے فوراً بعد آزاد ہوتا، تو اس صورت میں ممکن تھا ہر اسیر ہونے والا کافر، ظاہراً مسلمان ہو جاتا، اور اس طرح اپنے آپ کو نجات دلاتا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر سے اپنی سابقہ حالت کی طرف پلٹ جاتا۔

غضب

جو شخص کسی کے مال کو زبردستی اس سے چھین کر مالکیت کے اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر اسے اپنا مال قرار دے یا کسی دوسرے کے مال پر زبردستی قبضہ کر کے استفادہ کرے، اگرچہ اسے اپنا مال قرار نہ دے، اس عمل کو شرعاً ”غضب“ کہتے ہیں۔ لہذا تسلط جانے کے کسی جائز سبب جیسے بیع، اجارہ اور اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے مال پر قبضہ جانے کو غضب کہتے ہیں۔ یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ غضب ایک نامناسب کام ہے جو مالکیت کی خصوصیت کی بنیاد کو پامال کرتا ہے۔

جس قدر مالکیت کی خصوصیت کی بنیاد معاشرے کے زندہ اور پائیدار رہنے میں موثر ہے اسی قدر غضب معاشرے کو برباد کر کے اس کی ترقی کو روکتا ہے۔ اگر یہ طے پا جائے کہ معاشرے کے اثر و رسوخ رکھنے والے افراد قانون کی اجازت کے بغیر کمزوروں اور اپنے ماتحتوں کی کمائی پر قبضہ جائیں تو خصوصیت اور مالکیت اپنے اعتبار کو کھودے گی۔ ہر ایک اپنے سے کمزور لوگوں کے خصوصی حقوق کے بارے میں اسی طرز فکر پر عمل کرے گا اور ماتحت اور کمزور لوگ بھی اپنی محنت و مشقت کی کمائی کی حفاظت کے لئے ہر ممکن اقدام کر کے عزت و شرافت فروشی پر مجبور ہوں گے۔ اور نتیجہ میں انسانی معاشرہ غلاموں کے خرید و فروخت کے ایک بازار میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا اور قوانین و ضوابط اپنے اعتبار سے گر جائیں گے اور ان کی جگہ پر ظلم و ستم جانشین ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے غاصب کے لئے سخت قوانین وضع کئے ہیں اور غضب کو گناہ کبیرہ قرار کیا ہے۔ قرآن و سنت کی نص کے مطابق، شرک کے علاوہ ہر قسم کے گناہ کو خدا کی طرف سے بخش دئے جانے کا احتمال ہے۔ اور ہر گناہ حتیٰ شرک بھی توبہ کے ذریعہ قابل عفو و بخشش ہے۔ لیکن جس کی زندگی کے ریکارڈ میں دوسروں کے حقوق کے بارے میں غضب اور ظلم و ستم درج ہو، تو اس کے لئے کسی بھی صورت میں حقدار سے بخشش حاصل کئے بغیر خدا کی پوچھ گچھ اور سزا سے بچنے کی امید نہیں ہے۔

غضب کے بعض احکام

۱۔ غاصب پر واجب فوری ہے کہ غضب کیا گیا مال مالک کو لوٹا دے، اور اگر وہ زندہ نہ ہو تو اسے اس کے وارثوں کے حوالہ کر دے، اگرچہ اس مال کا واپس کرنا غاصب کے لئے کافی نقصان کا سبب بنے۔ مثال کے طور پر کسی کا ہتھیریا لوہے کا ایک ٹکڑا غضب کر کے اپنے مکان کی بناء میں نصب کرے جو اس کے لاکھوں برابر قیمت پر تعمیر ہوئی ہو، تو مکان کو گرا کر اس ہتھر اور لوہے کے ٹکڑے کو نکال کر اس کے مالک کو لوٹا دے، مگر یہ کہ اس کا مالک اس کی قیمت حاصل کرنے پر راضی ہو جائے۔ یا اس کے مانند کسی نے دس من گندم غضب کر کے دس خروار جوئے مخلوط کیا ہو، اگر گندم کا مالک اس کی قیمت لینے پر راضی نہ ہو جائے تو اسے عین گندم کو جوئے جدا کر کے مالک کو واپس کرنا چاہئے۔

۲۔ اگر غضب کئے گئے مال میں کوئی نقص پیدا ہو جائے، تو عین مال کو واپس کرنے کے علاوہ نقصان کی تلافی بھی کرنا چاہئے۔

۳۔ اگر غضب کیا گیا مال تلف ہو جائے تو اس کی قیمت ادا کی جانی چاہئے۔

۴۔ اگر غاصب، غضب کئے گئے مال کے کسی حصہ کو ضائع کر دے، تو چاہے اس نے خود اس سے استفادہ نہ کیا ہو تو بھی وہ اس مال کے منافع کا ضامن ہے، جیسے کسی نے کرایہ کی گاڑی کو غضب کر کے کئی دن تک اسے گیرج میں رکھا ہو۔ اسی طرح اگر غاصب، غضب کئے گئے مال میں اضافہ کر دے، جیسے ایک بھیڑ کو غضب کرنے کے بعد اسے اچھی گھاس کھلا کر فربہ بنا دے تو اس اضافہ میں

کوئی حق نہیں رکھتا ہے البتہ اگر مذکورہ اضافہ منفصل ہو یعنی ایک زمین کو غضب کر کے اس میں کاشتکاری کر کے زراعت حاصل کرے تو غضب کیا ہوا مال اجرت کے ساتھ مالک کو لوٹا دے اور زراعت غاصب کی ہوگی۔

لُفْظ: جو بھی مال پایا جائے اور اسکا مالک معلوم نہ ہو اسے ”لفظ“ کہتے ہیں: ۱۔ جو مال پایا جائے اور اس کا مالک معلوم نہ ہو، اگر اس کی قیمت ایک مثقال چاندی سے کم ہو، تو اسے اٹھا کر خرچ کیا جاسکتا ہے اور اگر اس کی قیمت ایک مثقال چاندی سے زیادہ ہو تو اسے نہیں اٹھانا چاہئے اور اٹھانے کی صورت میں عادی راہوں سے ایک سال تک اس کے مالک کو ڈھونڈنا چاہئے اور مالک کو ڈھونڈ لینے کی صورت میں اس کے حوالہ کرنا چاہئے اور اس کا مالک نہ ملا تو اس مال کو اسکی طرف سے کسی فقیر کو صدقہ دینا چاہئے۔

۲۔ اگر کسی مال کو ایک ایسی ویران جگہ میں پایا جائے جس کے باشندے نابود ہو چکے ہوں یا غار اور اس بخر زمین میں پایا جائے کہ جس کا کوئی مالک نہ ہو۔ تو پایا گیا مال پانے والے کا ہے، اور اگر مال ایسی زمین میں ملے جو کسی کی ملکیت ہو تو اس کے گزشتہ مالکوں سے دریافت کیا جانا چاہئے، اگر انہوں نے اس کو چھپایا ہو تو علامت و نشانی بتانے کی صورت میں دیا جائے ورنہ یہ مال پانے والے کا ہے۔ بخر زمینوں کو آباد کرنا ایسی زمین کو آباد کرنا جس سے استفادہ نہیں ہوتا تھا (خواہ وہ زمین کبھی آباد نہیں تھی یا کبھی آباد تھی لیکن وہاں کے باشندوں کے معدوم ہونے کی وجہ سے غیر آباد اور بے فائدہ رہی ہو یا مرغ زاروں یا نرسل زاروں کے مانند)۔ بہر حال زمینوں کو آباد کرنا اسلام میں نیک کام شمار ہوتا ہے اور مالکیت کا سبب بننے کے علاوہ اخروی ثواب بھی رکھتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ ”جو کوئی شخص کسی بخر زمین کو آباد کرے، وہ زمین اس کی ہے“۔^۱ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے کہ ”اگر کوئی گروہ کسی بخر زمین کو آباد کرے، تو وہ اولویت کا حق رکھتا ہے اور وہ اس زمین کا مالک ہے“۔^۲ اسلام میں بخر زمینوں کا مالک خدا، رسول خدا اور امام ہے (اسلامی حکومت سے مربوط

^۱ تقریباً ساڑھے تین گرام۔

^۲ میزان الحکمة، ج ۱، ص ۹۴۔

^۳ میزان الحکمة، ج ۱، ص ۹۴۔

میں) اور انفال میں شمار ہوتی ہیں۔ بنجر زمینوں کو مندرجہ ذیل شرائط سے آباد کر کے ان کا مالک بن سکتے ہیں، اور اگر کئی افراد ملکیت کا قصد کریں تو جو پیش قدمی کرے گا وہ اولویت کا حق رکھتا ہے: ۱۔ امام یا ان کے نائب کی اجازت سے۔

۲۔ کسی دوسرے شخص نے پہلے اس کی پتھروں سے نشانہ ہی یا حد بندی نہ کی ہو۔

۳۔ دوسروں کی ملکیت کے حدود سے متصل نہ ہو، جیسے نہر کے اطراف کنویں کے پٹے میں اور کھیت کی سرحد سے ملی نہ ہو۔

۴۔ خالی زمین، جیسے خراب شدہ مسجد یا اوقاف، عام مسلمانوں کی زمین جیسے کوچے اور سڑکیں نہ ہوں۔

نوٹ: تعمیر اور آباد کرنا ایک عرفی مفہوم ہے، اس لئے جب عرف کہے: ”ایک شخص نے فلاں زمین آباد کی ہے“، ملکیت تحقق پاتی ہے۔ البتہ آباد کرنا بھی مختلف مقاصد کے پیش نظر مختلف ہے۔ چنانچہ کھیتی باڑی میں ہل چلانے سے آباد کرنا عمل میں آتا ہے اور عمارت بنانے میں دیوار بنانے سے ثابت ہوتا ہے، یہاں تک کہ حاضر لوگوں میں سے ہر ایک کھدائی اور استخراج کے بغیر اس سے استفادہ کر سکتا ہے، ہر ایک کے لئے جائز ہے کہ ضرورت کے مطابق اس سے استفادہ کرے اور اگر ان کا استفادہ کرنا کھدائی اور استخراج اور دیگر فنی کاموں پر منحصر ہو، جیسے سونا اور تانبا وغیرہ تو جو محنت و مشقت سے کھدائی وغیرہ کر کے استخراج کرے وہی مالک ہوگا۔ بڑی نہریں مسلمانوں میں مشترک ہیں اسی طرح دریا اور برف و باران کا پانی جو پہاڑوں سے بہہ کر نیچے آتا ہے، جو بھی ان کے نزدیک اور آگے ہو وہ دوسروں پر مقدم ہے۔

تخصیص اور ملکیت کی اصل

یہی عقیدہ کہ انسان زمین کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے، اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اس کے مظاہر سے آسانی کے ساتھ استفادہ کرے۔ مثلاً اس کا زلال پانی پئے، میٹھے میوے اور حیوانوں کا گوشت کھائے، پہاڑوں کے درختوں میں درختوں کے سائے میں آرام کرے یا صنعت۔ یعنی مادہ پر انجام دی سرگرمیوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال میں لائے۔ البتہ اگر صرف چند افراد زمین پر ایسی

زندگی گزارتے کہ آپس میں کوئی ٹکراؤ نہ ہوتا تو ہرگز کوئی مشکل پیش نہ آتی، لیکن افراد کا جمع ہونا اور ان کا باہم زندگی گزارنا جو انسان کی اجتماعی شہری زندگی کی بنیاد ہے، کہ ہر فرد زمین اور اس کے مظاہر کو اپنی ملکیت سمجھ لے تو قدرتی طور پر لوگوں کے درمیان ٹکراؤ اور شدید تصادم کا سبب بن جائے گا، جب ہر شخص اپنی ضرورت کو پورا کرنے کی تلاش و کوشش کرے گا، تو دوسرے اسے اپنی آزادی و آسائش میں مغل سمجھتے ہوئے اس کے لئے رکاوٹ ایجاد کریں گے، کیونکہ انسان اپنی زندگی کو ہر قیمت پر جاری رکھنے کے لئے مجبور ہے۔ اس لئے پہلے ”اصل تخصیص“ کے نام پر ایک اصل و قانون وضع کیا گیا تاکہ اجتماعی ٹکراؤ اور تصادم کو روکا جائے۔ اس اصل کو قابل احترام سمجھا گیا ہے۔ اس اصل و قانون کے مطابق انسان جس چیز کو اپنی سعی و کوشش سے حاصل کرے وہ اس کا مالک ہے اور دوسروں کو اس پر طمع و لالچ کر کے اس کے لئے رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں ہے۔

اس کے بعد ”اصل مالکیت“ کے نام پر ایک اور اصل وضع کر کے اسے قابل احترام سمجھا گیا ہے کہ اس کے مطابق انسان اپنی کوششوں سے حاصل کی گئی چیزوں پر اپنی مرضی سے تصرف کر سکتا ہے۔

یہ اصل حقیقت میں ”اصل تخصیص“ کو مکمل کرنے والی ہے۔ کیونکہ ”اصل تخصیص“ دوسروں کی خلل اندازی کو روکتی ہے اور یہ اصل اس چیز کی مالکیت کے لئے ہر قسم کے تصرف کو جائز بنا دیتی ہے۔

اسلام نے مالکیت کی اصل کو محترم جانا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی معروف حدیث (الناس مسلطون علی اموالہم^۱) میں مالک کے اپنے مال پر مکمل تسلط کی تائید فرمائی ہے۔ اس قانون کے مطابق انسان جس طرح چاہے اپنے مال کو استعمال کر سکتا ہے، اس کی حفاظت کر سکتا ہے، کھا سکتا ہے، پی سکتا ہے، بخش سکتا ہے، بیچ سکتا ہے اور اسی طرح دوسرے جائز تصرفات انجام دے سکتا ہے، لیکن جو تصرفات ممنوع اور معاشرہ کی مصلحت کے خلاف ہیں مالک کو ان کا ہرگز اختیار نہیں ہے۔

^۱ عوالی النالی، ج ۱، ص ۴۵۷۔

مالک اپنے مال پر وہ تصرف نہیں کر سکتا ہے جو اسلام و مسلمین کے نقصان میں ہو یا اسراف اور فضول خرچی سے اپنے مال کو نابود نہیں کر سکتا ہے یا اپنے سونے اور چاندی کے سکوں کو جاری نہ رکھ کر خزانہ کے طور پر جمع نہیں کر سکتا ہے۔ اصل مالکیت اہم ترین اصل ہے جو انسان کو اپنی آرزو تک پہنچاتی ہے اور قوانین کی رعایت کے سایہ میں انفرادی آزادی کو امکان کی آخری حد تک فراہم کرتی ہے۔ جتنا مال کی نسبت انسان کا تسلط یا اس کے کار و کوشش کے بارے میں اس کا اختیار کم ہو جائے گا اتنی اس کی آزادی سلب ہو جائے گی اور اس کا استقلال نابود ہو جائے گا اور اگر اصل تسلط بالکل نابود ہو جائے تو حقیقت میں ایک زندہ مخلوق سے اس کی اصل آزادی چھین لی جائے گی۔

اصل مالکیت کے دو متے

مالک کا اپنی ملکیت پر مکمل تسلط اور اس کے ہر جائز تصرف میں مطلوب آزادی، ممکن ہے دو راستوں سے خطرہ میں پڑ جائے:

۱۔ دوسروں کی طرف سے تجاوز کی وجہ سے، جیسے کوئی اس کی ملکیت پر قبضہ کر کے اس کے لئے استفادہ کے راستہ کو مدود کر دے۔

۲۔ اس راستہ سے کہ دوسرے ایسا کام انجام دیں جس سے مالک کو نقصان پہنچے۔ دین اسلام نے مذکورہ خطرات کو روکنے کے لئے دو مزید اصولوں کو وضع کیا ہے کہ اصل مالکیت خود بخود حاصل ہوتی ہے کہ حقیقت میں یہ دو اصلیں اسکے نفاذ اور حفاظت کی ضامن ہیں:

الف: اصل ضمان: اسلام اس اصل کے مطابق حکم دیتا ہے کہ جو بھی دوسرے کے مال کو پائے، وہ اس کا ضامن ہے یعنی اس کو وہ مال مالک کو لوٹا دینا چاہئے اور اگر ضائع ہو جائے تو اسکے مانند یا قیمت ادا کرے اس حکم کی دلیل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ہے: ”علی الید ماخذت حتی تؤدی“ ب: قائدہ لا ضرر: اس قائدہ کو حدیث نبوی (لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام) سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اس قائدے کے مطابق اگر اسلام کا کوئی بھی حکم جاری کرنے میں کسی شخص کو بعض موقع پر مالی یا جانی نقصان پہنچائے تو وہ حکم اس مورد میں، جاری نہیں ہوگا۔ جن چیزوں کو ملکیت بنایا جاسکتا ہے دین مقدس اسلام میں ان چیزوں کو ملکیت بنایا جاسکتا ہے: ۱۔ قابل توجہ فائدہ ہو، مثال کے طور پر حشرات قابل ملکیت نہیں ہیں۔

۲۔ مذکورہ فائدہ حلال ہو، اس بناء پر جوئے کے وسائل، موسیقی کے آلات اور ان کے مانند، جن کا حلال فائدہ نہیں ہے، کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔

۱۔ احکام ضمان کے دو حکم: الف: اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی ملکیت کو غصب کرے یعنی مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے قبضہ میں لے لے یا مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کرنے نہ دے، اسلام کے حکم کے مطابق فوراً اسے مالک کو واپس کرے اور اگر یہ ملکیت ضائع ہو جائے تو اسکے مانند یا اس کی قیمت ادا کرے اور اگر غصب کرنے کی وجہ سے مال کے مالک کو کوئی نقصان پہنچے تو غاصب اس کا ذمہ دار ہے۔

ب: اگر کوئی شخص مالک کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف کرے، لیکن مالک کو بھی تصرف کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالے۔ تو خود مال اگر تلف ہو جائے تو اس کے مانند یا قیمت مالک کو دے، ضمان کے احکام و مسائل بہت زیادہ ہیں، تفصیلات جاننے کیلئے فقہی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ مذکورہ حلال فائدہ کسی فرد یا چند افراد کی تخصیص کے قابل ہو۔ اس بناء پر مساجد، عام سڑکیں اور ان کے مانند چیزیں، جو معاشرے کے تمام لوگوں سے مربوط ہوتی ہیں، کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بن سکتی ہیں۔ جن چیزوں سے انسان مالک بن سکتا ہے مالک بننے کے لئے انسانی معاشرے میں بہت سے وسائل موجود ہیں، لیکن ان میں سے بعض جیسے جوا، شرط لگانا، سود خواری اور رشوت، چونکہ معاشرے کیلئے مضر ہیں، اس لئے اسلام نے ممنوع فرمایا ہے۔ لیکن دوسرے وسائل مانند بیع، اجارہ، ہبہ اور جعالہ، جو معاشرے کے لئے مفید ہیں، ان میں کچھ اصلاح کر کے انہیں قبول کیا ہے اور کئی طور پر اسلام کی نظر میں مالک بننے کے دو وسیلے ہیں: ۱۔ وہ جس کے انجام دینے میں کوئی لازم ہو جیسے: خرید و فروخت کہ اس کو انجام دینے کے لئے عقد بیع پڑھنا یا لین دین کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔ وہ جس میں کسی عمل کی ضرورت نہیں ہے، جیسے: وفات کہ اس کے ذریعہ مالک کا مال وارثوں کو منتقل ہوتا ہے اور اس میں کسی لفظ یا عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ میراث اور نکاح کے احکام کی اہمیت کے پیش نظر ہم ان سے مربوط کھلی مسائل بیان کرتے ہیں۔

کھانا پینا

دین مقدس اسلام میں، ہر وہ چیز جو کھانے اور پینے کے قابل ہو، حلال ہے لیکن چند استثنائی چیزوں کے علاوہ، کہ ان میں سے بعض قرآن مجید میں اور بعض احادیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیان ہوئی ہیں۔ مذکورہ استثنائی چیزیں جن کا کھانا اور پینا حرام ہے، دو قسم کی ہیں :

جان دار اور بے جان۔

پہلی قسم: حیوانات

حیوانات تین قسم کے ہیں: دریائی، خشکی، اور پرندے۔

الف۔ دریائی حیوانات: پانی میں رہنے والے جانوروں میں صرف آبی پرندے اور پھلکے دار مچھلیاں حلال گوشت میں اور باقی جیسے سانپ، مچھلی، بگ، مچھلی، بکر، چمچ، سمندری کتا اور سور وغیرہ حرام ہیں۔

ب۔ جنحی کے حیوانات : جنحی کے حیوانات دو قسم کے ہیں: (پالتو اور جنحی) پالتو جانوروں میں، بھیر، بکری، گائے اور اونٹ حلال گوشت میں۔ اسی طرح گھوڑا، خیر اور گدھا حلال میں، لیکن ان کا گوشت کھانا مکروہ ہے اور ان کے علاوہ جیسے کتا اور بلی حرام میں۔ جنحی حیوانوں میں گائے، میٹھا، جنحی بکری، جنحی گدھا اور ہرن حلال گوشت میں اور باقی درندے اور ناخن دار حیوانات، جیسے: شیر، چیتا، بھیر، بومڑی، گیدڑ اور خرگوش، حرام گوشت میں۔

ج۔ پرندے: پرندوں میں سے جن کے پوٹا اور ہنگ دانہ ہو یا اڑتے وقت پر مارتے ہوں اور ناخن نہ رکھتے ہوں، جیسے پالتو مرغی، کبوتر، فاختہ، اور میٹر حلال گوشت میں اور باقی حرام گوشت میں اور ہڈی کی ایک خاص قسم حلال گوشت ہے ان کی تفصیلات کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

نوٹ: گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں جن حیوانوں کا نام لیا گیا، اس میں تزکیہ کی شرط ہے یعنی توضیح المسائل میں دی گئی تفصیل اور طریقہ سے ذبح کرنا۔

دوسری قسم: بے جان اشیاء

بے جان چیزیں دو قسم کی ہیں: الف۔ جاد (ٹھوس) ب۔ سیال چیزیں الف: جاد چیزیں ا۔ ہر حیوان کا مردار خواہ حرام گوشت ہو یا حلال گوشت اس کا کھانا حرام ہے۔ اسی طرح نجس چیزیں، جیسے: حرام گوشت حیوانوں کا فضلہ اور وہ کھانے کی چیزیں جو نجاست کے ملنے سے نجس ہو گئی ہوں کا کھانا حرام ہے۔

۲۔ مٹی

۳۔ مہلک زہر

۴۔ وہ چیزیں جن سے انسان فطری طور پر متنفر ہو، جیسے حلال گوشت حیوان کا فضلہ اور اس کی ناک کا پانی اور جو کچھ اس کی انتریاؤں سے نکلتا ہے۔ اسی طرح حلال گوشت حیوان کے بدن کے اجزاء میں سے پندرہ چیزیں حرام ہیں (تفصیل کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے) ب: سیال چیزیں ا۔ مست کرنے والی ہر رقیق چیز، اگرچہ کم ہی ہو اس کا پینا حرام ہے۔

۲۔ حرام گوشت حیوانات کا دودھ، جیسے سورہلی اور کتا۔

۳۔ خون جندہ رکھنے والے حیوان کا خون۔

۴۔ نجس مائعات جیسے خون جندہ رکھنے والے حیوانوں کا پیشاب اور منی وغیرہ۔

۵۔ وہ مائعات جن میں نجاستوں میں سے کوئی ایک مل گئی ہو۔

نوٹ: کھانے پینے کی حرام چیزیں اس وقت حرام ہیں جب اضطراب نہ ہو اور اضطراب کی صورت میں (جیسے: اگر کوئی شخص حرام غذا نہ کھائے تو بھوک سے مر جائے گا، بیمار پڑنے یا بیماری کے شدید ہونے سے ڈرتا ہو یا کمزور ہو کر سفر میں اپنے ہمفروں سے پیچھے رہ کر ہلاک ہو جائے گا) کھانے پینے کی حرام چیزوں میں سے اس قدر کھانا جائز ہے کہ اس کا اضطراب دور ہو جائے۔ لیکن جو چوری کے لئے یا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے وطن سے باہر آکر مضطر ہو جائے تو اس کیلئے جائز نہیں ہے۔

ایک اہم یاد دہانی: حفظانِ صحت کی رعایت، انسان کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ ہر انسان خداداد شعور کے ذریعہ تھوڑی توجہ سے اس کے بارے میں معلوم کر سکتا ہے۔ حفظانِ صحت پر مختلف قسم کے کھانے پینے کی چیزوں کے اثرات بھی بالکل واضح ہیں۔ اس کے علاوہ یہ چیزیں انسان کی روح و اخلاق اور اسی طرح اس کے اجتماعی میل ملاپ پر بھی قابل توجہ اثرات ڈالتی ہیں۔ ہمیں ہرگز اس میں شک و شبہ نہیں ہے کہ مست انسان کی نفسیاتی حالت اور اس انسان کی حالت ایک جیسی نہیں ہوتی جو ہوش میں ہے۔ اور ان کی اجتماعی گردش بھی ایک جیسی نہیں ہے۔

یا اگر کوئی شخص مثلاً نفرت آمیز چیزوں کو کھانے کی عادت کرے، اور اس عادت سے جو اثر اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیدا ہوگا، وہ عام افراد کے لئے قابل برداشت نہیں ہے۔ یہاں پر انسان اپنی خداداد فطرت سے سمجھتا ہے کہ اسے اپنے کھانے پینے میں کم و بیش محدودیت کا قائل ہونا چاہئے، ہر کھانے والی چیز کو نہ کھالے اور ہر پینے والی چیز کو نہ پی لے۔ آخر کار ہر نگلنے والی چیز کو نہ نگل لے۔ خدائے متعال نے اپنے کلام پاک کی نص کے مطابق زمین پر موجود ہر چیز کو انسان کے لئے خلق کیا ہے اور

خدائی متعال خود، انسان اور انسان کی ضروریات زندگی کی چیزوں کا محتاج نہیں ہے اور اپنی مخلوقات کے فائدہ و نقصان کے بارے میں سب سے زیادہ دانا اور مینا ہے۔ انسان کی خیر و سعادت کے لئے کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیا ہے۔ بعض ان محرمات کو حرام قرار دینے کا فلسفہ، مادہ اور بے لاگ سوچ رکھنے والوں کے لئے واضح ہے اور بعض حکمتیں علمی بحثوں کے ذریعہ تدریجاً واضح ہوئی ہیں اور جن چیزوں کے حرام ہونے کا فلسفہ ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے ان کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہرگز ہمارے لئے واضح نہیں ہوں گی اور اگر واضح بھی نہ ہوں تب بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔

بلکہ اس کے پیش نظر کہ قوانین کا سرچشمہ خدائے متعال کا بے انتہا علم ہے، اس لئے کہنا چاہئے کہ اس میں بہترین اور موثر ترین حکمت و مصلحت ہوگی اگرچہ ہم اپنی تنگ نظری اور محدود علم کی وجہ سے اس کو درک کرنے سے عاجز اور بے بس ہیں۔

میراث کے کئی مسائل

عالم طبیعت میں میراث کا موضوع ایک کئی قانون ہے جو تخلیق کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور ہر ایک نسل اپنے اسلاف کی ذاتی خصوصیتوں کو میراث کے طور پر حاصل کرتی ہے، ”گندم از گندم بروید جواز جو“۔

انسان بھی کسی حد تک اپنے اجداد کے اخلاق، صفات اور ان کے وجودی اوصاف کو میراث میں حاصل کرتے میں اسی ذاتی میل میلپ اور ہابہنگی کا سبب ہے کہ انسان عام حالت میں اپنے رشتہ داروں کی نسبت ایک خاص دلچسپی کو محسوس کرتا ہے اور بالخصوص اپنی اولاد کو اپنا جانشین سمجھ کر ان کی بقا کو بالکل اپنی بقا جانتا ہے اور قدرتی طور پر جو کچھ اس کی ملکیت ہے جسے اس نے محنت و زحمت اور کام و کوشش کر کے حاصل کیا ہے اور اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے، اسے اپنی اولاد کی ملکیت جانتا ہے بلکہ اپنے رشتہ داروں کی ملکیت جانتا ہے۔

اسلام بھی اسی فطری درک و احساس کے لحاظ اور احترام کے پیش نظر انسان کے مال کو اس کے مرنے کے بعد اس کے زندہ رشتہ داروں سے متعلق جانتا ہے اور میاں بیوی کو بھی جو نسب اور ایک دوسرے کی زندگی میں شریک ہونے کے بانی میں رشتہ داروں میں شامل کرتا ہے۔ پہلے طبقہ کو نبی وارث اور دوسرے طبقہ کو سببی وارث جانتا ہے۔ اس بنا پر، مرنے والے کا مال، اس کے نبی وارثوں میں ایک معین قانون کے مطابق تقسیم ہوگا، لیکن کچھ افراد ایسے ہیں جو میراث سے محروم ہیں، یہاں پر ان میں سے دو افراد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے: ۱۔ کافر کو مسلمان کی میراث نہیں مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی کافر مر جائے اور اس کے وارثوں میں کوئی مسلمان ہو تو اس کے کافر رشتہ دار میراث نہیں پائیں گے۔

۲۔ قاتل، اگر کوئی شخص اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو قتل کر دے تو قاتل اس کی میراث نہیں پائے گا، لیکن قاتل کی اولاد میراث سے محروم نہیں ہیں۔

نبی وارث (رشتہ دار)

نبی وارث رشتہ کے نزدیک اور دور ہونے اور رشتہ کا رابطہ ہونے یا نہ ہونے کے سبب، تین طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں، کہ ہر طبقہ کے ہوتے ہوئے بعد والا طبقہ میراث نہیں پائے گا اور ان تین طبقوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی صورت میں، میراث ایک خاص ضابطہ کے تحت تقسیم ہوتی ہے، جس کا بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: (و اولوالارحام بعضهم اولیٰ بعض...) ”بعض رشتہ دار بعض دوسروں پر زیادہ اولویت رکھتے ہیں“۔ نیز اپنے کلام میں آٹھ آیتوں کے ضمن میں وارثوں کے طبقوں اور ان کے حصوں کو بیان فرمایا ہے: پہلا طبقہ مرنے والے کے باپ، ماں، بیٹا اور بیٹی، جو مرنے والے کے براہ راست رشتہ دار ہیں، مرنے والے کے کوئی بیٹا اور بیٹی نہ ہونے کی صورت میں ان کا حصہ ان کی اولاد کو ملے گا، لیکن جب تک مرنے والے کی اولاد میں سے کوئی ایک بھی ہو تو مرنے والے کی اولاد کی اولاد ملے گی۔ مثلاً اگر مرنے والے کے باپ، ماں اور اس

کے بیٹے کا ایک بیٹا اور بیٹی ہو تو مرنے والے کے بیٹے کا حصہ مرنے والے کے بیٹے کے بیٹے اور بیٹی کو ملے گا اور ان میں تقسیم ہوگا اور اگر مرنے والے کے بیٹے کے بیٹے اور بیٹی کی کوئی اولاد ہو تو اسے کچھ نہیں ملے گا۔

دوسرا طبقہ: مرنے والے کے دادا، دادی، نانا، نانی اور بہن میں، جو ایک واسطہ سے (باپ یا ماں کے واسطہ سے) مرنے والے کے رشتہ دار ہیں۔ اس طبقہ میں بھی بھائی یا بہن کی اولاد کو، ان کے ماں باپ کا حصہ، اگر وہ مر گئے ہوں، تو مرنے والے کے طور پر ملے گا۔ اور جب تک بھائی اور بہن کی کوئی اولاد زندہ ہو تو اولاد کی اولاد کو میراث نہیں ملتی ہے۔

نوٹ: مرنے والے کے اگر پدری بھائی بہن بھی زندہ ہوں اور پدری و مادر می بھائی بہن بھی زندہ ہوں تو اس کی میراث پدری بھائی بہنوں کو نہیں ملے گی۔

تیسرا طبقہ: چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ میں، جو دو واسطوں سے (باپ یا ماں یا دادا یا دادی) مرنے والے کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ اس طبقہ میں بھی اولاد اپنے ماں باپ کی جگہ پر ہیں اور جب تک مرنے والے کے ماں باپ کی طرف سے ایک شخص بھی زندہ ہو تو باپ کے رشتہ داروں کو میراث نہیں ملتی۔

میراث کے حصے

اسلام میں مذکورہ وارثوں میں سے ہر ایک کے میراث کے حصے، علم ریاضی کے مطابق نہایت توجہ اور دقت کے ساتھ منظم و مرتب کئے گئے ہیں اور تمام حصے تین قسم کے ہیں: ۱۔ وہ ورثہ جو جن کی میراث کا حصہ نصف، ایک تہائی اور اس کے مانند ہے ان کی عددی نسبت معین ہے۔ فقہ میں ان حصوں میں سے ہر ایک کو ”فرض“ کہتے ہیں اور یہ مجموعاً چھ ہیں: نصف، ایک چوتھائی، آٹھواں حصہ، دو تہائی، ایک تہائی اور چھٹا حصہ۔

۲۔ جو لوگ رشتہ داری کی وجہ سے میراث پاتے ہیں، لیکن ان کا حصہ نسبت کے مطابق معین نہیں ہے۔

میراث کے فرض

۱۔ نصف (۱/۲) یہ تین وارثوں کے لئے ہے۔ الف: شوہر جبکہ اسکی بیوی مرگئی ہو اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو۔

ب: بیٹی، اگر مرنے والے کی تنها اولاد ہو۔ ج: بہن، مادری و پدری یا صرف پدری ہو، جبکہ میت کا کوئی اور وارث نہ ہو۔

۲۔ ایک چوتھائی (۱/۴) یہ دو وارثوں کے لئے ہے: الف: شوہر، جبکہ اس کی بیوی مرگئی ہو اور اس کے اولاد نہ ہو۔

ب: بیوی، جبکہ اس کا شوہر مرگیا ہو اور اس کے اولاد نہ ہو۔

۳۔ آٹھواں حصہ (۱/۸) یہ بیوی یا متعدد بیویوں کی میراث ہے جبکہ مرنے والے کے اولاد نہ ہو۔

۴۔ دو تہائی (۲/۳) یہ دو وارثوں کے لئے ہے: الف: دو بیٹیاں یا اس سے زیادہ جبکہ مرنے والے کے کوئی بیٹا نہ ہو۔

ب: دو یا اس سے زیادہ پدری و مادری بہنیں یا صرف پدری بہن ہو، جبکہ مرنے والے کے کوئی بھائی نہ ہو۔

۵۔ ایک تہائی (۱/۳) یہ بھی دو وارثوں کے لئے ہے۔ الف: ماں، جبکہ مرنے والی اولاد کے اولاد اور متعدد بھائی نہ ہوں۔

ب: مادری بہن اور بھائی جبکہ ایک سے زیادہ ہوں۔

۶۔ چھٹا حصہ (۱/۶) اور یہ تین وارثوں کے لئے ہے: الف: باپ، اگر میت کی اولاد زندہ ہو۔ ب: ماں، اگر مرنے والے کی اولاد زندہ

ہو۔ ج: مادری بہن یا بھائی جبکہ منحصر بہ فرد ہو۔

ماں باپ کی میراث

۱۔ اگر مرنے والے کا وارث صرف اس کا باپ یا ماں ہو تو میت کا تمام ترکہ اس کی ماں یا باپ کی میراث ہے۔

۲۔ اگر مرنے والے کے وارث اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد ہوں تو اس کے ماں باپ میں سے ہر ایک چھٹا حصہ (۱/۶) لیں گے اور باقی اس کی اولاد کا ہوگا۔

۳۔ اگر مرنے والے کے وارث باپ اور ماں ہوں، اور اسکی کوئی اولاد نہ ہو تو اگر مرنے والے کے چند بھائی ہوں تو اگرچہ اس کے بھائی میراث نہیں پاتے، لیکن اس صورت میں چھٹا حصہ (۱/۶) ماں کا اور باقی مرنے والے کے باپ کا ہوگا۔ اور اگر مرنے والے کے کوئی بھائی نہ ہو تو اس صورت میں ماں کا حصہ ایک تہائی (۱/۳) اور باپ کا حصہ دو تہائی (۲/۳) ہوگا۔

اولاد: ۱۔ اگر مرنے والے کا وارث ایک بیٹا یا ایک بیٹی ہو تو تمام ترکہ اسی کا ہے اور اگر کئی بیٹے یا کئی بیٹیاں ہوں تو مال مساوی طور پر ان کے درمیان تقسیم ہوگا اور اگر مرنے والے کے بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو ہر بیٹے کو بیٹی کے دو برابر حصہ ملے گا۔ دادا، دادی اور نانا، نانی۔

۲۔ اگر میت کے وارث دادا اور دادی ہوں، تو دو حصے دادا اور ایک حصہ دادی کو ملی گا۔ اور اگر میت کے وارث نانا اور نانی ہوں تو ان کے درمیان میت کا مال مساوی طور پر تقسیم ہوگا۔ اور اگر میت کے وارث دادا، دادی اور نانا، نانی ہوں تو مال کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا ان میں سے دو حصے دادا، دادی کو اس طرح کہ دادا کو دادی کے دو برابر دیا جائے گا۔ اور ایک حصہ نانا اور نانی کو مساوی طور پر تقسیم کر کے دیا جائے گا۔

۳۔ اگر مرنے والے کے وارث اجداد اور بھائی بہن ہوں چنانچہ وہ بھائی یا بہن مادری یا پدری یا پدری و مادری ہوں تو ایک تنہائی اجداد کو اور باقی دو تنہائی بھائی بہنوں کو ملے گا۔ لیکن اگر بھائی بہن میں بعض پدری و مادری اور بعض دوسرے صرف پدری ہوں تو مادری بھائی یا بہن کو کچھ نہیں ملے گا اور باقی ماندہ دو حصے پدری و مادری یا پدری بھائی اور بہن کو ملے گا۔

چچا اور پھوپھی: ۱۔ اگر مرنے والے کے وارث چچا یا پھوپھی ہوں تو سب مال ان کو ملے گا اور اگر کئی چچا یا کئی پھوپھیاں ہوں تو ان میں مساوی طور پر مال تقسیم ہوگا اور اگر چچا اور پھوپھی ہوں اور سب پدری و مادری یا پدری یا مادری ہوں تو چچا کو دو حصے اور پھوپھی کو ایک حصہ ملے گا اور اگر بعض پدری و مادری ہوں اور بعض پدری اور بعض مادری ہوں تو اس صوت میں اگر چچا اور پھوپھی مادری ہوں تو ایک تنہائی (۱۳) مال اور اگر زیادہ ہوں تو دو حصے اس کو ملیں گے اور باقی پدری و مادری چچا اور پھوپھی کو ملے گا اور پدری چچا و پھوپھی کو میراث نہیں ملے گی۔

۲۔ اگر مرنے والے کے وارث پدر و مادری چچا یا پھوپھی اور پدری چچا یا پھوپھی ہوں تو پدری چچا یا پھوپھی کو میراث نہیں ملے گی اور تمام مال پدری و مادری چچا و پھوپھی کو ملے گا۔

ماموں اور خالہ: ماموں اور خالہ جبکہ سب پدری و مادری ہوں، اگرچہ بعض لڑکے اور بعض لڑکیاں ہوں تو مال ان میں مساوی طور پر تقسیم ہوگا اور اگر بعض پدری و مادری یا پدری اور بعض مادری ہوں، تو مادری ماموں اور خالہ کا حصہ ۲۶ ہے جو ان میں مساوی طور پر تقسیم ہوگا اور باقی مال پدری و مادری یا پدری ماموں اور خالہ کو ملے گا کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے دو برابر حصہ ملے گا۔

میاں بیوی کی میراث

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شوہر کی میراث جبکہ اس کی بیوی کے کوئی اولاد نہ ہو تو نصف ہے اور اگر اس (فوت شدہ) بیوی یا دوسری بیوی سے اولاد ہو تو ایک چوتھائی ہے۔ اور بیوی کی میراث اگر (فوت شدہ) شوہر سے کوئی اولاد نہ ہو تو ایک چوتھائی

اور اگر اس (فوت شدہ) شوہر یا دوسرے شوہر سے اولاد ہو تو اس کو ۸۸ میراث ملے گی۔ لیکن جاننا چاہئے کہ بیوی زمین سے میراث نہیں پاتی بلکہ ۴۸ یا ۸۸ منقولہ اموال اور اعیان زمین، جیسے عمارت، تعمیر اور درختوں سے میراث پاتی ہے، لیکن شوہر بیوی کے تمام اموال سے میراث پاتا ہے۔

ولاء: اگر کسی مرنے والے کا مذکورہ وارثوں میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو تو اس کی میراث ”ولاء“ کے ذریعہ انجام پائے گی۔ اور ولاء کی تین قسمیں ہیں کہ جو بالترتیب میراث حاصل کرتے ہیں:

۱۔ ولائے عقیق: وہ یہ ہے کہ کوئی اپنے غلام کو آزاد کرے چنانچہ وہ غلام مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا مالک اور مولا اسکے تمام ترکہ کا وارث بن جاتا ہے۔

۲۔ ولائے ضمان جریرہ: اگر کوئی شخص کسی شخص کے ساتھ عہد کرے کہ ”کسی کو قتل کرنے یا زخمی کرنے کی صورت میں جو جرمانہ اس پر کیا جائے گا وہ اسے اس شرط پر ادا کرے گا کہ اگر اس کے مرنے کے بعد اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کے ترکہ کو لے لے گا“ اس صورت میں وہ اس کے تمام ترکہ کا وارث بنتا ہے۔

۳۔ ولائے امامت: یہ امام کی سرپرستی ہے۔ امام تمام مسلمانوں کا سرپرست ہے اور اگر کسی شخص کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا ترکہ امام کو اور امام کی غیبت میں ان کے نائب کو پہنچتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بلا وارثوں کے ترکہ کو ان کے ہم شریوں اور ہمسایوں میں تقسیم فرماتے تھے۔

میراث کے احکام

۱۔ باپ کے رشتہ دار اور ماں باپ کے رشتہ دار میراث کو کچھ فرق کے ساتھ تقسیم کرتیں ہیں یعنی ہر مرد عورت کے دو برابر لیتا ہے لیکن ماں کے رشتہ داروں میں میراث مساوی طور پر تقسیم ہوتی ہے۔

۲۔ وارثوں کے ہر طبقہ میں اولاد باپ اور ماں کی جگہ ہوتی ہے یعنی اگر ماں باپ نہ ہوں تو ان کی میراث کا حصہ ان کی اولاد لیتی ہے مثلاً اگر مرنے والے کے ماں باپ اور اس کی پوتی اور نواسہ ہو، تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو مال کا ۱/۶ حصہ ملے گا اور باقی مال تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اور ان میں سے دو حصے پوتے کو اور ایک حصہ نواسے کو ملے گا۔

۳۔ اگر مرنے والے کے ایک بیٹا اور ایک پوتا ہو تو تمام میراث بیٹے کو ملے گی اور پوتے کو کچھ نہیں ملے گا۔

۴۔ اگر وارثوں کے حصے اور فرض اصل ترکہ سے زیادہ ہو تو، کمی کو بیٹیاں اور باپ کے رشتہ دار برداشت کریں گے۔ مثلاً اگر مرنے والے کے وارث شوہر باپ ماں اور کئی بیٹیاں ہوں تو چونکہ شوہر کا حصہ ۱/۴ اور ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ ۱/۶ اور بیٹیوں کا حصہ ۱/۴ ہے اور یہ مجموعاً ۱۱/۱۲ ہوتا ہے اس طرح ۱/۴ تمام ترکہ سے یعنی عدد واحد زیادہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں شوہر باپ اور ماں کا پورا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی بچے مال کو بیٹیوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جانا چاہئے۔ اور کمی ان سے متعلق ہوتی ہے۔ اہل سنت اس صورت میں کمی کو ہر ایک حصہ دار کے حصے سے کم کرتے ہیں اور اسے ”عول“ کہتے ہیں۔

۵۔ اگر تمام حصے اصل مال سے کم ہوں یعنی عدد واحد کم ہو اس طرح کہ فرض اور حصوں کو ادا کرنے کے بعد کچھ مال بچے تو باقی ماندہ مال کو بیٹی یا باپ کے رشتہ داروں یعنی کمی کا خسارہ برداشت کرنے والے رشتہ داروں کے حصہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر مرنے والے کی وارث ماں اور ایک بیٹی ہو تو ماں کا حصہ ۱/۴ ہے اور بیٹی کا حصہ ۱/۲ اور اس صورت میں ۱/۴ حصہ مال باقی بچتا ہے اسے بیٹی کو دیا جاتا ہے۔ لیکن اہل سنت اس بچے ہوئے مال کو باپ کے رشتہ داروں۔ جو بعد والا طبقہ ہے۔ کو دیتے ہیں اور اسے ”تعصیب“ کہتے ہیں۔

مرد و عورت کے حصوں میں جزئی فرق

اسلام کی نظر میں مرد و عورت انسانی طبیعت اور حقوق و مغنویت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ لیکن ان دونوں صنفوں میں سے ہر ایک میں اپنی مخصوص خصوصیات کی بنا پر کچھ فرق بھی ہے۔ جیسے میراث میں عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف ہے اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور مرد ایک وقت میں چار بیویاں رکھ سکتا ہے لیکن عورت کو ایک شوہر سے زیادہ کا حق نہیں ہے اور طلاق کا حق مرد کو ہے اور حکومت، فیصلہ اور جہاد مردوں سے مخصوص ہے اور عورت کے اخراجات مرد کے ذمہ ہیں۔

البتہ یہ جزئی فرق جو اسلام میں مرد اور عورت کے درمیان پایا جاتا ہے، اس کا سبب ان کی مخصوص فطرت اور جذبات ہیں۔ کیونکہ دونوں صنفوں میں انسانیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

مرد اور عورت میں جو واضح فرق ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی فطرت میں جذبات اور ہمدردیاں مرد کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ تمام ناموس کی طرح اس حکم کے بھی استثنائی مواقع بھی ہیں، یعنی دنیا میں ایسی عورتیں بھی پیدا ہوئی ہیں کہ ان کی عقلی توانائی بہت سے مردوں سے کہیں زیادہ تھی، لیکن عام طور پر مردوں کی اکثریت میں عقل و فکر کی توانائی زیادہ رہی ہے اور جذبات و احساسات عورتوں میں زیادہ رہے ہیں۔ یہ بات طولانی تجربوں اور آزمائشوں کے بعد ثابت ہوئی ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق میں جو فرق پایا جاتا ہے، اس کی علت یہی فکر اور جذبات اور دیگر طبیعی اسباب ہیں۔ ہم یہاں پر اجالی طور پر ان میں سے بعض فرق کو بیان کرتے ہیں۔

مرد اور عورت کی میراث میں فرق

اسلامی نقطہ نظر سے، میراث میں عورت کا حصہ، مرد کے حصہ کا نصف ہے۔ لیکن دقیق تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا دوسرا حکم، یعنی عورت کے اخراجات کو مرد برداشت کرے، اس کمی کی تلافی کرتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ روئے زمین پر موجود تمام مال و دولت ہر زمانہ میں نسل حاضر کی ملکیت ہوتی ہے اور میراث کے ذریعہ دوسری نسل پہنچتی ہے اور وہ اس سے استفادہ کرتی ہے۔

اس لئے مرد اور عورت کے ایک حصہ اور دو حصہ لینے (جو اعداد و شمار سے تقریباً مساوی ہے) کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی پوری دولت کا دو تہائی حصہ مرد کا ہے اور ایک تہائی حصہ عورت کا ہے۔ لیکن چونکہ اسلام میں عورت کے اخراجات اور اس کی زندگی کے لوازم عدالت و مساوات کی بنا پر مرد کے ذمہ ہے، لہذا مال کا نصف حصہ مرد کو جو زیادہ دیا گیا ہے وہ عورت پر خرچ ہوتا ہے اور وہ عورت اپنے حصہ کو بھی اپنے اختیار سے خرچ کر سکتی ہے۔ پس روئے زمین کی دولت کا دو تہائی حصہ اگرچہ ہر زمانہ میں مرد کا اور ایک تہائی حصہ عورت کا رہا ہے، لیکن اخراجات کے لحاظ سے مسئلہ برعکس ہے۔

پس حقیقت میں اسلام نے ملکیت کے لحاظ سے دنیا کے مال کا دو تہائی حصہ تدبیر، فکر و عقل نظام چلانے والے کے ہاتھ میں دیا ہے اور اس کا ایک تہائی حصہ جذبات اور احساسات کے سپرد کیا ہے۔ لیکن اخراجات کے لحاظ سے اس کا دو تہائی حصہ جذبات و احساسات کے سپرد کیا گیا ہے اور ایک تہائی حصہ فکر و عقل کے سپرد کیا گیا ہے۔ بدیہی ہے کہ مال و دولت کے سلسلہ میں عقل کی توانائی جذبات اور احساسات سے زیادہ ہے اور جذبات اور احساسات مال کو خرچ کرنے میں عقل کی زیادہ محتاج ہیں کیوں کہ یہ ایک نہایت عادلانہ و عاقلانہ طریقہ ہے کہ دنیا کی دولت کو دو مختلف طاقتوں یعنی عقل و جذبات میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ یہ دونوں طاقتیں راضی رہیں جو زندگی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔

بیع (خرید و فروخت) بیع کیا ہے؟

”بیع“ کے معنی کسی مال کو بیچنے یا کسی مال کو دوسرے مال سے بدلنے کے ہیں، اس صورت میں کہ مال کا مالک جسے ”بیچنے والا“ کہتے ہیں، اپنے مال کی ملکیت سے ان پیسوں کے عوض دست بردار ہو جاتا ہے جو کہ دوسرا شخص یعنی ”خریدار“ ادا کرتا ہے۔ اور ”خریدار“ بھی مال کے عوض بیچنے والے کو اپنے پیسے دیدیتا ہے۔ واضح رہے کہ ”بیع“ ایک عقد ہے اور اپنے وجود میں طرفین (بیچنے والے اور خریدنے والے) کا محتاج ہے۔ اس لئے اس میں عقود کے عام شرائط جیسے بلوغ، عقل، قصد اور اختیار ہونا چاہئے۔

بیع عقد لازم ہے

بیع، عقود لازمہ میں سے ہے، یعنی عقد کے منعقد ہونے کے بعد متعاقبین (بیچنے والے یا خریدار) میں سے کوئی اسے توڑ نہیں سکتا۔ لیکن چونکہ کبھی بیع کے منعقد ہو جانے کے بعد غفلت یا غلطی سے بیچنے والے یا خریدار کو دھوکہ ہو جاتا ہے اور وہ قابل اعتنا نقصان سے دوچار ہوتا ہے، لہذا ایسے موقع پر بیع کا انجام عام مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے۔ دین اسلام نے اس خرابی سے بچنے کے لئے دو اقدام کئے ہیں: اول: ”اقالہ“ وہ یہ ہے کہ بیع انجام دینے والے طرفین میں سے ایک پشیمان ہو جائے اور د مقابل سے معاملہ توڑنے کی درخواست کرے تو متحب ہے اسے قبول کر کے معاملہ کو توڑ دیا جائے۔ دوم: ”خیار“ یہ ایک خاص اختیار ہے جس کے تحت معاملہ کرنے والا معاملہ کو توڑ سکتا ہے۔ مشہور ”خیارات“ حسب ذیل ہیں: ۱۔ خیار مجلس: جب تک عقد کی مجلس برخاست نہ ہو جائے معاملہ کے طرفین معاملہ کو توڑ سکتے ہیں۔

۲۔ خیار ضمن: یہ ہے کہ عقد کے طرفین میں سے کسی ایک نے دھوکہ کھایا ہو اور معاملہ میں نقصان اٹھایا ہو۔ مثلاً مال اس کی اصل قیمت سے کم میں بیچ دیا گیا ہو یا اصل قیمت سے زیادہ میں خریدا گیا ہو۔ تو اس صورت میں طرفین میں سے جس کو نقصان ہوا ہے وہ فوراً معاملہ کو توڑ سکتا ہے۔

۳۔ خیار عیب: اگر معاملہ طے پانے کے بعد، خریدار مال میں کوئی عیب پائے تو وہ معاملہ کو توڑ سکتا ہے۔ یا قیمت کے تفاوت کو حاصل کر سکتا ہے۔

۴۔ خیار حیوان: حیوانوں، جیسے بھیر اور گھوڑے وغیرہ میں خریدار تین دن تک معاملہ توڑنے کا حق رکھتا ہے۔

۵۔ خیار شرط: اگر بیچنے والا یا خریدار یا دونوں اپنے معاملہ میں کوئی شرط رکھیں، تو وہ شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں معاملہ کو توڑ سکتے ہیں۔

نقد، ادھار، اور سلم پیسہ لینے اور مال دینے کے لحاظ سے ”بیع“ کی چار قسمیں ہیں : ۱۔ معاملہ انجام پانے کے ساتھ ہی خود مال اور پیسے ادا کئے جائیں تو اس بیع کو ”نقد“ کہتے ہیں۔

۲۔ معاملہ انجام پانے کے وقت مال خریدار کے حوالہ کر دیا جائے لیکن اس کی قیمت تاخیر سے ادا ہونا قرار پائے، تو اس معاملہ کو ”ادھار“ کہتے ہیں۔

۳۔ دوسری قسم کے برعکس پیسے نقد ادا کئے جائیں لیکن مال کو بعد میں دینا قرار پائے تو اس بیع کو ”سلم“ کہتے ہیں۔

۴۔ پہلی قسم کے برعکس معاملہ طے ہونے کے بعد مال اور پیسے دونوں بعد میں ادا کرنا قرار پائے تو اس بیع کو ”مکالی بہ مکالی“ کہتے ہیں مذکورہ چار قسموں میں سے بیع کی پہلی تین قسمیں صحیح اور چوتھی قسم باطل ہے۔

منابع و مأخذ کی فهرست

۱- قرآن مجید

الف :

۲- احتقاق الحق، قاضی سید نور اللہ الحسینی المرعشی التستری، طبع، انجیام، قم۔

۳- اصول کافی، مرحوم کلینی، دارالکتب الاسلامیه، تهران۔

۴- امالی، شیخ مفید، دفتر انتشارات اسلامی، قم۔ ب :

۵- بحار الانور، علامه مجلسی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔ ت :

۶- تاریخ طبری، محمد بن جریر طبری، دارالمعارف، مصر۔

۷- تحف العقول، ابو محمد حسن بن علی بن حسین شعبه حرانی، دفتر انتشارات اسلامی، قم۔ س :

۸- سفینه البحار، شیخ عباس قمی، انتشارات فراہان، تهران۔ ش :

۹- شرح غرر الحکم، جمال الدین محمد خوانساری، مؤسسه انتشارات و چاپ، تهران۔ ع :

۱۰- عوالمی اللثالی، محمد بن علی بن ابراهیم احسائی، مطبعہ سید الشہداء علیہ السلام، دانشگاه قم، ایران۔ غ :

۱۱- غایت المرام، صمیری بحرانی، دارالحادی، قم۔

۱۲- الغدير، علامه امینی، دارالکتب العربی، بیروت، لبنان۔

۱۳- غررا حکم، مترجم محمد علی انصاری، مؤسسه صحافی خلیج، ایران، قم- ک :

۱۴- کنز العمال، علامه علاء الدین علی المتقی بن حاتم الدین الهندی، مؤسسه الرساله بیروت- م :

۱۵- محبة البیضا، بلا محسن کاشان، دفتر انتشارات اسلامی، قم-.

۱۶- مستدرک الوسائل، حسین نوری طبرسی، افست مطبعة الاسلامیه-.

۱۷- منذ احمد بن حنبل، مکتب اسلامی دار صادر، بیروت-.

۱۸- میزان الحکمة، محمد ری شری، مکتب العلوم الاسلامی، قم- ن :

۱۹- نج البلاغه صبحی صلح-.

۲۰- نج البلاغه فیض الاسلام-.

۲۱- نج الفصاحه، مترجم، ابوالقاسم پاینده، سازمان انتشارات جاویدان- و :

۲۲- وسائل الشیعه، شیخ حرعالی، مکتبه الاسلامیه، تهران- ی :

۲۳- ینابیع الموده، قندوزی، مؤسسه علمی-.